مشاہدات و معارف

ترجمہ

فیوض الحرمین

مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ

از

پروفیسر محمد سرور

سندھ ساگر اکادمی۔ لاہور

قیمت   فروری ۱۹۴۷ء   چار روپے

مقبول عام پریس لاہور میں باہتمام محمد صدیق پرنٹر پبلشر چھپ کر
سندھ ساگر اکادمی ۵۸ ٹمپل روڈ لاہور سے شائع ہوئی

عرض مترجم

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے حالات کے ضمن میں ایک جگہ لکھتے ہیں "علم حدیث کی تحصیل و تکمیل کے لیے انہوں نے سفر حجاز اختیار کیا، کامل اساتذہ کی صحبت اور اعلیٰ علمی کتابوں کے مطالعہ سے دو سال میں انہوں نے حدیث و فقہ میں مجتہدانہ کمال پیدا کر لیا، اس کے ساتھ ان کی قوتِ اشراق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت سے استفادہ کا موقعہ بہم پہنچایا۔ **فیوض الحرمین** میں انہوں نے وہ فلسفی، سیاسی اور اجتماعی فوائد جمع کر دیئے ہیں، جو اس طرح حاصل کئے۔"

خود شاہ صاحب نے کتاب کے شروع میں اس کی شانِ نزول کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں "سب سے بڑی نعمت جس سے کہ اس نے مجھے سرفراز فرمایا، یہ ہے کہ ۱۱۴۳ھ اور اس کے بعد کے سال میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے مقدس گھر کے حج کی اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی توفیق دی۔ لیکن اس سلسلے میں اس نعمت سے بھی کہیں زیادہ بڑی سعادت جو میسر آئی، وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس حج کو میرے لئے مشاہدات باطن اور انکشاف حقائق کا ذریعہ بنایا ۔۔۔ اس حج و زیارت کے ضمن میں مجھے جو نعمت عطا کی گئی وہ [illegible] میں چاہتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حج کے

ان مشاہدات باطن میں جو اسرار و رموز مجھے تلقین فرمائے ہیں، ان کو ضبط تحریر میں لے آؤں، اور نیز نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روحانیت سے زیارت مدینہ منورہ کے دوران میں جو کچھ میں نے استفادہ کیا ہے، اس کو لکھ دوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس رسالے کا نام میں نے "فیوض الحرمین" رکھا ہے۔

اردو ترجمہ میں کتاب کا جو نسخہ خاکسار مترجم کے پیش نظر رہا، وہ ۱۳۰۸ھ کا چھپا ہوا ہے۔ اس کے شائع کرنے والے سید ظہیر الدین عرف سید احمد صاحب مولانا شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کے نواسے ہیں۔ اس عربی متن کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بھی ہے، بدقسمتی سے مجھے اردو ترجمے سے زیادہ مدد نہ مل سکی، کیونکہ اس کا سمجھنا میرے لئے عربی متن سے کم مشکل نہ تھا، فیوض الحرمین کا عربی متن بہت صحیح چھپا ہوا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے کتاب کے مطالب کو حل کرنے میں بڑی مدد ملی۔

یہ ترجمہ کیا ہے۔ اور فیوض الحرمین کے دقیق مباحث کو اردو میں پیش کرنے میں مترجم کہاں تک عہدہ برآ ہو سکا، اس کا فیصلہ تو قارئین ہی فرما سکتے ہیں۔

محمد سرور
جامعہ نگر۔ دہلی

جنوری ۱۹۴۷ء

پیش لفظ

شاہ ولی اللہؒ ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے سترہ سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا اور ان کو باپ کی جگہ مسند تدریس سنبھالنی پڑی۔ بارہ سال تک درس دینے کے بعد ۱۱۴۳ھ میں شاہ صاحب نے حجاز کا قصد فرمایا۔ دو سال کے قریب آپ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں رہے۔ "فیوض الحرمین" شاہ صاحب کے اسی سفر حجاز کی یادگار ہے۔

اس میں شاہ صاحب کے روحانی مکاشفات ہیں۔ تصوف و سلوک کے اسرار ہیں، وحدت الوجود اور تخلیق کائنات کی بحثیں ہیں۔ حکمت و فلسفہ کے نکات ہیں۔ دین و ملت کے بعض اہم بنیادی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حنفی فقہ کی چند نادر خصوصیات کا ذکر ہے، علماء اور صوفیاء کے نزاع کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شیعہ و سنی میں تفضیل علیؓ اور تفضیل ابوبکر و عمرؓ کا جو جھگڑا ہے اس کا حل پیش کیا ہے، ہندوستان میں کفار کے بڑھتے ہوئے خطرہ کی طرف بھی ایک آدھ جگہ اجمالی اشارہ ہے اور سب سے زیادہ اس پر زور ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے مجددیت، وصایت اور قطبیت کے مقامات پر سرفراز فرمایا ہے، میں قائم الزمان ہوں کہ میرے توسط سے اہل اسلام کو کفار پر غلبہ نصیب ہوگا۔ مجھے "زکی" اور "نقاطِ علم کا آخری نقطہ" سے ملقب فرمایا گیا ہے۔ للہ تعالیٰ

میرے ذریعے سے امت مرحومہ کے منتشر اجزا کو جمع کرے گا۔ مجھے خلافت باطنی سپرد کی گئی اور یہ حکم ہوا کہ میں انبیاء کے طریقے کو اختیار کروں۔ اور ان کے بارہائے گراں کو اٹھاؤں
میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ میں نے خود اپنا نور دیکھا، جو بڑا عظیم الشان تھا۔ اور جس نے تمام اقلیموں کو ڈھانپ لیا، اور ان اقلیموں میں رہنے والوں پر اس کی روشنی غالب آگئی اور اس سے میں یہ سمجھا کہ قطبیت جو مجھے دی گئی ہے، یہ اس کا نور ہے۔ یہ نور سب کو زیر کرتا ہے لیکن وہ خود کسی سے زیر نہیں ہوتا، وغیرہ وغیرہ

یہ سب امور جن کا کہ اوپر ذکر ہوا، شاہ صاحب نے ان کو "مشاہدات" کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ ساری حقیقتیں ان کے دل پر گذری ہوئی اور ان کی آنکھوں کی دیکھی ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے یہاں آنکھوں سے مراد جسمانی آنکھیں نہیں بلکہ قلب و روح کی آنکھیں ہیں۔ مثال کے طور پر وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں یہ یہ چیزیں یوں یوں دیکھیں یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک نے مجھ سے یہ یہ القا فرمایا اور بسا اوقات ایسا ہوا کہ شاہ صاحب روضۂ اطہر پر حاضر تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کی طرف متوجہ کہ ان کے دل پر بعض حقائق نقش ہو گئے، ان مشاہدات میں کہیں یہ بھی ہے کہ میں نے روح کی آنکھ سے یہ یہ چیزیں دیکھیں خانہ کعبہ سے مجھے نور کی شعاعیں نکلتی نظر آئیں، میں نے غزوۂ بدر کے شہداء کی قبروں سے نور پھوٹتا ہوا پایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اقدس کو ظاہر اور عیاں دیکھا آپؐ حالتِ انبساط میں میری طرف اس طرح ملتفت ہوئے کہ میں یوں سمجھا کہ گویا آپؐ نے مجھے اپنی چادر میں لے لیا، اس کے بعد آپؐ نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر خوب بھینچا۔ آپؐ میرے سامنے رونما ہوئے، اور مجھے اسرار و رموز سے آگاہ فرمایا۔ اسی سلسلہ میں شاہ صاحب اپنے ایک خواب کا ذکر کرتے ہیں جس میں آپ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو دیکھا اور آپ کو ان بزرگوں نے اپنے نانا رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قلم ٹھیک کر کے

عطا فرمایا۔ اور رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک اڑھائی۔
ممکن ہے اس طرح کی باتوں سے بعض قارئین کو کچھ توحش سا ہو اور وہ اس طرح کے ذریعۂ علم کو ناقابل اعتبار جان کر زیر نظر کتاب میں جن مسائل کو بیان کیا گیا ہے، ان کو پڑھنے کے لئے تیار نہ ہوں، ان حضرات کی خدمت میں ہم عرض کریں گے کہ یہ کتاب جس زمانے میں لکھی گئی، وہ زمانہ اور تھا، اور آپ جانتے ہیں کہ ہر زمانے کا خاص ذہن اور اس کی اپنی خاص زبان ہوتی ہے۔ اور پھر عارفوں کا تو معاملہ ہی اور ہے، ان کے واردات قلبی اور مشاہدات باطنی کو عام عقلی معیاروں سے ناپنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں، اپنی دیکھی ہوئی بات کہتے ہیں، اور جو کچھ ان کی زبان پر آتا ہے، وہ ان پر گزرا ہوا ہوتا ہے، ہاں اس میں شک نہیں، کہ ان کے اس دیکھنے اور خارج سے اثر قبول کرنے میں ماحول کی روایات بھی بہت کچھ رنگ آمیزی کرتی ہیں، اور وہ اپنے زمانے کے رنگ ہی میں ان حقائق کو دیکھتے اور اسی پیرایۂ بیان میں ان کو ادا کرتے ہیں جو اُن کے ہاں مروج ہوتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آدمی ظاہری شکلوں میں الجھ کر رہ جائے، اور کہنے والے کے پیش نظر جس حقیقت کا اظہار تھا، اس تک نہ پہنچے۔ سچ تو یہ ہے کہ تصوف و مذہب کے متعلق عام طور پر جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اور وہ اسی ظاہر بینی اور سطحی بینی ہی کا نتیجہ ہیں۔

خود شاہ صاحب نے اپنی کتاب "ہمعات" میں اس غلط روی پر متنبہ فرمایا ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔

"ارباب تصوف سے بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ان بزرگوں کے اقوال اور احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچا جائے۔ اس سلسلے میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے ارباب تصوف کے اقوال اور احوال کو دوسرے عہد کے معیاروں سے ناپتے پھریں۔"

یہ علم جو عقل کی بجائے قلب کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، اور عارف خود اپنے باطن میں اس کا مشاہدہ کرتا ہے، علامہ اقبال مرحوم نے اپنے لیکچروں میں اس وجدانی علم کی اصابت اور اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں، قلب ایک طرح کا باطنی وجدان یا بصیرت ہے، جو مولانا رومی کی شاعرانہ زبان میں آفتاب کی شعاعوں سے زندگی حاصل کرتا ہے، اور ہمیں حقیقت کے ان پہلوؤں سے آشنا کرتا ہے جو ہمارے حواس سے پرے ہیں، قرآن کی رو سے یہ ایسی چیز ہے جو دیکھتی ہے اور اس کی اطلاعات کی صحیح تعبیر کی جائے تو اس میں غلطی کا امکان بہت کم ہوتا ہے ...... اس کو باطنی پُراسرار اور فوق الفطری کہنے سے اس کی قدر و قیمت بحیثیت ایک ذریعہ علم کے کم نہیں ہو جاتی، کچھ آگے اس قلبی واردات کے بارے میں مرقوم فرماتے ہیں "بنی نوع انسان کا یہ سارا الہامی اور صوفی ادب اس بات کا قوی ثبوت ہے کہ مذہبی واردات کا سلسلہ تاریخ انسانی میں نہ صرف شروع سے موجود رہا، بلکہ اس نے تاریخ پر کافی اثر بھی ڈالا ہے۔ اس لئے اسے محض فریب کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا، آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ عام سطح کے انسانی تجربات کو تو حقیقی مان لیا جائے، اور جن دوسرے ذرائع سے انسان کو علم حاصل ہوا انھیں باطنی اور جذباتی کا نام دے کر مسترد کر دیا جائے، واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک انسان کے تجربی علم کا سوال ہے، اس معاملے میں، مذہبی واردات کی وہی حیثیت ہے جو دوسرے ذرائع علم کی ہے، جن سے انسان کو عام زندگی میں واسطہ پڑتا ہے، نیز انسانی تجربات کی اس باطنی علم کو تنقیدی نظر سے دیکھنا کوئی بے ادبی نہیں۔"

قلبی واردات کی علمی حیثیت تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ علامہ مرحوم نے اسلامی تصوف کا اس وقت جو ادب موجود ہے، اس پر بھی کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ چنانچہ اپنے تیسرے لیکچر میں جس کا عنوان "خدا کا تصور اور عبادت" ہے۔ فرماتے ہیں۔

"...... میں یہاں کسی ایسے ذریعۂ علم کا ذکر نہیں کر رہا، جو کہ راز سربستہ

ہو۔ اس تمام گفتگو سے میری غرض صرف اتنی ہے کہ آپ کو ایک حقیقی انسانی تجربی علم (وجدان) کی طرف متوجہ کردوں جس کے پیچھے پوری تاریخ ہے اور سامنے شاندار مستقبل۔ تصوف نے اسی ذریعے علم کو خاص طور پر برتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ انسانی "انا" کی وسعتوں کو ہمارے سامنے بے نقاب کر سکا، ہمارا صوفی ادب کافی تابناک ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کی وہ بندھی ٹکی اصطلاحات جو کبھی فرسودہ قسم کے مابعد الطبیعاتی تصورات کے زیر اثر بنی تھیں۔ آج اس زمانے میں نئی نسلوں کے دماغوں پر ان کا اثر سخت روح فرسا اور مُردنی خیز ہے"۔

"فیوض الحرمین" میں شاہ ولی اللہ صاحب نے مذہب و تصوف کے حقائق کو جس زبان میں اور جن اصطلاحات میں بیان فرمایا ہے، واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کی اوپر کی تنقید ایک حد تک ان پر بھی پوری اُترتی ہے۔ شاہ صاحب کے زمانے میں مسلمانوں میں ایک خاص قسم کا مابعد الطبیعی فکر پایا جاتا تھا جس کا بیشتر حصہ تو یونانی اور اشراقی تھا لیکن اس میں ہند و ایران کے اثرات کی بھی ملونی تھی اور اس سارے ملغوبے پر اسلامی ٹھپہ لگ چکا تھا، مابعد الطبیعات کا یہ گورکھ دھندا ایسا پیچ در پیچ ہے کہ اس میں اُلجھا ہوا ذہن مشکل ہی سے نکل سکتا ہے، فیوض الحرمین میں کہیں کہیں اس طرح کی مابعد الطبیعی اصطلاحات کی اُلجھنیں بھی ہیں، لیکن تحقیق حق کی خاطر اس طرح کی مشکلات راہ کو جھیلنا ہی پڑتا ہے، خوشے سے اناج نکالنے کے لئے اوپر کی بھوسی کو ہٹانا کبھی بھی تضیع اوقات نہیں سمجھا جاتا۔

واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے ان مشاہدات اور مکاشفات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان کو اس عہد کے تاریخی آئینے میں دیکھنے کی کوشش کریں۔ شاہ صاحب جب پیدا ہوئے تو اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت تھی، چار برس کے تھے

کہ عالمگیر کا انتقال ہو گیا، اور اس کے بعد گیارہ سال کے قلیل عرصے میں یکے بعد دیگرے پانچ بادشاہ دہلی کے تخت پر بیٹھے، اور ۱۱۳۱ھ میں شاہ صاحب نے اپنے والد کے مدرسے میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو چھٹے بادشاہ محمد شاہ کے سر پر ہندوستان کا تاج شاہی رکھا گیا، اس کی حکومت کے بارہ سال دیکھ کر آپ حج کو گئے۔

دہلی کے یہ انتیس سال بڑے سخت سیاسی خلفشار میں گزرے، عالمگیر کے مرتے ہی اس کے تین بیٹوں میں لڑائی ہوئی، دو تو میدان جنگ میں کام آئے، اور بڑا بیٹا بادشاہ بنا۔ چار سال حکومت کرنے کے بعد وہ راہی عدم ہوا تو اس کا بیٹا جہاندار شاہ تخت پر بیٹھا اور ایک سال کے اندر اندر اپنے بھتیجے فرخ سیر کے ہاتھ سے مارا گیا، فرخ سیر کو سادات بارہ نے بادشاہ بنایا تھا۔ لیکن ان میں اور بادشاہ میں زیادہ دیر تک نبھ نہ سکی۔ چنانچہ طرفین ایک دوسرے کو گرانے کی برابر کوشش کرتے رہے جس کا آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ فرخ سیر کو سادات بارہ نے سخت عقوبتوں کے بعد مار ڈالا۔ چند ماہ کے اندر دو اور بادشاہ تخت پر بیٹھے اور پھر محمد شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا، اس پر دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ نظام الملک نے سادات بارہ کو شکست دے کر بادشاہ کو ان کے پنجے سے نجات دلائی، یہاں سے محمد شاہ کا دور حکومت جسے تاریخ میں "رنگیلا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے شروع ہوتا ہے۔

اس طرح اور اتنی جلد جلد بادشاہوں کے بدلنے سے ایک طرف مغل سلطنت کا وہ رعب و دبدبہ جو اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر کی طویل اور مضبوط حکومتوں کی وجہ سے قائم ہو چکا تھا، کمزور پڑنے لگا۔ چنانچہ ملک میں ہر طرف شورشیں شروع ہو گئیں۔ دوسری طرف شاہی خاندان کی باہمی جنگوں نے امرائے سلطنت کو خود سر بنا دیا۔ اور وہ ایک دوسرے کے خلاف مرہٹوں، راجپوتوں اور جاٹوں سے مدد لینے لگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان قوموں کو یہ معلوم ہو گیا

کہ اکبر و عالمگیر کے جانشینوں کا بس نام ہی نام رہ گیا ہے، محمد شاہ اگر کسی قابل ہوتے تو شاید اس کے عہد حکومت میں جو خلاف توقع کافی لمبا تھا، مغل سلطنت کی کچھ حالت سدھر جاتی، لیکن وہ تو محض عیش و عشرت کا بندہ تھا، ہوا یہ کہ معاملات روز بروز زیادہ خراب ہوتے گئے، اور شاہ صاحب کی حج سے واپسی کے چند سال بعد تو نادر شاہ کے حملے سے سلطنت کا سارا بھرم ہی جاتا رہا۔

یہ تھی سلطنتِ دہلی کی حالت، جو شاہ صاحب اپنی نظروں سے دیکھ رہے تھے یہی وہ زمانہ ہے جس میں مرہٹوں کے ساتھ رعائتیں کی گئیں اور بادشاہ کی طرف سے انہیں دکن سے چوتھ وصول کرنے کا حق عطا ہوا، اس سے ان کے حوصلے اور بڑھ گئے اور وہ شمالی ہند پر قابض ہونے کی تدبیریں کرنے لگے، راجپوتوں کو مطمئن کرنے کے لئے جزیہ کی منسوخی کا اعلان ہوا۔ ادھر دہلی کے قریب آگرے کے نواح میں جاٹوں نے سر اٹھایا، اور پنجاب میں سکھوں نے شورشیں کرنی شروع کر دیں، گو ان سب کو وقتی طور پر دبا دیا گیا لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ "کفار" کا سیلاب بڑھتا چلا جا رہا ہے، اور اس کا روکنا اب روز بروز مشکل ہوتا جائے گا۔

شاہ صاحب کا سلطنت کے اس خارجی اور داخلی خطرے سے متاثر ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اسلامی سلطنت کو جن غیر مسلم طبقوں سے کوئی خطرہ ہو سکتا تھا، تو وہ یہی مرہٹے، راجپوت، سکھ اور جاٹ ہی تھے انگریز اور فرانسیسی اس زمانے تک دہلی سے بہت دور تھے، اور ان کا اثر بمشکل ہندوستان کے ساحلی علاقوں سے آگے بڑھنے پایا تھا، ہمارے خیال میں شاہ صاحب کو اس نئے خطرے کا جو حقیقت میں سب سے بڑا خطرہ تھا، زیادہ علم نہ تھا مسلمانوں کو اور اسلامی سلطنت کو ان خطرات میں گھرا ہوا پا کر یقیناً شاہ صاحب کو رہ رہ کر یہ خیال آتا ہوگا کہ کوئی ایسی تدبیر ہو جس سے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی حالت

درست ہوجائے، ان کی جمعیت کا شیرازہ پھر سے بندھ جائے، مسلمان امراء میں اتفاق و اتحاد ہو، ان کے اخلاق سدھر جائیں، اور اس طرح مسلمانوں کو نئی زندگی ملے، اور اسلامی سلطنت تباہی کے اس نرغے سے نکل جائے۔ چنانچہ اس کے لئے ضرورت تھی کہ شیعہ اور سنی کا نزاع ختم ہو، اہلِ تصوف اور اربابِ شریعت میں جو بُعد پیدا ہوگیا تھا، وہ نہ رہے، علماء اپنا کام کریں اور صوفیاء اپنے فرائض انجام دیں، اسلام کی صحیح تعلیمات لوگوں تک پہنچیں اور دین کی تجدید کے ساتھ ساتھ ملت کی بھی نئی تشکیل ہو۔

شاہ صاحب کی طبیعت، ان کی عالی دماغی اور بلند حوصلگی، ان کے خاندانی حالات، ان کے ماحول اور جس فضا میں کہ انہوں نے پرورش پائی تھی، ان سب کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں کہ وہ اسلامی سلطنت کے زوال سے کتنے متاثر ہوئے ہونگے، اور اصلاحِ حال کیلئے انہوں نے کیا کیا سوچا ہوگا، اور کیا کیا ولولے اور کیسی کیسی امنگیں اس سلسلہ میں ان کے دل میں نہ اٹھی ہوں گی، اور یہ وہ زمانہ تھا جس میں مسلمان صوفی اور عالم اسلامی جمعیت کے اہم رکن سمجھے جاتے تھے اور ایک طرف عوام و خواص ان کے عقیدت مند ہوتے تھے، اور دوسری طرف امراء اور بادشاہ ان کی نصیحت سنتے تھے۔ اور پھر یہ بھی بات تھی کہ اس عہد میں بالعموم اور شاہ صاحب کے خاندان اور ان کے قریبی ماحول میں بالخصوص حضرت مجدد الف ثانی کے تجدیدی کارناموں کا غلغلہ تھا۔ اور یہ ممکن نہیں کہ شاہ صاحب کے کانوں میں بچپن ہی سے مجدد صاحب کی باتیں نہ پڑتی رہی ہوں کہ کس طرح انہوں نے جہانگیر کے عہد میں اکبر کے لگائے ہوئے الحاد و زندقہ کے پودے کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا، اور مغلوں کی خلافتِ ظاہرہ کے بالمقابل اپنی باطنی خلافت کی بنیاد رکھی، اور کس طرح ان کے خلفاء اور نائب ہندستان کے

گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ چنانچہ عوام اُن سے متاثر ہوئے، اور اُمرا نے ان کی بات مانی، اور آگے چل کر ان کی یہی کوششیں عالمگیرؒ کی حکومت کی صورت میں بار آور ہوئیں۔

یقیناً شاہ صاحب نے حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق یہ سب کچھ سُنا ہوگا اور قدرتاً ان کے بلند حوصلوں کو حضرت مجدد کے اسوۂ عمل سے، اور آپ کے بارے میں ان روایات و آثار سے جو شاہ صاحب کے ماحول میں رچ چکے تھے۔ بڑی تقویت ملی ہوگی، اور ان کو رہ رہ کر یہ خیال آتا ہوگا کہ اگر حضرت مجدد اپنے تجدیدی مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں، تو اس وقت بھی ایک تجدیدی کوشش کر دیکھنی چاہئیے۔ کیا بعید ہے کہ اس سے اسلامی جمعیت تباہی سے بچ جائے اور ہندوستان میں اسلام کو نئی زندگی نصیب ہو۔ یہ خیالات یہ ولولے اور یہ امنگیں تھیں، جن کو دل میں لئے ہوئے ہمارے خیال میں حضرت شاہ صاحب خانہ کعبہ اور روضۂ اطہر پر پہنچے۔ اس وقت آپ کی انتیس تیس کی عمر تھی، جوانی کا عالم تھا تصوف کے مراقبوں سے نفس کی باطنی قوتوں کو بڑی جلا مل چکی تھی۔ غیر معمولی ذہانت، اس پر وجدانی زندگی کا اتنا پختہ رنگ، دل میں بڑھے ہوئے حوصلے اور گرد و پیش کے خطرات کا اس قدر احساس اور خیال میں بڑے بڑے بزرگوں کی انقلاب آفریں شخصیتیں سمائی ہوئیں یہ ہیں وہ حالات جن کی صدائے بازگشت فیوض الحرمین کے یہ مشاہدات اور مکاشفات ہیں، اور انہی کی روشنی میں ہمیں شاہ صاحب کی ان دعاوی کو دیکھنا چاہئیے کہ وہ قائم الزمان ہیں۔ ان کو وصی، قطب اور امام کے مذاہب پر سرفراز کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔

بے شک حضرت مجدد الف ثانی کی تجدید کا رنگ اور تھا، اور شاہ ولی اللہ کی تجدید کا رنگ اور، کیونکہ حضرت مجدد کا زمانہ دوسرا تھا، اور شاہ صاحب دوسرے زمانے میں پیدا ہوئے۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد حکومت میں اسلامی سلطنت اپنے پورے عروج پر تھی۔ اس میں جو بے عنوانیاں پیدا ہو چلی تھیں، وہ ایسی تھیں جیسے کسی سینے

بھرپور جوانی کی بدمستی میں ہوں۔ چنانچہ مجدد صاحب کی تجدید میں تادیب کا رنگ غالب تھا! ورنہ اسلامی جمعیت کو جو اس زمانے میں زیادہ تر اہلِ سنت والجماعت ہی پر مشتمل تھی، غیروں کے تمدنی اثر سے آزاد اور دوسروں سے الگ اور ممتاز ہونے پر زور دیتے تھے۔ لیکن شاہ صاحب کے عہد میں اسلامی جمعیت کا خاکہ بہت کچھ بدل چکا تھا اب اس کے اندر مستقل گروہ بن چکے تھے، اور ہر گروہ اپنی انفرادیت پر مصر تھا، اور حالات ایسے تھے کہ ان کو اس طرح ایک کرنا کہ یہ سب کے سب اہلِ سنت والجماعت کی سیادت کو مان لیں، ناممکن تھا۔ پہلے مرکزی حکومت میں طاقت تھی اور سُنی امرا کا زور تھا۔ بیشک اس زمانے میں شیعہ عناصر بھی رہے، لیکن ان کا زیادہ اثر نہیں تھا۔ شاہ صاحب کے زمانہ میں سُنی امرا کے مقابلے میں ایرانی امرا کافی زور پکڑ رہے تھے، اور اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے اُنھیں اس کے مواقع بھی حاصل تھے کہ وہ مرہٹوں، جاٹوں اور راجپوتوں کی مدد سے اپنے مخالفوں کے مقابل آسکیں۔ شیعہ اور سنی کی اس لڑائی میں ظاہر ہے اسلامی جمعیت کو نقصان پہنچتا، اس لئے اب ضرورت اس کی نہ تھی کہ "رفض" کے خلاف حضرت مجدد کی طرح کھُلم کھُلا جہاد کا اعلان کیا جاتا، بلکہ مصلحت اور دانشمندی کا تقاضہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے ان دونوں گروہوں میں جہاں تک اسلامی اصول اجازت دیتے، باہمی رواداری اور اتحاد پیدا کیا جاتا، تاکہ اسلامی جمعیت کے اس طرح کے داخلی اتحاد سے خارجی خطرات کا مقابلہ کرنا ممکن ہو سکتا۔ "فیوض الحرمین" میں شیعہ اور سُنی کے اس نزاع کو ختم کرنے کے لئے بھی اشارے ہیں۔

یہ تو ہوا شیعہ اور سُنی کا معاملہ، لیکن شاہ صاحب کے زمانے تک امرِ واقعہ یہ تھا کہ اسلامی جمعیت کی غالب اکثریت اہلِ سنت پر مشتمل تھی۔ چنانچہ ان ہی کی اصلاح اور تنظیم سے اسلامی جمعیت کی نئی تشکیل ہو سکتی تھی، اہلِ سنت کی علمی اور روحانی قیادت اس وقت علماء اور صوفیاء کے ہاتھ میں تھی، لیکن بدقسمتی سے ان میں اختلاف و عقائد کی

وہ یک جہتی نہ تھی جو وجود ملت کے استحکام کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ صوفیا عقیدہ وحدت الوجود میں گم باطنی زندگی کو سب کچھ سمجھے ہوئے تھے اور علماء کو صوفیا سے بدگمانیاں تھیں، اور وہ انھیں شریعت کی سیدھی راہ سے ہٹا ہوا پاتے تھے۔ شریعت اور طریقت کے اس ذہنی اور عملی تضاد کو دور کرنے کا خیال بھی "فیوض الحرمین" کے مشاہدات میں منعکس نظر آتا ہے۔

خود علماء اہل سنت کا یہ حال تھا کہ وہ فقہی تعصب اور ذہنی جمود میں بری طرح مبتلا تھے، وہ فقہ حنفی ہی کو اسلام کا مرادف سمجھتے، اور اس میں اتنا تشدد برتتے کہ کسی کا حنفی نہ ہونا ان کے نزدیک اسلام سے خروج سمجھا جاتا۔ ظاہر ہے یہ صورت حال اسلامی ذہن کی موت تھی، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جماعتی زندگی میں اسلام کے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث سے استفادہ کرنے کا رجحان اور دنیا میں آگے بڑھنے اور نئے فکری حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ مفقود ہو گیا تھا۔ یہ سب صحیح لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی عام حالت یہ تھی کہ وہ فقہ حنفی کے سوا کسی اور فقہی مذہب کا نام تک سننے کو آمادہ نہ ہو سکتے تھے وہ صدیوں سے فقہ حنفی ہی کو اسلام کی واحد تعبیر جانتے اور مانتے چلے آئے تھے۔ اب اگر ان کی علمی اور مذہبی اصلاح کا کوئی امکان ہو سکتا تھا تو اس کی صرف یہی صورت تھی کہ فقہ حنفی کی ایسی تعبیر ہوتی، جس سے حنفی فقہ سے ان کا تعلق بھی نہ ٹوٹتا، اور وہ فقہی جمود سے بھی نکل سکتے۔ چنانچہ زیر کتاب میں آپ کو فقہ حنفی کے متعلق اس طرح کے مکاشفات بھی ملیں گے۔

یہ کائنات کس طرح ظہور پذیر ہوئی، ایک وجود سے یہ کثرت کیسے نکلی، انسان کا اس کائنات میں کیا مقام ہے، وہ اصل میں کیا ہے، اس میں کیا کیا بننے کی صلاحیتیں رکھی گئی ہیں، وہ خدا تک وہ کس طرح پہنچ سکتا ہے، تقرب الی اللہ کے یہ مسائل جنہیں مذاہب کا نام دیا گیا ہے، ان کی حیثیت کیا ہے، ان میں بظاہر کیوں اختلافات ہیں اور مختلف

زمانوں میں انبیاء کو الگ الگ جو شریعتیں دی گئیں، انکی کیا حیثیت ہے ، مظاہرِ حیات کی بوقلمونی میں بنیادی وحدت کیا ہے۔ الغرض آفرینش کائنات کے متعلق یہ اور اس طرح کے دوسرے مابعد الطبیعی مسائل اور نیز مذہب اور تصوف کے بنیادی حقائق جو زندگی کے مجموعی تصور اور اس کے نظامِ صالح کے لئے ہر تہذیب میں اساسی مباحث کا حکم رکھتے ہیں، شاہ صاحب نے اس کتاب میں کہیں مجملاً اور کہیں تفصیل سے بیان فرمائے ہیں۔

مختصراً یہ ہے "فیوض الحرمین" کا شانِ نزول اور یہ ہے اس کا موضوع ہمارے ہاں پڑھے لکھے طبقوں کو ان دنوں جو اسلامیات سے دلچسپی پیدا ہو رہی ہے اور ان میں اسلامی اصولوں پر اپنی انفرادی اور قومی زندگی کو ڈھالنے کا جو ایک جذباتی رجحان پایا جاتا ہے ، اس کو دیکھتے ہوئے مترجم کے خیال میں شاہ ولی اللہ صاحب کی اس کتاب کا اردو میں آجانا فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔ زیرِ نظر کتاب میں شاہ صاحب نے دین اسلام کے ارکان اور اس کے شرعی قواعد و احکام زندگی کی جن بنیادی اور دائمی حقیقتوں کے ترجمان ہیں، ان سے پردہ اٹھانے کی کوشش فرمائی ہے، ان حقیقتوں کی جاننے کی آج شاہ صاحب کے زمانے سے بھی کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ کیونکہ ان دنوں اکثر مسلمان محض اپنا نام کا مسلمان ہونا ہی نجاتِ اخروی کے لئے کافی سمجھتے ہیں، اور اسی بنا پر وہ دوسروں سے فوقیت چاہتے اور ان کے مقابلے میں امتیازی حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ نیز ان میں بعض ایسے مخلص گروہ بھی پیدا ہو گئے ہیں، جن کو واقعی اسلام سے دلی محبت ہے، اور وہ پورے خلوص سے اسلامی زندگی گزارنا چاہتے ہیں، لیکن انکی نظر مظاہر اسلام سے اور شعائر اسلام سے حقیقی مقصود تک نہیں جاتی ۔ اور وہ ظاہری زندگی ہی کو اسلامی رنگ دے دینا کافی سمجھ رہے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اس طرح اسلام دنیا میں پھر وہی انقلاب پیدا کر سکے گا جو تیرہ سو سال پہلے اس نے کیا تھا ..... خدا کرے شاہ ولی اللہ صاحب کے یہ افادات ان نوجوانوں میں جن کو اسلام سے حقیقی لگاؤ ہے، اور جو ملی زندگی کی تعمیر میں اسلامی فکر کی اہمیت کو بھی مانتے ہیں اسلام کی اصل حقیقت اور اس کے بنیادی حقائق کو سمجھنے کا صحیح جذبہ پیدا کر سکیں، واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی نئی زندگی جس کا آج ہر مسلمان متمنی ہے، صرف اسی طرح ہی وجود میں آسکے گی ......

فہرست مضامین

اور ایمان بالغیب

(۲) فردِ کامل وہ ہے جو ایمان کی دونو قسموں کو اپنے اندر جمع کرے۔

(۳) خانہ کعبہ میں نماز تہجد کا ایک واقعہ

(۴) شاہ صاحب کے والد اور چچا کا یہ ارشاد "اللہ کی مخلوق میں سے کسی شخص سے بھی اگر وہ عاقل و بالغ ہے، شرع کی قیود نہیں اٹھ سکتیں، اور اس کے ساتھ دونو بزرگوں کا اللہ تعالیٰ کے اس الہام کو برحق جاننا کہ "تمہیں اختیار ہے کہ چاہو تو عبادت کرو اور چاہو تو نہ کرو" ان دو متضاد اقوال میں تطبیق۔

آٹھواں مشاہدہ ۱۱۱

(۱) انسانی زندگی کے روحانی کمالات

(ا) نورِ اعمال

(ب) نورِ رحمت یا نورِ یادداشت

(ج) نورِ احوال

(۲) شہدائے بدر، حضرت ابوذر غفاری کے مزارات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مولدِ مبارک پر حاضری اور وہاں انوارِ رحمت اور انوارِ اعمال کو روشن دیکھنا۔

نواں مشاہدہ ۱۱۶

(۱) روضۂ اطہر کی زیارت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک کو ظاہر اور عیاں دیکھنا

(۲) "بے شک انبیاء کو اوروں کی طرح موت نہیں آتی، وہ اپنی قبروں میں نماز پڑھتے

پڑھتے اور رجح کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی حقیقت ۔

دسواں مشاہدہ ۱۱۹

(۱) روضۂ اطہر پر حاضری اور شاہ صاحب پر آپؐ کے فیضانات

(۲) شاہ صاحب کا دیکھنا کہ آپؐ اپنے جوہر روح، اپنی طبیعت، اپنی فطرت اور جبلت میں سرتاسر مظہر ہیں، اللہ تعالیٰ کی اس عظیم الشان تدلی کے جو تمام بنی نوع بشر پر حاوی ہے

(۳) شاہ صاحب کا آپؐ سے سوال کرنا کہ مذاہب فقہ میں سے کونسا مذہب آپؐ کے نزدیک ارجح ہے ۔

(۴) طرق تصوف کے متعلق شاہ صاحب کا آپؐ سے استفسار

(۵) شاہ صاحب کا مجددیت، وصایت، قطبیت اور امامت کے مقامات پر سرفراز کیا جانا ۔

(۶) ذات حق کو دنیا والوں سے اور خاص طور پر ان لوگوں سے جو پستی میں ہیں، قریب ہونے کے لئے ضروری تھا کہ اس کی عنایت اس غرض کے لئے کسی انسانی نسمہ کو اپنا واسطہ بناتی ۔ یہ انسانی نسمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تھی ۔

گیارھواں مشاہدہ ۱۲۳

(۱) "ابھی آدم کا خمیر پانی اور مٹی میں تیار ہو رہا تھا کہ میں نبی تھا۔" شاہ صاحب کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپؐ کے اس ارشاد کی وضاحت چاہنا ۔

(۲) آدم کی تخلیق اور ارواح بنی آدم کا عالم مثال میں ظاہر ہونا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مثالی پیکر اور اللہ تعالیٰ کی اس تدلی کا جو تمام بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے تھی، آپ کے اس مثالی پیکر پر منطبق ہونا۔
(۳) عالم مادی میں افراد انسانی کا وجود میں آنا، انبیاء کی بعثت کا سلسلہ آخر میں آپ کا مبعوث ہونا۔ آپ کی بعثت کی عمومی اور دوامی حیثیت
(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علوم حکمت، فنون ادب وخطابت اور علوم شرعیہ کو کیوں اتنا فروغ ہوا؟
(۵) ذات مطلق سے شخص اکبر کا ظہور، شخص اکبر کا اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا شخص اکبر کی یہی معرفت قائم مقام بن گئی ذات حق کی۔ شخص اکبر سے عناصر و افلاک کا ظہور۔ عناصر و افلاک کے بعد معدنیات، نباتات، حیوانات اور بنی نوع انسان کا ظاہر ہونا۔ ان میں سے ہر ہر فرد میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق اللہ تعالیٰ کی معرفت کا جو اسے شخص اکبر سے حصے میں ملی ہے موجود ہونا۔ نفس انسانی کی اس معرفت یا اس کے اس نقطۂ تدلی کو پیدا کرنے میں ملاء اعلیٰ کا ہاتھ۔ ملاء اعلیٰ کی نوعیت۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے، ملاء اعلیٰ کی تعداد اور لازماً ان کی تاثیر بڑھتی جاتی ہے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علوم وفنون کو پہلے سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔

بارھواں مشاھدہ

۱۴۹

(۱) شاہ صاحب کے نفس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے ملحق ہونا۔ اور اس سے انسانی نفوس کے حالات و کوائف کے مطابق شرعی احکام و قواعد کے معارف کو استنباط کرنے کا جو علم انہیں عطا کیا گیا تھا۔

اس کے بارے میں ان کے دل میں اطمینان پیدا ہونا۔

(۲) شاہ صاحب پر ذاتِ حق کی نظرِ عنایت کا فیضان اور اس کے اثرات

۱۵۴

تیرھواں مشاہدہ

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا کہ "سجدوں میں خوب دعا کرو" اور نیز آپ کے اس حکم کا کہ "کثرت سجود سے اپنے نفس کی مدد کرو" مطلب

(۲) شاہ صاحب کا اپنے آپ کو غیر متناہی دیکھنا۔

۱۵۷

چودھواں مشاہدہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کی حقیقت کا تمام لباسوں سے منزہ اور مجرد ہو کر شاہ صاحب کے سامنے تجلی فرمانا

۱۵۹

پندرھواں مشاہدہ

(۱) اللہ تعالیٰ کی وہ تدلی جس سے کہ مقصود کل بنی نوع انسان کو ہدایت دینا تھا، وہ عالم مادی کی تخلیق سے پہلے عالم مثال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مثالی پیکر پر منطبق ہوئی۔ اور آپ کے ساتھ عالم مثال سے وہ عالم مادی میں بھی منتقل ہو گئی، شاہ صاحب کا اس تدلی کے مثالی مظہر سے متصل ہونا اور اس سے گھل مل جانا۔

(۲) اس تدلی کے مثالی مظہر کے دو قالب ہیں۔ ایک زیادہ مکمل اور زیادہ عام اور دوسرا اس کا تابع لیکن اپنی جگہ مستقل۔ شاہ صاحب کا اس مثالی مظہر کا دوسرا قالب ہونا، یہ قالب وجود علمی کے قریب ہوتا ہے (یعنی انسانی

کی ہدایت کے لئے جو عمومی اور ابدی اصولِ دین ہیں، اور جن کا مظہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہے، شاہ صاحب کا ان اصولوں کا علماً احاطہ کرنا)

(۳) تدلی اعظم کے اس مثالی مظہر سے متصل ہونے کے نتائج:۔ شاہ صاحب کا مجددیت، وصایت، قطبیت اور طریقت کی امامت کے مقامات پر سرفراز ہونا، اور آپ کو "زکی" اور "نقاط علم کا آخری نقطہ" کے القاب سے یاد کیا جانا۔

سولھواں مشاہدہ

۱۶۱

وہ "تدبیر واحد" جس کا کہ مبداءِ اوّل سے فیضان ہوا، اور یہ ساری کا ساری عالم بس اسی کی تفصیل ہے، اس "تدبیر واحد" کی اصل حقیقت ہی کا نام "حقیقت محمدیہ" ہے، اس حقیقت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ اقدس سے بجلی کی طرح روشن ہوتا، اور شاہ صاحب کا اس کو اپنے اندر جذب کرنا۔

سترھواں مشاہدہ

۱۶۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شاہ صاحب کو سلوک کے راستے پر چلانا۔ اور خود ان کی تربیت فرمانا۔

اٹھارہواں مشاہدہ

۱۶۴

(۱) طریقۂ سلوک کی اصل حقیقت:۔ طریقۂ سلوک وہ اذکار و افکار نہیں جو دنیا میں رائج ہوتے ہیں، بلکہ طریقۂ سلوک کی اصل وہ ارادۂ الٰہی ہوتا ہے، جو ملاءِ اعلیٰ میں قائم ہے۔

(۲) ملاءِ اعلیٰ کے اس ارادۂ الٰہی کا دنیا میں کس شکل میں نزول ہوتا ہے۔

(۳) طریقۂ سلوک کا حامل صرف وہ شخص بنتا ہے، جو اپنی جبلت سے مبارک اور پاک ہو، اور اُسے غیب سے مدد ملے۔

انیسواں مشاہدہ

۱۷۵

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شاہ صاحب کو حنفی مذہب کے ایک بڑے اچھے طریقے سے آگاہ فرمانا جو مشہور احادیث سے موافق ترین ہے۔

بیسواں مشاہدہ

۱۷۷

"میری قبر اور منبر کے درمیان کا قطعہ جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تشریح۔

اکیسواں مشاہدہ

۱۷۹

(۱) علماء اور صوفیا کے طریق کار کا بیان

(۲) تقرب الی اللہ کے دو طریقے

(ا) ایک بالواسطہ یعنی طاعات و عبادات کے ذریعہ اعضا و جوارح کی، اور ذکر و تزکیہ اور اللہ اور اس کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کے ذریعہ قوائے نفس کی تہذیب و اصلاح

(ب) دوسرا بلاواسطہ یعنی اللہ اور بندے کا براہِ راست اتصال، اپنے "انا" کی حقیقت کو بیدار کر کے اس کے ضمن میں ذاتِ حق کا شعور حاصل کرنا، اسی سلسلہ کے یہ "فنا و بقا" اور "جذب" اور "توحید" وغیرہ مقامات ہیں۔

(۳) دونوں طریقوں میں کس کو تفوق ہے۔

بائیسواں مشاہدہ ۱۸۳

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ حضرت علیؓ سے کس جہت سے افضل ہیں۔ اور حضرت علیؓ ان دونوں سے کس لحاظ سے افضل ہیں۔

تیئیسواں مشاہدہ ۱۸۸

"اگر تو نہ ہوتا تو میں افلاک کو پیدا ہی نہ کرتا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اللہ تعالے کے اس ارشاد کی تشریح۔

چوبیسواں مشاہدہ ۱۸۹

علم حدیث کی فضیلت کا بیان

پچیسواں مشاہدہ ۱۹۱

عارفِ کامل کی روح کا مقام عروج

(ا) ملاء اعلےٰ کی ایک بلند اور عالی مرتبہ بارگاہ مقدس۔

(ب) ملاء سافل کی ترقی کا منتہا

چھبیسواں مشاہدہ ۱۹۲

(ا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے معرفت الٰہی کے سلسلہ میں شاہ صاحب پر علوم کا منکشف ہونا۔

(ا) عارف میں اجزائے فلکی کا ظہور بڑا قوی، اور ان کا حکم بڑا موثر ہوتا ہے، اور یہی فلکی اجزا ذریعہ بنتے ہیں اس عالم میں الٰہی تقاضوں کے قیام کا۔
(ب) عارف کامل کے لئے ضروری ہے کہ دنیاوی، جسمانی اور روحانی علائق اُس سے پوری طرح دُور ہوں، اُس کی کیفیات اور جذبات میں تر و تازگی ہو اور اس غور و فکر نے کہ وجودِ حق موجودات میں کس طرح جاری و ساری ہے، اور مبدائے اوّل اپنے ارادۂ حیات میں، عالم کے مظاہر حیات میں کیسے متوجہ ہوتا ہے، اس شخص میں فرسودگی نہ پیدا کر دی ہو۔
(ج) ہر وہ عارف جو معرفتِ حق میں کامل ہوتا ہے، وہ جو کچھ بھی اخذ کرتا ہے۔ صرف اپنے ہی نفس سے کرتا ہے
(د) عارف کامل اللہ تبارک و تعالیٰ: اس کے اسمار اور اس کی تدلیات کے ماسوا جو کچھ بھی ہے، ان سب کو مسخر کر لیتا ہے۔
(ر) عارف کامل کی روح اس کے طریقۂ تصوف، اس کے مذہب، اس کے سلسلۂ طریقت، اس کی نسبت، اس کی قرابت، اور پھر ہر وہ چیز جو اس کے قریب ہے، یا اس کی طرف منسوب ہے، ان میں سے ہر ایک کے ہر ہر پہلو پر نظر رکھتی ہے۔ اور اس پر برابر متوجہ رہتی ہے، اور عارفِ کامل کی روح کی اس توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توجہ بھی ملی ہوتی ہے۔
(س) عارف کامل کو ان تمام نعمتوں سے سرفراز کیا گیا ہے جو نعمتیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو، زمینوں کو، جمادات، نباتات، حیوانات، انسانوں اور فرشتوں کو اور انسانوں میں سے جو انبیار، اولیار اور بادشاہ ہیں، ان سب کو عطا فرمائیں۔

میں اپنی قوم کی مخالفت نہیں کرنا چاہیئے۔ اور دوسرے فقہ میں ان کو ایسا مثالی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جو فقہ حنفی اور سنت دونو کے مطابق ہو۔
(۳) آپ کو وصیت کی گئی کہ انبیاء کے طریقے کو اختیار کریں اور ان کے بارہائے گراں کو اٹھائیں۔

بتیسواں مشاہدہ ۲۲۴

ائمہ اہل بیت کی قبور کی طرف توجہ کرنے سے شاہ صاحب پر ان کے خاص طریقۂ معرفت کا انکشاف۔

تینتیسواں مشاہدہ ۲۲۵

(۱) غیر اللہ سے تعلقات محبت کو بالکل منقطع کرنے، صرف اللہ سے محبت رکھنے غیر اللہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح عداوت کرنے اور اللہ کے ساتھ محض علم و معرفت کے اعتبار سے نہیں بلکہ عملاً اور واقعۃً عشق و محبت رکھنے میں جس عارف سے کوتاہی ہو، وہ فریب زدہ ہے،
(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے بعض ایسے امور کا استفادہ جو کہ شاہ صاحب کی طبیعت کے بالکل برخلاف تھے۔
(ا) آپ کو اسباب کی طرف التفات ترک کرنے کو کہا گیا۔ گو آپ کی طبیعت کا رجحان اسباب کی طرف تھا۔
(ب) آپ کو کہا گیا کہ فقہ کے یہ جو چار مذاہب ہیں، ان کے پابند رہیں اور ان کے دائرے سے باہر نہ نکلیں، اگرچہ شاہ صاحب کو تقلید مذاہب سے طبعاً انکار تھا۔

(ج) آپ کو حضرت علیؓ پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو افضل ماننے کا حکم دیا گیا۔ گو اس معاملے میں شاہ صاحب کی طبیعت کا رجحان حضرت علیؓ کی تفضیل کی طرف تھا۔

چونتیسواں مشاہدہ ۲۲۹

خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے شاہ صاحب کا اپنے نور کو دیکھنا جس نے کہ تمام اقلیموں کو ڈھانپ لیا۔ آپ کو بتایا گیا کہ یہ قطبیت کا نور ہے، جو انھیں دی گئی ہے۔

پینتیسواں مشاہدہ ۲۳۱

خانہ کعبہ کو دیکھنا کہ ملاء اعلےٰ اور ملاء سافل کی ہمتیں اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔

چھتیسواں مشاہدہ ۲۳۳

(۱) شاہ صاحب پر اللہ تعالےٰ کی نعمتیں

(ا) دنیا اور آخرت دونوں کے مواخذے سے آپ کو مامون کر دیا گیا۔

(ب) اطمینان بخش زندگی دی گئی

(ج) خلافتِ باطنی کی خلعت عطا ہوئی

(۲) آئندہ عطا کی جانے والی نعمتوں کا عارف پر انکشاف

(ا) کشف الٰہی کے ذریعہ

(ب) کشف کونی کے ذریعہ

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو خلافتیں

(ا) خلافت ظاہرہ
(ب) خلافت باطنہ

سینتیسواں مشاہدہ

۲۴۱

شاہ صاحب کا دیکھنا کہ ان کی روح میں بڑی وسعت اور فراخی پیدا ہو گئی ہو، اسکا راز۔

اڑتالیسواں مشاہدہ

۲۴۲

(۱) قضا کا رو بہ حرکت ہونا۔
(۲) عارفوں پر قضا کا منکشف ہونا، اور ان کی دعا سے اس کا ٹل جانا۔
(۳) اللہ تعالیٰ کسی عارف سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے۔ اور وہ بات وعدے کے مطابق نہیں ہوتی، باوجود اس کے کہ یہ وعدہ سچے الہام کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس اشکال کی تشریح۔
(۴) مخلوقات کے ظہور کا سلسلۂ ارتقاء
(ا) اس ظہور کی علت العلل ارادۂ الٰہی ہے۔
(ب) اسماء، اعیان، طبیعت کلیہ کا ظہور
(ج) طبیعت کلیہ سے انواع کا ظہور، انواع سے افراد کا ظاہر ہونا۔

انتالیسواں مشاہدہ

۲۴۳

(۱) "خلق ہمت صالح"۔ اور یہ عبارت ہے عارف کے نفس ناطقہ میں ان اعمال اور اخلاق کے متعلق بیداری سے، جو نفس ناطقہ اور

اللہ کے یا عارف کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان ہیں۔ اور نیز یہ خلق عبارت ہے نفس ناطقہ کے نظام صالح کی طرف ہدایت پانے سے۔ ایسا نظام صالح جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہو۔

(۲) جو شخص "خلق سمت صالح" کا حامل ہوتا ہے، اس کامل کے اندر سرّ الٰہی نقش ہو جاتا ہے، اور اسکی زبان ترجمان بنتی ہے شرائع الٰہی کی۔

(۳) حضرت عمرؓ اس طرح کے ایک کامل تھے۔

(۴) شاہ صاحب کو "خلق سمت صالح" کے علم کا ایک حصہ عطا کیا گیا۔ اور لوگوں کے لئے قرب الٰہی کے جو طریقے ہیں، ان کی حقیقت سے آپ کو آگاہ کیا گیا

چالیسواں مشاہدہ

۲۷۱

(۱) شاہ صاحب کو روح کی حقیقت سے مطلع کیا گیا

(۲) روح کے مدارج۔ جسم ہوائی۔ حقیقت مثالی۔ حقیقت روحیہ۔ صورت انسانیہ۔ صورت حیوانیہ۔ صورت نامویہ۔ صورت جسمیہ۔ طبیعت کلیہ اور باطن الوجود کا خارج میں لبسط ہونا۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "ہر نبی کو ایک دعا ایسی مرحمت ہوئی، جو ضرور مقبول ہوتی ہے، ہر نبی نے اپنی اپنی دعا مانگ لی۔ لیکن میں نے اپنی دعا محفوظ رکھی، اور وہ میں قیامت کے دن اپنی امت کی شفاعت کے لئے مانگوں گا۔" آپؐ کے اس ارشاد کی وضاحت

اکتالیسواں مشاہدہ

۲۷۷

(۱) شاہ صاحب پر تخلیق و ایجاد کے علوم کا بالعموم اور عالم خیال میں جو

تخلیق ہوتی ہے، اُس کے علوم کا بالخصوص فیضان ہونا، اور نیز دو متضاد چیزوں اور دو ضدوں میں تطبیق دینے کا علم عطا کیا جانا۔
(۲) تخلیق و ایجاد کی کیا نوعیت ہے۔
(۳) متناقض اور متضاد چیزوں میں تطبیق کی مثال

میں نظام خیر قائم کرنے کے لئے آپ کو ذریعہ بنانا۔
(ب) کفار کے بادشاہ کا مسلمانوں کے شہر پر قابض ہونا اور اجمیر میں کفر کے شعائر اور رسوم کو جاری کرنا۔
(ج) اللہ تعالےٰ کا غضب میں آنا اور اسی کے ساتھ شاہ صاحب کا بھی غضب ناک ہونا، اور "ہر نظام کو توڑ دو" فرمانا
(د) لشکر کفار سے مسلمانوں کا لڑنا اور کفار کے بادشاہ کا قتل کیا جانا

تینتالیسواں مشاہدہ ۲۰۱

(۱) وحدت سے کثرت کے ظہور کا باعث :- وحدت کی یہ حرکت جو وجود کی کثرت میں تدریجاً منتج ہوتی ہے۔ اس کا باعث پاک اور مقدس محبت ہے۔
(۲) ابتدائے امر میں یہ محبت بسیط تھی، بعد میں اس سے جزدی محبتیں ظاہر ہوتی چلی گئیں۔
(۳) ہر ہر فرد میں ایک نہ ایک جزدی محبت ہوتی ہے۔
(۴) افراد کا مدارج کمال۔
(ا) ایسا فرد جو جامع ہو الہیات اور کونیات کے دونوں عالموں کا اور اس سے مقصود کل عالم کے ظہور کی تدبیر ہو تو وہ فرد "نبی" ہوتا ہے۔
(ب) ایسا فرد جس کے ظہور سے مقصود ایسے کمالات کا اثبات ہے کہ ان کی وجہ سے الہی قوتیں کونیاتی قوتوں پر غالب آجائیں تو یہ فرد "ولی" ہوتا ہے۔
(ج) "فرد" کے سفر کمال کا ذکر۔

(د) انسان کے دس ظاہر رقیقے اور ان کے اثرات

(ر) "فرد" کی خصوصیات

(س) بعض طبائع کے لئے حسین چیزوں سے لذت اندوز ہونا ہی ذکر الٰہی بن جاتا ہے۔

(۵) سید عبدالسلام بن مشیش مشہور صوفی کی مندرجہ ذیل دعا کی تفسیر:۔

"اے رب! حجاب اعظم کو میری روح کی زندگی بنا، اور یہی وہ حجاب اعظم ہے جس کی روح میری حقیقت کا راز ہے۔ اور اس حجاب اعظم کی حقیقت ہی حق اول کے متحقق ہونے کے ذریعہ میرے تمام عالموں کو جامع ہے۔"

(ا) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس کے ظہور کی تین نشاتیں،

حقیقت محمدیہ :۔

روح محمدی :۔

ذات محمدی کا ظہور مادی:۔

(ب) دعا کا حاصل مقصود:۔ موصوف اللہ تعالٰے سے اپنی فطری استعداد کی زبان سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انھیں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ان تین نشاتوں میں بالاجمال اور ان میں سے ہر ہر نشاۃ کے مخصوص کمالات میں سے بالتفصیل آپ کا وارث بنائے۔

(۶) عارف کے وصال باللہ کی نوعیت:۔ عارف جب اپنے "انا" کی حقیقت کو منزہ اور مجرد کر لیتا ہے، تو اس ضمن میں اسے ذات حق کا وصال ہوتا ہے۔

(۷) ذات حق کو اشیاء کا علم کیسے ہوتا ہے:۔ اس علم کی دو جہتیں۔

چھیالیسواں مشاہدہ ۳۳۱

(۱) کسی ملت یعنی شریعت اور کسی مذہب یعنی فقہی مسلک کے حق ہونے کے معنی

(ا) معنی جلی

(ب) معنی خفی

(۲) مذہب حنفی کے حق ہونے کے ایک عمیق راز کا شاہ صاحب پر کھولا جانا۔

آخری مشاہدہ ۳۳۹

(۱) شاہ صاحب پر "صراط مستقیم" کی حقیقت کا انکشاف۔ انسانوں میں سے ہر طبقے کا خواہ وہ طبقہ ذکی ہو یا غبی، اپنا اپنا صراط مستقیم ہوتا ہے۔

(۲) انسانی افعال میں سے ہر فعل کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے، جو اس کے ظہور پذیر ہونے کا باعث بنتی ہے۔

(۳) اسی طرح شریعتوں کے ظہور پذیر ہونے کی بھی اپنی علت ہوتی ہے۔

مابعد الطبیعات وکونیات، الٰہیات واسلامیات اور تصوف وحکمت کے یہ سارے مباحث جن کا ذکر ابھی ہم "پیش لفظ" میں اشارۃً کر آئے ہیں "فیوض الحرمین" میں بیان کئے گئے ہیں، اس نوع کے مباحث ایک تو یوں بھی دقیق ہوتے ہیں، دوسری دقت اس ضمن میں یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اس کتاب میں ان مباحث کو ترتیب وار بیان نہیں فرمایا۔ مثلاً ایک موضوع کے متعلق ایک بات انہوں نے کہیں شروع میں کہی ہے، پھر کتاب کے بیچ میں اس کا ذکر کر دیا ہے، اور ایک آدھ جگہ آخر کتاب میں اُسی موضوع کی طرف اشارہ کر گئے ہیں۔ چنانچہ اس بے ربطی اور عدم ترتیب کی وجہ سے کتاب کے یہ مباحث اور بھی دقیق ہو گئے ہیں۔

اس سلسلہ کی تیسری دقت اور شاید قارئین کرام کے لئے وہ سب سے بڑی دقت ہو، شاہ صاحب کا طرز بیان اور ان کی فنی زبان ہے۔ اس زبان اور طرز بیان پر اس زمانے کے مابعد الطبیعاتی تصورات کا اتنا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے کہ جب تک ان تصورات پر پورا عبور نہ ہو، شاہ صاحب کا مقصود پانا محال ہے۔ اب

مشکل یہ ہے کہ یہ مابعد الطبیعاتی تصورات ایک تو اس زمانے میں بالکل غیر مانوس ہو گئے ہیں، اور پھر ان میں اتنے خیالی الجھاؤ ہیں، اور ان کی ہئیت ترکیبی میں اس قدر متنوع اور مختلف عناصر کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان تصورات کی پیچ در پیچ گرہوں کو سلجھا کر اصل مطلب تک پہنچنا بڑی محنت اور غیر معمولی صبر چاہتا ہے! اور ہر پڑھنے والا اس کوہ کنی کے لئے عام طور پر تیار نہیں ہوتا اور نہ اس کے پاس اتنا وقت ہی ہوتا ہے کہ وہ اتنی دیدہ ریزی کر سکے، واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے حکیمانہ افکار کی عام اشاعت میں یہی چیز اب تک سب سے بڑی مانع رہی ہے۔

"مقدمہ" کے ان صفحات میں ہم نے کوشش کی ہے کہ "فیوض الحرمین" کے اہم مباحث کا مختصر سا خلاصہ مناسب عنوانات کے ماتحت جہاں تک ممکن ہو عام فہم پیرایئے میں پیش کریں۔ شاید اس سے قارئین کرام کو کتاب کے جملہ مباحث سے دلچسپی پیدا ہو سکے، اور جس مقصد کے لئے زیر نظر کتاب کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس طرح وہ بھی پورا ہو جائے،

لیکن قبل اس کے کہ اس سلسلہ میں کچھ اور کہیں، یہاں ایک مسئلے کی وضاحت کر دینا ہم بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کتاب میں شاہ صاحب نے کئی جگہ لکھا ہے کہ میں نے خواب میں یہ چیزیں یوں دیکھی، یا مثلاً انہوں نے اس طرح کی باتوں کا ذکر فرمایا ہے کہ میں نے شہدائے بدر کی قبروں سے نور کو روشن ہوتے دیکھا۔ یا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو ظاہر اور عیاں اپنے سامنے پایا، نیز یہ کہ میں نے آپ کی قبر مبارک سے چشمے کی طرح نور کو پھوٹتے ہوئے دیکھا یا ایک اور جگہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی طرف متوجہ تھا کہ ایک نور جو بلندیوں کی طرف پرواز کر رہا تھا، طلوع ہوا اور اس نور سے میرا خیال سرتاپا پُر ہو گیا، اور اس کی تابانی دیکھ کر میں حیرت میں پڑ گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ نور

نورِ عرش ہے۔ یا میں خانۂ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ میں نے خود اپنا نور دیکھا، وغیرہ وغیرہ
اب سوال یہ ہے کہ شاہ صاحب کی اِن خوابوں اور اُن کے اِن مکاشفات کی آخر حقیقت کیا ہے؟ جہاں تک ان مکاشفات کا تعلق ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ وہ اس عالم مادی سے ماوراء جو عالم مثال ہے، یہ سب کے سب اُس کے واردات ہیں۔ صوفیائے کرام کے نزدیک یہ وہ عالم ہے جس میں عالم مادی کی ہر چیز کا مثالی نمونہ موجود ہے۔ اور اُس سے ضرورت کے مطابق اس عالم مادی میں چیزیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔ اور نیز وہ کیفیات اور معانی جن کو اس دنیا میں ہم اپنی جسمانی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ عالم مثال میں یہ سب مادی شکلوں میں متجسم نظر آتے ہیں۔ صوفیاء کرام اس عالم کے حقیقی اور واقعی ہونے کا پورا یقین رکھتے ہیں۔ چنانچہ مکاشفات میں جو کچھ وہ دیکھتے ہیں، اس کا تعلق ان کے نزدیک اسی عالم سے ہوتا ہے۔

شاہ صاحب نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں عالم مثال پر بحث کرتے ہوئے اس نوع کے مکاشفات کو تسلیم کرنے کے بارے میں تین گروہ بتائے ہیں۔ ایک وہ جو اس عالم کو خارج میں واقعۃً موجود مانتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ خود میرا اپنا یہ مسلک ہے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ بے شک دیکھنے والے کو تو یہ واقعات اسی طرح ہی نظر آتے ہیں۔ لیکن خارج میں ان کا وجود نہیں ہوتا۔ شاہ صاحب اس گروہ والوں کو بھی اہل حق میں شمار کرتے ہیں، البتہ تیسرا گروہ جس کا کہنا یہ ہے کہ ان واقعات کی حیثیت محض تمثیل کی ہوتی ہے، اور یہ ادائے مطالب کا بس ایک پیرایہ ہے، شاہ صاحب کے نزدیک اہل حق میں سے نہیں۔

الغرض "فیوض الحرمین" کے اِن مکاشفات کے متعلق اگر قارئین کرام کو

اس بات کے تسلیم کرنے میں تامّل ہو کہ واقعتہً یہ مکاشفات اس شکل میں خارج میں رونما ہوئے یا نہیں تو وہ بڑی آسانی سے ان کو اس طرح مان سکتے ہیں کہ شاہ صاحب نے تو بیشک اپنے مکاشفات میں ان سب واقعات کو ضرور اسی طرح دیکھا ہو گا لیکن خارج میں ان کا کوئی وجود نہیں تھا۔

باقی رہا شاہ صاحب کے خوابوں کا معاملہ، تو ان کی حقیقت بھی ان کی زبان ہی سے سُن لیجئے، "ہمعات" میں خوابوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں:-

"روحانی کیفیات میں سے ایک کیفیت یہ ہے کہ راہِ طریقت کے سالک جب عالم ناسوت کی پستی سے نکل کر عالم ملکوت کی بلندی پر فائز ہوتے ہیں اور خسیس اور ناپاک اعتبارات کو کلیتہً ترک کر دیتے ہیں تو اس حالت میں وہ لطیف اور خوشگوار کیفیات میں اس طرح سرشار ہو جاتے ہیں گویا ان کے نفوس ان کیفیات میں ڈوب کر بالکل فنا ہو گئے۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص بیداری اور حالتِ خواب میں ان کیفیات کو اپنے اندر یکساں پاتا ہے، اور جب یہ شخص سوتا ہے اور اس کے ظاہری حواس نفسانی خواہشات کے اثر و تصرف سے امن میں ہوتے ہیں اور وہ فی الجملہ طبیعت کے تقاضوں اور اس کے احکام سے رہائی حاصل کر لیتا ہے۔ تو اس حالت میں وہ تمام صورتیں، جو اس کے دل کے اندر جمع ہوتی ہیں، خواب میں بر ملا طور پر اس کے سامنے نظر آتی ہیں۔ اور وہ ان کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سالک پر اس مقام میں عجیب عجیب چیزیں اور طرح طرح کے معاملات ظاہر ہوتے ہیں۔"

مکاشفات اور خوابوں کی اصل حقیقت کی اس وضاحت کے بعد اب ہم

اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

مابعد الطبیعات

ایک ذات نے یہ کل کائنات کیسے پیدا کی، یا ایک وجود سے اس کثرت کا کس طرح ظہور ہوا۔ مابعد الطبیعات کے اس نازک مسئلے کو سمجھنے کے سلسلہ میں انسانوں میں عام طور پر یہ تین رجحان پائے جاتے ہیں، ایک یہ کہ ذات حق نے کائنات کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا اور اس کے حکم سے کائنات وجود میں آگئی۔ دوسرا رجحان ان لوگوں کا ہے جو ذات اول کو عقول کا سرچشمۂ اصل مانتے ہیں، ان کے نزدیک سب سے پہلے عقل اول کا ظہور ہوا، اور پھر اس سے تدریجاً اور عقلوں کا نزول ہوتا گیا، یہاں تک کہ یہ سلسلہ کائنات کے وجود پر ختم ہوا۔ تیسرا رجحان یہ ہے کہ یہ ساری کثرت جو ہمیں نظر آتی ہے ایک وجود سے نکلی ہے اس وجود سے متعدد تنزلات ہوئے اور انہی تنزلات کا آخری نتیجہ یہ کائنات ہے، اب پہلا رجحان تو عام اہلِ مذاہب کا ہے، دوسرا رجحان ارباب عقل اور فلسفیوں کا اور تیسرا رجحان صوفیا کا۔ شاہ صاحب اپنے مابعد الطبیعاتی تصورات میں بالعموم ان تینوں رجحانات کو سمیٹنے اور ان میں توافق اور مطابقت پیدا کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ اسی لئے وہ اس ضمن میں تینوں گروہوں کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ بے شک اس سے قدرے گنجلک پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر شاہ صاحب کا جو اصل مقصود ہے، اس پر نگاہ رہے تو اصطلاحات کا یہ اختلاف زیادہ پریشان کن نہیں رہتا۔

ذات حق مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھی؟ شاہ صاحب نے اس "سِر" کو مقام تفکر" میں یوں دیکھا، فرماتے ہیں۔

"ذاتِ حق خود اس امر کی متقاضی تھی کہ وہ استعدادیں جو اس کے اندر مضمر ہیں، اُن کا ظہور عمل میں آئے۔ چنانچہ سب سے پہلے ذاتِ حق کا جو مرتبۂ وجوب ہے، اس مرتبے میں ذاتِ حق کی ان استعدادوں کا عقلی ظہور ہوا، اس ظہور سے وہاں اشیائے ممکنات کے "اعیان" اور ذاتِ واجب کے ظہور کی ہر صورت اور اس کی تدلّی کے ہر مظہر کے "شیون" متمثل ہوئے۔ مرتبۂ وجوب میں ذاتِ حق کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ ان ظہورات کو عدم، مادہ اور خارج سے متصف کرے چنانچہ اس ضمن میں اس نے جو کچھ کہ اعیان اور پہنائیوں میں مضمر تھا اُسے ظاہر کر دیا، اور اس سلسلے میں سب سے پہلے جو چیز ظہور پذیر ہوئی، وہ اللہ تعالیٰ کا نور تھا۔ اس نور نے عدم اور مادہ کا پوری طرح سے احاطہ کر لیا، اور اُن پر یہ مسلط ہو گیا اور یہ نور قائم مقام بن گیا ذاتِ حق کا۔ اور یہ نور قدیم الزمان ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے نزدیک زمان، مکان اور مادہ ایک ہی چیز ہے اور یہی وہ استعداد ہے جس کو ہم نے عدم اور خارج کا نام دیا ہے" صفحہ ٢٦

ہر فعل کے لئے کسی نہ کسی علت کا ہونا ضروری ہے۔ شاہ صاحب اس کلیے کو منوانے کے بعد مخلوقات کے ظہور کی آخری علت کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"اس عالم میں مخلوقات کے ظہور کی جو بھی علتیں ہیں، ان کا سلسلۂ ارتقار آخر میں جا کر ارادۂ الٰہی پر ختم ہوتا ہے لیکن خود اس ارادۂ الٰہی کی بھی ایک علت ہے، جس سے کہ اس کا صدور ہوتا ہے اور وہ علت ہے ذاتِ الٰہی کا خود اپنا اقتضا، ارادے کے لئے، اور ارادے کا لازم ہونا ذاتِ الٰہی کے لئے۔۔

۔۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ ذاتِ واجب الوجود سے ارادے کا تعلق ایسا ہی ہے جیسے ان تاثیر کرنے والی استعدادوں کا جنہیں "اعیان" کہا جاتا ہے،

ذات واجب سے تعلق ہے ۔ یعنی جس طرح اِن "اسماء اور اعیان" کے ظہور کے لئے ذات واجب کا اقتضا ہوتا ہے ، اور ذات واجب کے لئے اِن "اسما" اور "اعیان" کا ہونا لازم ہی سی ہے ، اسی طرح ذاتِ واجب کے ساتھ ارادے کا تعلق ہے ۔ اور یہ جو دو تاثیر کرنیوالی استعدادیں یعنی "اسمار" اور "اعیان" ہیں ، ان کے ظہور کی ایک حد مقرر ہے ، جو خود ذات واجب کی طرف سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس میں نہ زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ کمی ۔ صفحہ ۲۵۴
شاہ صاحب نے اس مسئلے کو وضاحت کے لئے ایک حساب کرنے والے کی مثال دی ہے ۔

" ایک حساب کرنے والا جب حساب کرتا ہے تو اس کے حساب کرنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس کا ارادہ ایک عدد سے متعلق ہوا تو اس سے ایک بنا ، اور جب ایک کے عدد کو اس کی نظر نے دوبارہ دیکھا تو دو کا عدد معرضِ وجود میں آگیا ۔ . . . غرضیکہ جب حساب کرنے والا کا ارادہ ایک سے دو ، دو سے تین ، اور اسی طرح تین سے جو اگلا عدد ہے ، اس کو اس سے نکالتا چلا جائے گا تو جہاں تک کہ حساب کرنے والے کے علم کی حد ہوتی ہے ، اس حد تک اس ایک عدد سے اکائیاں ، دہائیاں ، سینکڑے اور ہزار نکلتے چلے جائیں گے ۔ چنانچہ جہاں تک کہ حساب کرنے والے کی عقل فرض کر سکتی ہے ، وہ ان اعداد کو ایک دوسرے کے ساتھ برابر جمع کرتا چلا جائے گا ، یہاں تک کہ یہ اعداد اپنی اس شکل میں لانہایت حد تک پہنچ جائیں ۔ اب اگر ان تمام اعداد کو ان کی اصل کی نسبت سے جو ایک کا عدد ہے ، اور جس سے کہ یہ سب اعداد نکلے ہیں ، دیکھئے تو یہ سب اعداد ایک کے عدد میں محصور نظر آئیں گے ، اور ان اعداد میں آپس میں جو فرقِ مراتب ہے تو وہ اس ایک کے عدد کے اعتبار سے نہیں ہوگا ، بلکہ جس طرح یہ اعداد درجہ بدرجہ اس ایک کے عدد سے نکلے ہیں ۔ ان میں فرق مراتب اس لحاظ سے ہوگا ۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ اعداد کی ان بے شمار صورتوں کے ظہور کی علت صرف اتنی تھی کہ

محاسب کے اندر حساب کرنے کا ایک کمال موجود تھا۔ چنانچہ محاسب نے اپنے اس کمال کو ظہور میں لانے کا ارادہ کیا، اور اس طرح یہ اعداد معرضِ وجود میں آتے چلے گئے۔ باقی رہا خود ان اعداد میں جو ترتیب، حصر اور انضباط ہے کہ اس میں نہ کمی ہو سکتی ہے اور نہ بیشی، تو یہ چیز تو محاسب کے ارادے کی فعلیت سے پہلے ہی ان اعداد کی خود اپنی طبیعت میں موجود تھی۔ اور محاسب کا ارادہ جب اِن اعداد کو اس ترتیب و انضباط سے وجود میں لاتا ہے، تو وہ گویا ان اعداد کی جو اپنی طبیعت ہوتی ہے، اور ان کے ظہور کے جو اپنے احکام ہوتے ہیں، وہ انہی کو پیش کر دیتا ہے۔" صفحہ ۵۸-۲

ان "اسماء" اور "اعیان" کو "ماہیات" بھی کہتے ہیں۔ ظہورِ کائنات کے سلسلہ میں "ماہیات" کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"اب جو ہم چیزوں کے بنانے اور ان کے ایجاد کرنے کو ان چیزوں کی ماہیات کی طرف منسوب کرتے ہیں [ہر شے قبل تخلیق حق تعالےٰ کے علم میں موجود تھی۔ پھر اس نے اِن اشیاء کی خارج میں تخلیق فرمائی۔۔۔۔ یعنی اشیاء قبل تخلیقِ خارجی علمِ الٰہی میں ثابت ہیں۔ اس حالت میں یہ اشیاء "معلومات حق" ہیں "صور علمیہ حق" ہیں۔ انہی کو "اعیانِ ثابتہ" "ماہیات اشیا" اور "حقائق اشیاء" کہتے ہیں۔ مترجم] تو ماہیات کی طرف ہمارا ان چیزوں کو منسوب کرنا ایسا ہی ہے، جیسے ہم اوپر کی صورت میں اعداد کے عدم سے وجود میں آنے کو محاسب کی تاثیر کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ اور "ماہیات" سے ان چیزوں سے ظہور پذیر ہونے سے پہلے ان چیزوں کی اِن "ماہیات" اور ان کے لوازم کو ذات حق سے جس سے کہ ان "ماہیات" کا فیضان ہوتا ہے، ایسی ہی نسبت ہے جیسی کہ ان اعداد کے ترتیب وار مدارج کو اس ایک کے عدد سے ہے جس سے کہ یہ سب اعداد نکلے ہیں۔ اور ایک عدد کا دوسرے پر تقدم اور ان کا آپس میں جو فرقِ مراتب ہے، یہ خود اُن اعداد کی اصل طبیعت میں داخل ہے۔ الغرض جب

یہ بات واضح ہوگئی تو اس سے، لوگ یہ جو کہتے ہیں کہ "ماہیات" "غیر مجعول" ہیں یعنی یہ بنائی نہیں گئیں، بلکہ ان کے بنانے اور ایجاد کرنے کا مطلب صرف ان کا ظہور اور فیضان مقدس ہے، سمجھ میں آجائے گا۔ صفحہ ۲۵۹

"ماہیات" نام ہے پیدا ہونے والی اشیاء کے متعلق اللہ تعالٰی کے اس علم کا جو اُسے ان چیزوں کو وجود مادی میں لانے سے پہلے تھا۔ یہ پیدا ہونے والی تمام کی تمام اشیاء ایک موطن میں بالترتیب جمع تھیں جسے "طبیعت کلیہ" کہا گیا ہے اس "طبیعت کلیہ" سے اشیاء کس طرح ظاہر ہوئیں، اس بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

"الغرض جس طرح اعداد کا سلسلہ ایک کے عدد سے لیکر لامتناہی حد تک بالترتیب چلا گیا ہے، اور اعداد کا یہ سارے کا سارے لامتناہی سلسلہ اسی ایک کے عدد کے اندر فرضاً اور تقدیراً موجود ہے، نہ کہ فعلاً، اسی طرح "طبیعت کلیہ" کے اندر جو بھی اس کے ارکان اور نیز جو بھی جمادات، نباتات اور حیوانات ہیں، ان سب کا ایک مرتب سلسلہ جن کے خواص اور مراتب معلوم ہیں، موجود ہے۔ ...... اس طبیعت کلیہ سے انواع کا ظہور ہوا اور انواع کا یہ ظہور حساب میں جو تقسیم حصری کا طریقہ ہے، اس کے مطابق ہوا یعنی ان میں نہ مزید کوئی زیادتی ہوسکتی ہے اور نہ کمی۔ ان انواع سے پھر افراد ظاہر ہوئے۔ ...... قصہ مختصر "ماہیت الماہیات" اور "حقیقۃ الحقائق" سے لے کر انواع و افراد کا یہ جو سلسلہ لامتناہی حد تک پھیلتا چلا گیا ہے، یہ سب کا سب "حقیقۃ الحقائق" اور اشیاء کے اصل بسیط میں باعتبار فرض اور امکان کے نہ کہ بلحاظ تعین بالفعل کے موجود تھا" صفحہ ۲۶۰

ذات حق نے ارادہ کیا، اور اس کے ارادہ کرنے سے کائنات کا سلسلہ وجود میں آگیا۔ اب سوال یہ ہے کہ ذات حق نے یہ جو ارادہ کیا، تو اس کا باعث

کیا تھا۔ اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"اس امر میں کسی قسم کا شبہ نہیں کہ حقیقت الحقائق ایک وحدت ہے جس میں کہ کثرت کا گزر نہیں۔ اس وحدت کے لئے تنزلات ضروری ہیں تاکہ یہ تنزلات واسطہ بنیں اس وحدت سے کثرت کے ظہور کے۔ اور اس طرح وجود کے مختلف مراتب کے احکام اور ان کی خصوصیات کا تعین ہو سکے۔ حقیقت الحائق کی اپنی وحدت خالص سے تنزلات کی طرف اور تنزلات سے وجود کے مختلف مراتب کی طرف حرکت تدریجی ہوتی ہے۔ اور اس حرکت سے سوائے اس کے اور کچھ مقصود نہیں ہوتا کہ اس وحدت خالص کا جو ذاتی کمال ہے، اس کا ظہور ہو سکے

وحدت کی یہ حرکت جو وجود کی کثرت میں منتج ہوتی ہے اس کا باعث پاک اور مقدس محبت ہے، اور یہ پاک اور مقدس محبت ذات واحد کے اس ارادہ اختیاری سے جس کو بعض لوگ اس حرکت کا باعث قرار دیتے ہیں اعلیٰ اور برتر چیز ہے...... یہ محبت ابتدا میں بالکل بسیط تھی لیکن جیسے جیسے کثرت کا ظہور ہوا، اس محبت کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا، بات یہ ہے کہ مراتب وجود میں سے ہر ہر مرتبہ کی اپنی اپنی مخصوص محبت ہوتی ہے۔ اور ہر مرتبہ کی یہی مخصوص محبت سبب بنتی ہے۔ اس مرتبۂ وجود کے ظہور کی۔ لیکن اس میں یہ یاد رہے کہ گو یہ محبت ابتدائے امر میں بسیط ہوتی ہے، اور بعد میں اس سے بہت سی محبتیں پیدا ہو جاتی ہیں، لیکن یہ محبت اس بسیط حالت میں بھی ان تمام محبتوں سے جو بعد میں اس سے ظاہر ہوتی ہیں خالی نہیں ہوتی" صفحہ ۳۰۱

الغرض اس عالم میں جتنی بھی اشیاء ہیں، ان میں سے ہر ہر شے کا مادی وجود گویا ایک جزوی محبت کا مظہر ہے، اور جس طرح اشیاء کے اپنے اپنے مدارج ہوتے ہیں اسی طرح یہ جزوی محبتیں بھی مختلف درجے رکھتی ہیں، اس ضمن میں شاہ صاحب [illegible]

"ہمیں اس کا مشاہدہ ہوا ہے، کہ انسانیت کے ظہور کا جو اساس اصلی ہے۔ وہ محض حیوانیت کے تابع نہیں، بلکہ حیوانیت سے زائد انسانیت میں ایک اور محبت ہے جو ذاتِ واحد سے ابتدا میں ظاہر ہوئی تھی، اور اسی طرح حیوانیت کے ظہور کا جو اساس ہے وہ بھی تمام تر نامویت یا نباتیت کے تابع نہیں ہے" صفحہ ۲۰۔

ذات حق کے فیض تخلیق سے اشیاء تو اس عالم میں موجود ہو گئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان اشیاء کی لمحہ بہ لمحہ نقل و حرکت کا ذات حق کو کیسے علم ہوتا ہے۔ مابعد الطبیعات کا یہ بڑا اہم مسئلہ ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"ذات اول کو دو جہت سے اشیاء کا علم ہوتا ہے، ان میں سے ایک اس کے علم کی اجمالی جہت ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب ذات اول کو اپنی ذات کا علم ہوا تو اس ضمن میں اس نے نظام وجود کے سلسلہ میں اپنا جو اقتضائے ذاتی تھا۔ اس کو بھی جان لیا۔ بات یہ ہے کہ علت تامہ کا یعنی وہ علت جس کا لازمی نتیجہ اس سے معلول کا صدور ہو، علم اس امر کی کفایت کرتا ہے کہ علت تامہ کے ساتھ ساتھ معلول کا بھی علم حاصل ہو گیا۔ اب جہاں تک کہ اشیائے عالم کا تعلق ہے، وہ سب کی سب وجود الٰہی میں موجود تھیں۔ ...... چنانچہ ایک چیز جب متحقق ہوئی تو اس کا متحقق ہونا اس بنا پر تھا کہ ذات واجب نے اسے متحقق کیا، اور اسی طرح ایک چیز جب وجود میں آئی تو اس کا وجود میں آنا اس وجہ سے تھا کہ ذاتِ واجب نے اسے ایجاد کیا۔ غرضیکہ ہر چیز کے مقابل ذاتِ واجب کا ایک کمال اور اس کا اقتضائے ذاتی ہے، اور ذاتِ واجب کے یہی وہ کمالات ہیں جو اشیاء کے ظہور کا منبع اور ان کے حقائق کی اصل کنہ ہیں۔ چنانچہ جس طرح ذات واجب

کا ہر کمال خود اپنی خصوصیت کے اعتبار سے ایک نہ ایک چیز کو وجود میں لانے کا متقاضی ہوتا ہے، اسی طرح ہر چیز وجود میں آنے کے لئے ذاتِ واجب کے ایک نہ ایک کمال کی محتاج ہوتی ہے، گویا کہ ذاتِ واجب کے یہ کمالات اور یہ اشیاء امر واحد ہیں" صفحہ ۳۲۸
یہ تو ذات اول کا علم اجمالی ہوا اشیاء کا۔ اس کے علم اشیاء کی دوسری جہت تفصیلی ہوتی ہے، اور اس کی شرح یہ ہے۔

"ہر چیز جو موجود ہے وہ معلول ہے ذات واجب کی، اور جو چیز معلول نہیں تو اس چیز کا متحقق ہونا بھی ممکن نہیں۔ اور اس سلسلہ میں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ یہ معلولات ذاتِ حق کی اس طرح محتاج نہیں کہ جیسے ایک عمارت کا بننا محتاج ہوتا ہے معمار کا، یعنی جب عمارت بن گئی تو پھر معمار کی ضرورت نہ رہی۔ بلکہ ان معلولات کو جب تک کہ وہ معلولات موجود ہیں، اپنے تقرر میں، اپنے جوہر ہوتے، متحقق ہونے اور قیام پذیر ہونے میں ذات واجب کی برابر حاجت رہتی ہے......
... الغرض ذات اول ان اشیاء کو ان اشیاء ہی کے ذریعہ جانتی ہے" صفحہ ۳۲۹

الہیات

شاہ صاحب کے نزدیک بنی نوع انسان کے ہر ہر فرد کے دل کی گہرائیوں میں، اس کے جوہر نفس میں اور اس کی اصل بناوٹ میں اللہ تعالیٰ کو جاننے کی استعداد رکھی گئی ہے۔ لیکن انسانوں کی اس استعداد پر اکثر پردے پڑ جاتے ہیں۔ انبیاء اور مصلحین جو مبعوث ہوتے ہیں، ان کا کام دراصل انسانوں کی اسی فطری استعداد سے ان پردوں کو ہٹانا ہوتا ہے۔ صفحہ ۱۱۲ و صفحہ ۲۶۸

انسانوں میں اللہ تعالیٰ کو جاننے کی یہ استعداد کہاں سے آئی، اس کی تفصیل شاہ صاحب نے اس طرح بیان فرمائی ہے۔

"خارج میں جب شخص اکبر کا وجود بنا تو سب سے پہلا کام شخص اکبر نے یہ کیا کہ اس نے اپنے رب کو پہچانا، اور اس کی جناب میں عجز و نیازمندی کی اور یہ عجز و نیازمندی شخص اکبر کے ادراک میں ایک علمی صورت کی طرح نقش ہو گئی" صفحہ ٧٧

جس طرح شخص واحد عبارت ہوتا ہے جسم اور نفس دونوں کے مجموعہ سے، اسی طرح کل کائنات کا بھی ایک کلی جسم اور ایک کلی نفس مانا گیا ہے۔ اور ان دونوں کے مجموعے کا نام شخص اکبر ہے، اس شخص اکبر سے جب افلاک، عناصر، انواع اور افراد نکلے تو اللہ تعالیٰ کو جاننے کی وہ علمی صورت جو شخص اکبر کے ادراک میں پہلے پہل نقش ہوئی تھی، اس سے یہ بھی بہرہ ور ہوئے، اور اسی طرح انسانوں کے اندر ذات حق کی ایک تدلی یا اس کا جلوہ مستقر ہو گیا۔ صفحہ ٧٨

شخص اکبر کی اس تدلی کی نوعیت کیا ہے۔ اس بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"شخص اکبر نے جب اپنے رب کو اس طرح جان لیا جیسا کہ اس کے جاننے کا حق تھا اور اس نے اپنے رب کا اس طرح تصور کر لیا جس طرح کہ اس کو تصور کرنا چاہیئے تھا تو اس کے رب کو اس طرح جاننے اور اس کا اس طرح تصور کرنے سے شخص اکبر کے ادراک میں اللہ تعالیٰ کی ایک باعظمت صورت نقش ہو گئی، جو ترجمان بن گئی اللہ تعالیٰ کی جلالت شان اور اس کی عزت و رفعت کی۔ چنانچہ جب تک شخص اکبر کا وجود قائم ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ صورت بھی اس کے اندر موجود رہے گی" صفحہ ١٤١

افراد انسانی چونکہ اسی شخص اکبر کا حصہ ہیں، اسی لئے ان میں سے ہر ہر فرد کے اندر شخص اکبر کی اس صورت کا کسی نہ کسی حد تک ہونا ضروری ہے۔ نفس انسانی کا یہ نقطہ جسے "نقطۂ تدلی" کہا گیا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ جیسے جیسے

اسباب و حالات ہوتے ہیں، انہی کے مطابق، "یہ نقطۂ تدلی" اور اس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ صفحہ ۱۴۴

آخر یہ تدلی کیا چیز ہے؟ ذاتِ حق کے لامحدود کمالات میں سے اس عالم میں جب کوئی اس کا کمال اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عنوان بن جاتا ہے۔ ذاتِ حق کا، تو ذاتِ حق کے کمال کے اس طرح ظہور پذیر ہونے کو تدلی کہتے ہیں۔ اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"تمہیں جاننا چاہیئے کہ اللہ تبارک تعالیٰ کی ایک عظیم الشان تدلی ہے جو خلق کی طرف متوجہ ہے۔ لوگ اسی تدلی کے ذریعہ ہدایت پاتے ہیں، اس تدلی کی ہر زمانے میں ایک نئی "شان" ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ ایک زمانے میں ایک مظہر میں ظاہر ہوتی ہے اور دوسرے زمانے میں دوسرے مظہر میں، اور جب کبھی یہ تدلی کسی خاص مظہر میں ظاہر ہوتی ہے تو اس مظہر کا عنوان "رسول" ہوتا ہے۔" صفحہ ۱۳۴

شاہ صاحب کے نزدیک "رسول" بے شک اس تدلی کے کسی خاص مظہر کا عنوان بنتا ہے، لیکن احبار اور رہبان اور حکماء اور محدثین بھی تدلی الٰہی کے اسی سرچشمے سے ہی علم حاصل کرتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "میں نے اس تدلی کو جو اپنی ذات میں ایک ہے دیکھا اور یہ پایا کہ جیسے جیسے خارجی حالات و اسباب ہوتے ہیں، اسی مناسبت سے وہ طرح طرح کے مظاہر میں صورت پذیر ہوتی ہے۔ خارجی حالات و اسباب سے میری مراد لوگوں کی عادت و اطوار اور اُن کے ذہنوں میں جو علوم مرکوز ہوتے ہیں، اُن سے ہے۔ صفحہ ۶۷

دوسرے لفظوں میں ہر زمانے میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے جو ہدایت آتی

ہے وہ اس زمانے کے مذاق اور اس کی خصوصیات کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوتی ہے اور آخر ایسا کیوں نہ ہو، خود شاہ صاحب کے الفاظ ہیں۔

"جہاں تک تدلی اور شعائر کے ظہور کا تعلق ہے تو لوگوں کے جو مسلمات ہوتے ہیں، اور جو چیزیں ان کے ہاں مشہور ہوتی ہیں، اور لوگوں کے دل ان سے مطمئن ہوتے ہیں، تدلی اور شعائر ان چیزوں ہی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی تدلی کا ظہور ہوتا ہے، لوگوں کے مسلمات ہی اس کے نزول کا ذریعہ بنتے ہیں، اور ایسا کیوں نہ ہو، آخر تدلی سے اللہ تعالٰے کا مقصد تو یہی ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ جہاں تک کہ ان سے ہو سکے اس کی اطاعت کریں اور اپنے اعضاء و جوارح کو اعمال اطاعت کا عادی بنائیں اور اس کے لئے ضروری ہے کہ تدلی لوگوں کے لئے مانوس صورتوں میں ظاہر ہو" صفحہ ۹۱

اس سلسلہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "ممکن ہے تمہارے دل میں یہ خیال گزرے کہ ہر تدلی کا خارق عادت اور اعجاز ہونا ضروری ہے، اس لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تدلی لوگوں کے مسلمات کے مطابق ہو" اس پر شاہ صاحب نے مفصل بحث کی ہے۔ اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تدلی کی وجہ سے ان چیزوں میں ایسی خیر و برکت پیدا ہو گئی جو دوسری چیزوں میں نہ تھی اور ان چیزوں کا خارق عادت ہونا دراصل اسی خیر و برکت کے لحاظ سے تھا نہ اس وجہ سے کہ ان چیزوں میں خلاف عادت کوئی تبدیلی ہو گئی ہو صفحہ ۹۲

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اللہ تعالٰے نے مجھے اس تدلی کے مختلف زمانوں میں مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہونے کی حکمت اور پھر اس تدلی کی ایک صورت کا دوسری صورت سے جو وجہ امتیاز ہے اور جو دراصل نتیجہ ہوتا ہے ان

خارجی حالات و اسباب کا جو اس تدلی کے ظہور کا باعث بنتے ہیں۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے مجھے اس حکمت اور اس وجہ امتیاز سے آگاہ فرمایا" صفحہ ۷۔

اب اگر آپ اس تدلی سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت و ارشاد کا وہ سلسلہ مراد لیں جو اہلِ مذاہب کے نزدیک روزِ اوّل سے اب تک انسانوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے جاری ہے تو شاہ صاحب نے اس ضمن میں اپنی جو خصوصیت بیان فرمائی ہے، اس کے معنی یہ لئے جا سکتے ہیں کہ شاہ صاحب یہاں مذاہب کے ارتقار کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مجھے قدرت کی طرف سے ارتقار کو تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا ملکہ عطا کیا گیا ہے۔

وحدت الوجود

شاہ صاحب نے خواب میں (پہلا مشاہدہ) دیکھا کہ اہل اللہ کا ایک گروہ ہے جو عقیدۂ وحدت الوجود کو مانتا ہے۔ اور اس کائنات میں ذات باری کے وجود کے جاری و ساری ہونے کے متعلق وہ کسی نہ کسی شکل میں غور و فکر کرنے میں مشغول ہے، اور چونکہ اس ضمن میں ان سے ذات حق کے بارے میں جو کل عالم کے انتظام میں بالعموم اور نفوس انسانی کی تدبیر میں بالخصوص مصروف کار ہے، کچھ تقصیر ہوئی ہے، اس لئے ان لوگوں کے دلوں میں ایک طرح کی ندامت ہے اور ان کے چہرے سیاہ ہیں، اور ان پر خاک اڑ رہی ہے۔

اس سلسلہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ بیشک وحدت الوجود کا مسئلہ تو علوم حقہ میں سے ہے اور ذات حق میں کل موجودات کو گم ہوتے دیکھنا بھی

امر واقعہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے نفوس انسانی میں الگ الگ استعدادیں رکھی ہیں۔ چنانچہ ہر نفس اپنی اپنی فطری استعداد کے مطابق ہی علوم حقہ میں سے اگر کسی علم کو حاصل کرے تو اس کی صحیح معنوں میں تہذیب و اصلاح ہوتی ہے۔ اب ہوا یہ کہ یہ گروہ جس کو وحدت الوجود پر اعتماد تھا، ان کی اس معاملہ میں بیشک اصل حقیقت تک تو رسائی ہو گئی لیکن چونکہ ان کی طبیعت کو اس علم سے فطری مناسبت نہ تھی، اس لئے وحدت الوجود سے انہیں ندامت اور روسیاہی کے کچھ حاصل نہ ہوا، صفحہ ۵۶

یعنی وحدت الوجود کا مسئلہ اپنی جگہ امر حق سہی، لیکن اگر اس سے تہذیب نفس نہیں ہوتی تو وہ بے کار محض ہے، بے شک وجود باری موجودات میں جاری و ساری ہے، اور مبدائے اول اپنے ارادۂ حیات میں عالم کے مظاہر حیات میں متوجہ بھی ہے لیکن عارف کامل کے لئے ضروری ہے کہ ان امور میں وہ اس طرح غور و فکر نہ کرے کہ اس کے اندر فرسودگی آجائے اور اس کی کیفیات اور جذبات کی تروتازگی باقی نہ رہے، صفحہ ۱۹۷

اگر کوئی عارف اس ابتلاء میں پڑ جائے تو وہ یقیناً فریب زدہ ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں شاہ صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ وہ شخص جس سے غیر اللہ سے تعلقات محبت کو بالکل منقطع کرنے، صرف اللہ ہی سے محبت رکھنے، غیر اللہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح عداوت کرنے اور نیز اللہ کے ساتھ محض علم و معرفت کے اعتبار سے نہیں بلکہ عملاً اور واقعۃً عشق و محبت رکھنے میں کوتاہی ہو تو بے شک وہ شخص فریب زدہ ہے، خواہ اس کا سبب یہ ہو کہ وہ شخص کائنات کی اس کثرت میں ایک ہی وجود کو جاری و ساری دیکھنے میں منہمک رہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ

اس کائنات کی ہر چیز سے محبت کرنے لگتا ہے، کیونکہ اس کے نزدیک وہی ایک وجود جو کہ اس کا محبوب ہے اس کل کائنات میں جاری و ساری ہے" صفحہ ۱۲۵
شاہ صاحب کے زمانے میں وحدت الوجود اور وحدۃ الشہود کا مسئلہ مابہ النزاع ہو رہا تھا، آپ نے ان دونوں میں مطابقت پیدا کی اور ایک ایسی راہ نکالی کہ حکمت و مذہب دونوں کے مطالبات پورے ہو جائیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں۔

"میں نے اس پھیلے ہوئے وجود کو دو جہت سے ذات حق میں گم پایا۔ ذات حق میں اس کے گم ہونے کی ایک جہت تو یہ ہے کہ یہ وجود چونکہ خود ذات الٰہی سے برابر صادر ہو رہا ہے، اس لئے میں نے اسے ذاتِ حق میں گم ہوتے ہوئے پایا۔ اور ذات حق میں اس کے گم ہونے کی دوسری جہت یہ ہے کہ (اللہ تعالٰی کی تجلی اس وجود میں ظاہر ہوئی، اور اس نے ہر طرف سے اس وجود کو اپنے اندر لے لیا۔ چنانچہ اس طرح یہ وجود ذات حق میں مجھے گم ہوتا ہوا نظر آیا۔ اب جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ وجود منبسط خود ذات حق ہے، ظاہر ہے، یہ اس کی زیب زدگی ہے لیکن جو شخص کہ باریک بیں نظر رکھتا ہے، وہ تو یقینی طور پر اس معاملہ میں اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ ذات واجب سے شیون الٰہی (شیون جمع شان کی) کا صدور ہوا جو کہ مبدائے اول میں تھیں اور ان سے اس وجود منبسط کا ظہور ہوا"
صفحہ ۲۸۷

تاریخ اسلام میں علماء اور صوفیاء کا جھگڑا شروع سے چلا آتا ہے اور یہ بحث کہ شریعت مقدم ہے یا طریقت، ایک عالمگیر نزاع کی شکل اختیار کر چکی ہے، اس سلسلہ میں شاہ صاحب کی رائے یہ ہے

"وہ علماء کہ ان کا جتنا بھی مبلغ علم ہے، وہ اسی کے مطابق مصروف عمل ہیں اور اپنی بساط کے مطابق کسی نہ کسی حیثیت سے لوگوں کے تزکیہ میں لگ

ہیں، اور علم اور دین کی اشاعت میں سرگرم کار ہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب، ان کے ہاں زیادہ محترم اور ان کی نظروں میں زیادہ محبوب ہیں بہ نسبت ان صوفیاء کے جو "ارباب فنا و بقا" ہیں اور "جذب" جو نفس ناطقہ کی اصل سے پھوٹتا ہے اور "توحید" اور اس طرح کے تصوف کے جو اور بلند مقامات ہیں، اُن پر سرفراز ہیں" صفحہ ۱۶۹

اگر یہ تمام عالم اور جو کچھ اس کے اندر ہے، سب اُسی کے جلوے کا ظہورِ کمال ہے تو لوگوں کے اس کفر و انکار کے کیا معنی، اور بقول مرزا غالب ع

توپھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

شاید اسی حقیقت کو شاہ صاحب نے اس تمثیلی رنگ میں بیان فرمایا ہے۔

"میں روح آفتاب سے ملا اور میں نے اس سے کہا کہ اے روح آفتاب! لوگ تجھ سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہر رنگ اور ہر طور میں تیرا غلبہ اور ظہور دیکھنے کے باوجود وہ تیرا انکار کرتے اور تیرے خلاف جھوٹ باندھتے ہیں، لیکن تیری حالت یہ ہے کہ نہ تو ان سے انتقام لیتی ہو اور نہ اُن پر خفا ہوتی ہے۔ یہ سُن کر روحِ آفتاب بولی کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اِن لوگوں کا غرور اور تکبر اور یہ ان کا اپنے آپ میں پھولا نہ سمانا خود میری اپنی ذاتی مسرت کا ایک مظہر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میری نظر ان لوگوں کے غرور و تکبر کی طرف نہیں جاتی، بلکہ میں تو ان لوگوں کی خوشی و شادمانی کو دیکھتی ہوں اور جانتی ہوں کہ یہ سب میری اپنی خوشی و شادمانی کا ایک پرتو ہے، اس بات کو جانتے ہوئے کیا یہ جائز ہے کہ کوئی خود اپنے ذاتی کمال پر بگڑے۔ یا کوئی خود اپنی ذات سے انتقام لے" صفحہ ۶۴

اقبال نے اسی حقیقت کو "جہاں تیرا ہے یا میرا" کے تحت اس مصرع

میں ادا فرمایا ہے

اگر گنج رد ہیں انجم آسمان تیرا ہے یا میرا

اسلامیات

شریعتوں کی تشکیل

اللہ تعالیٰ نے جب یہ کائنات بنائی تو اس کی توجہ ایک عام تدلی کی صورت میں اس کائنات کی طرف ملتفت ہوئی۔ یہ تدلی تمام بنی نوع البشر کے لئے تھی۔ اور اس سے اللہ تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ وہ اس کے ذریعے اپنے تک پہنچنے کی راہ لوگوں کے لئے آسان کر دے یہ تدلی مختلف زمانوں میں مختلف صورتیں اختیار کرتی آئی ہے۔ اس تدلی کا مختلف صورتیں اختیار کرنا ان خارجی حالات و مقتضیات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جن میں یہ تدلی معین اور متشخص ہوتی ہے۔ تدلی کی ان صورتوں میں سے نبوت، نماز، الہامی کتابیں، شریعت کے احکام و ضوابط اور بیت اللہ وغیرہ ہیں صفحہ ۵۔

یہ تدلی عبارت ہے رشد و ہدایت کے اس سلسلے سے جو ابتدائے آفرینش سے چلا آرہا ہے اور مختلف زمانوں میں مختلف مذاہب کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا رہا ہے۔ تدلی الٰہی کا خارجی حالات سے مطابق ہونا ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کے الفاظ میں "شریعتوں کے احکام و قواعد کی تشکیل لوگوں کی عادات کے مطابق ہوتی ہے۔ اور اس بات میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ جب کسی شریعت کی تشکیل ہونے لگتی ہے، تو اس وقت اللہ تعالیٰ لوگوں کی عادات پر نظر ڈالتا ہے۔ چنانچہ جو عادتیں بری ہوتی ہیں، ان کو تو ترک کرنے کا حکم دیتا ہے، اور جو عادتیں اچھی ہوتی ہیں، ان کو اپنے حال پر رہنے دیا جاتا ہے۔"

شریعت کا نزول کس شخص پر ہوتا ہے ؟ شاہ صاحب کے نزدیک انسانوں کے اخلاق میں سے ایک خلق "سمت صالح" ہے۔ اور یہ عبارت ہے ایک شخص کے نفس ناطقہ میں ان اعمال اور اخلاق کے متعلق بیداری سے جو اس کے نفس ناطقہ اور اللہ کے یا اس کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان ہیں اور یہ خلق عبارت ہے اس شخص کے نفس ناطقہ کے نظام صالح کی طرف ہدایت پانے سے۔ الغرض جو شخص اس "خلق سمت صالح" کا مالک ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے اس نسبت سے نوازتا ہے، بندے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس معرفت اور ہدایت کا فیضان اس بندے کی کسی کاوش اور تردد کا صلہ نہیں ہوتا بلکہ اس فیضان کو بارگاہ رحمت کی ایک برکت سمجھنا چاہیئے صفحہ ۲۶۳

صاحب "خلق سمت صالح" کس طرح اس معرفت اور ہدایت سے نوازا جاتا ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

"یہ رحمت انسانوں میں سے کسی ایسے کامل کی طرف متوجہ ہوتی ہے جو اپنی جبلت کے تقاضے سے اس امر کا مستحق ہو کہ ایک انسان پر طبیعت کے جو احکام وارد ہوتے ہیں، وہ اُن سے بالاتر ہو جائے۔ اور پھر وہ کامل انسانوں کی جس جماعت میں ہو، اس جماعت کے مزاج سے، اور اس جماعت کے مناسب جو اعمال و اخلاق ہیں اُن سے اور نیز اس کی جماعت کے لوگ اپنی حیوانی طبیعتوں سے ترقی کر کے کس طرح قرب الٰہی کے اس درجے تک جو اُن کے لئے مقدر ہو چکا ہے، پہنچ سکتے ہیں، اس طریقے سے اس طرح ہم نوا ہو جائے کہ اس کامل کا انفرادی وجود اس کی جماعت کے اجتماعی وجود میں فنا ہو کر بقا حاصل کرے۔ اور پھر فطرتاً اس کامل میں یہ صلاحیت بھی ہو کہ وہ اپنی طبیعت کے مقام پست سے روح کے مقام قدس کی بلندیوں کی طرف جذب ہو سکے.... الغرض

وہ کامل جس کے اوصاف یہ ہوں جب اللہ تعالےٰ کی رحمت اس کامل کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو وہ اُسے اپنے ساتھ منضم کرلیتی اور اس کو اپنے دامن میں ڈھانپ لیتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "وہ سرِ الٰہی" جو مقصود و مطلوب ہوتا ہے وہ اس کامل کے اندر نقش ہو جاتا ہے، اور وہاں پر اس "سرِ اجمالی" کا یہ نقش جس جماعت میں کہ یہ کامل ہوتا ہے، اس جماعت کے لئے احکام و قوانین کے قالب میں بدل جاتا ہے..... چنانچہ انبیاء کرام پر وحی کے ذریعہ جو شریعتیں نازل ہوتی ہیں اور اولیاء پر کشف و الہام کے ذریعہ جن طریق تصوف کا نزول ہوتا ہے، ان سب کی حقیقت دراصل یہ ہے" ۔ صفحہ ۲۶۴

جب سے یہ دُنیا بنی ہے، انبیاء برابر مبعوث ہوتے چلے آرہے ہیں اور اُن کو وقتاً فوقتاً مختلف شریعتیں عطا ہوتی رہی ہیں، لیکن ایک زمانے میں کسی رسول پر جو شریعت نازل ہوتی ہے، وہ جہاں تک کہ خاص اس زمانے کا تعلق ہوتا ہے قطعی اور آخری حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی اس زمانے میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ اُس شریعت کے اتباع کے بغیر خیر و فلاح حاصل ہو سکے، لیکن اگر اس شریعت کو تمام شریعتوں کو سامنے رکھ کر مجموعی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے گا تو پھر اس کی حیثیت بے شک اضافی ہوگی، اس مسئلے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"جس طرح ہر چیز کی ایک علّت مقدر ہوئی جو اس کو اس دنیا میں لانے کا سبب بنی، اسی طرح مبدائے اول کی طرف سے شریعتوں کا ظہور پذیر ہونا بھی واجب ٹھہرایا گیا، اور ان کے ظاہر ہونے کی صورت یہ مقرر ہوئی کہ اللہ تعالےٰ نے پہلے ہی سے جان لیا تھا کہ جس زمانے میں کوئی شریعت نازل ہوگی اس زمانے میں "خیر و فلاح" صرف اسی شریعت کی صورت میں محدود ہوگی" صفحہ ۲۱۳

لیکن یہ کیوں ؟ اس بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

ایک زمانے میں اللہ تعالےٰ کی رضا و خوشنودی اس کی اس تدبیر خصوصی میں جو اس بندے کے ذریعہ دنیا میں برسرکار آتی ہے۔ محدود ہو جاتی ہے، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قہر و غضب بھی اس کی اس تدبیر کی مخالفت کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے۔ الغرض جب کسی ملت کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ امتیاز حاصل ہوتا ہے تو اس ملت کے سارے کے سارے احکام "حق" سے موسوم ہوتے ہیں اور ان احکام کو "حق" سے موسوم کرنے میں جو بات پیش نظر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں احکام کی صرف اسی "شبح" اور قالب ہی میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر مصروف کار ہوتی ہے۔ اور اس "شبح" اور قالب کے علاوہ اس زمانے میں تدبیر الٰہی کا اور کوئی مظہر موجود نہیں ہوتا" صفحہ ۲۳۵

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی کیا پہچان ہے کہ ایک خاص زمانے میں صرف شریعت کے اسی قالب ہی میں تدبیر الٰہی مصروف کار ہے اور یہی شریعت حقہ اور اس زمانے کی آخری و قطعی شریعت ہے۔ اس ضمن میں شاہ صاحب کا ارشاد ہے

- "اس سلسلے میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ صالح نفوس جو شیطانی آلائشوں سے ملوث نہیں ہوتے، ان نفوس میں اس شریعت کے متعلق جب کہ وہ صاحبِ شریعت سے معجزات صادر ہوتے دیکھیں، پختہ اعتقاد پیدا ہو، اور اسی طرح عقل صحیح بھی اس شریعت کے پہنچانے والے کے سچے ہونے پر دلالت کرے۔ اور اس کی تصدیق کرے کہ صاحبِ شریعت نے واقعی بارگاہِ غیب سے اس شریعت کو لیا ہے اور نیز مبدائے اوّل سے اس ضمن میں یہ بھی ضروری قرار پایا کہ زیادہ سے زیادہ نفوس فطرتاً پختہ اعتقاد والے اس شریعت سے اثر پذیر ہوں۔ اور اس کی وجہ سے ان نفوس میں عزم و ارادہ کی ایک لہر دوڑ

جائے"، صفحہ ۳۴۴۔ مطلب یہ نکلا کہ کسی زمانے میں ایک خاص شریعت کے "حق" ہونے کی کسوٹی یہ ہے کہ وہ صالح نفوس کو اپنی طرف کھینچے، عقل صحیح اس کی تصدیق کرے۔ اور اس کی وجہ سے اعمال نیک کا ظہور عمل میں آئے۔

ایک شریعت جس زمانے میں اور جن لوگوں میں اعتقاد پذیر ہوتی ہے، اُس کی صورت جیسا کہ ابھی بیان ہوا، یہ ہوا کرتی ہے کہ اس وقت قوم میں جو اچھے اخلاق و آداب اور قواعد و ضوابط ہوتے ہیں، ان کو تو وہ باقی رکھتی ہے اور جو بُرے ہوں ان کو رد کر دیتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ قوموں میں یہ آداب و اخلاق کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ شاہ صاحب اس پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"انسانوں کو فطرت کی طرف سے یہ الہام ہوا کہ وہ آپس کے تعلقات کو استوار رکھنے کے لئے دستور اور قواعد بنائیں۔ اس الہام کی بنا پر انہوں نے شہری زندگی کے قاعدے بنائے، خانہ داری کے طریقے وضع کئے، معاشی اور کاروباری دستور مرتب کئے۔ چنانچہ اجتماعی زندگی کے لئے قواعد اور دستور بنانے کی یہ عادت ان کی فطرت کا اصل الاصول بن گئی، اس کا شمار ان کے ہاں ضروری علوم میں سے ہونے لگا۔ جب یہ چیز لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو گئی تو اس کے بعد ایسا ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے نبی کے قلب کو یہ قابلیت بخشی کہ اس میں اللہ تعالےٰ کا تعلیم کردہ دستور جگہ پکڑ سکے۔ اس دستور میں اللہ کی روح ہوتی ہے۔ اور اس میں برکت اور نور ہے۔ یہ ہے اللہ کی شریعت اور اسی کا نام ملت ہے" صفحہ ۳

بے شک شریعت کی تشکیل تو اللہ تعالےٰ نے کی وحی کے ذریعہ نبی کرتا ہے، لیکن اس شریعت کے لئے مواد اُسے اُس قوم سے اور اُس ماحول و عہد ہی سے

جسمیں وہ مبعوث ہوتا ہو تا ہے اور اسی وجہ سے شریعتیں مختلف زبانوں میں مختلف شکلوں میں آتی رہیں لیکن اس اختلاف کے باوجود ان میں ایک اساسی وحدت بھی موجود رہی۔

وحی

وحی کی حقیقت کیا ہے؟ بشر کس طرح اس عالم مادی میں رہتے ہوئے اُس "مقام قدس" میں پہنچ جاتا ہے، جہاں کہ اللہ اس سے کلام کرتا ہے۔ اس نازک مسئلے پر بھی شاہ صاحب نے بحث کی، چنانچہ فرماتے ہیں۔

"عارف جب اُس مقام پر ہوتا ہے جو اُس کی طبیعت کے قریب ہے تو اس حالت میں وہ فعل حق کا اس طرح مشاہدہ نہیں کر سکتا جیسے کہ اُسے کرنا چاہئیے۔ چنانچہ ایسے موقع پر اکثر عارف کو الہامات اور دل کے وسوسوں میں اور الٰہی کیفیت اور طبیعت کے اقتضا میں اشتباہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور نیز اس ضمن میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک معاملہ ہو اور اس کے متعلق عارف نہیں جانتا کہ اس کے بارے میں اللہ کا کیا حکم ہے چنانچہ وہ اس میں متردد ہوتا ہے! ور کچھ دیر تک وہ اس تردد کی حالت میں رہتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ مقام حق کی طرف پہنچ جاتا ہے، اور وہ اللہ کا ہو جاتا ہے اس حالت میں اس کے سامنے ہر ایک چیز متجلی ہو جاتی ہے، اور وہ امور جن کے متعلق پہلے اُسے شبہ تھا، وہ ان پر اور نیز اپنے شکوک پر دوسری بار نظر ڈالتا ہے تو ان کے متعلق اللہ کا جو ارادہ اور فیصلہ ہوتا ہے وہ منکشف ہو جاتا ہے! ور اس حالت میں وہ گویا اللہ کے ارادے اور فیصلے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ اب اگر وہ عارف "متکلم" ہوتا ہے تو اس حالت میں اس سے کلام کی جاتی ہے اور اگر وہ "مفہم" اور "ملقن" ہو تو اس کو افہام و تفہیم اور تلقین کے ذریعہ اللہ تعالےٰ کے ارادے اور فیصلے کی اطلاع ہوتی ہے صفحہ ۲۱۳

شاہ صاحب نے اپنے اس بیان کی وضاحت کے لئے سورۂ "انفال" کے نزول کے واقعہ کو پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ "اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے تمہارے لئے" سورۂ انفال" میں ایک بصیرت ہے" صفحہ ۲۱۴

ایک اور مقام پر شاہ صاحب نے وحی کی مزید تشریح فرمائی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں، لوگوں میں کتابوں کو لکھنے اور رسالوں کو جمع کرنے کا رواج خوب پھیل گیا تھا تو ان حالات میں جب اللہ کی تدلی حرکت میں آئی تو لامحالہ اس وقت لوگوں کے ہاں جو دستور بن چکا تھا، اسی کے مطابق اس تدلی نے بھی صورت اختیار کی۔ چنانچہ ہوا یہ کہ اللہ تعالےٰ کا ارادہ اس امر کا مقتضی ہوا کہ رسول ایسی تجلیات سے بہرہ یاب ہو جو اسے عالم بشریت سے اچک کر حظیرہ القدس میں پہنچا دیں، اور اس طرح ملاء اعلےٰ کے علوم، ملاء اعلےٰ کی طرف سے، انسانوں کو ان کے ناپاک شبہات کے جوابات، رحمت الٰہی کے ارادے اور وہ الہامات خیر جو لوگوں کے دلوں میں ہیں یہ سب رسول کے ادراک میں تلاوت کی جانے والی وحی کی شکل میں قرار پذیر ہو جائیں۔ الغرض یہ ہے شان نزول الہامی کتابوں کے وجود میں آنے کی" صفحہ ۸۶

وحی جو رسول کے ادراک میں تلاوت کی جانے والی آیات کی شکل میں قرار پذیر ہوتی ہے محض معانی کا نام ہے یا معانی کے ساتھ الفاظ بھی شامل ہوتے ہیں اس کے متعلق شاہ صاحب کی رائے یہ ہے۔

"یہ وحی یعنی" وحی متلو" ان الفاظ، کلمات اور اسالیب میں جو خود صاحب وحی کے ذہن میں پہلے سے محفوظ ہوتے ہیں، صورت پذیر ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عربوں کے لئے اللہ تعالےٰ نے عربی زبان میں وحی کی اور سریانی بولنے والوں کے لئے سریانی میں" صفحہ ۸۹

اس ثبوت میں شاہ صاحب نے بروا ئے صالحہ کی مثال دی ہے چنانچہ

فرماتے ہیں۔

"خواب دیکھنے والے کے ذہن میں جو صورتیں اور خیالات پہلے سے محفوظ ہوتے ہیں، وہ انہیں کے لباس میں خوابوں کو دیکھتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر جب مادرزاد اندھا خواب دیکھتا ہے تو اس کو خواب میں رنگ اور شکلیں دکھائی نہیں دیتیں ...... اور جو پیدائشی بہرہ ہے، وہ خواب میں کبھی آواز نہیں سنتا" صفحہ ۸۹

اس مثال کے بعد شاہ صاحب اس معاملہ کی مزید صراحت فرماتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"اگر اس معاملہ کی مزید تحقیق چاہتے ہو تو سنو! عالم غیب سے جب کوئی فیضان ہوتا ہے خواہ یہ فیضان روزمرہ کا سا عام فیضان ہو یا یہ فیضان اعجاز اور خارق عادت کی نوعیت کا ہو، بہرحال یہ فیضان محلِ فیضان کی جو ضروری خصوصیات ہوتی ہیں، انھیں کے لباس میں صورت پذیر ہوتا ہے۔ اور محلِ فیضان کی یہی خصوصیات ایک فیضان کو دوسرے فیضان سے جدا کرتی ہیں۔ ...... خلاصہ مطلب یہ ہے کہ ہر فیضانِ غیبی کی جو بھی اپنی مخصوص صورت اور وضع ہوتی ہے، اگر اس مخصوص صورت اور وضع کا سبب ڈھونڈنا چاہو تو وہ تمہیں اس محل کی خصوصیات میں ملے گا جہاں کہ یہ فیضان واقع ہو" صفحہ ۹۰

شعائر دین

دین کا اصل اساس تو بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں پر ایمان لانا ہے، لیکن جب تک ایمان کے ساتھ ساتھ شعائر نہ ہوں، دین کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ دین اسلام کے اہم شعائر، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں۔ نماز کی کیا حقیقت ہے؟ اس کی وضاحت شاہ صاحب نے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

نماز

"انسان کے اندر اخلاق و اطوار کی جو نفسی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، اُن میں سے ہر نفسی کیفیت کا خارج میں کوئی نہ کوئی عملی مظہر ہونا ضروری ہے، اور یہی عملی مظہر اس عالمِ محسوس میں اس نفسی کیفیت کا مادی قائم مقام بن جاتا ہے۔ چنانچہ انسان کے یہ عملی مظاہر ہی ذریعہ بن جاتے ہیں نفس میں اخلاق کی باطنی کیفیات کی تربیت کا، چنانچہ اگر تعریف ہوتی ہے تو ان عملی مظاہر کی اور مذمت کی جاتی ہے تو ان کی اور ذکر ہوتا ہے ان عملی مظاہر کا، اگرچہ اصل مقصود یہ عملی مظاہر نہیں ہوتے بلکہ نفس کی وہ کیفیات باطنی ہوتی ہیں جن کا یہ اعمال خارج میں مظہر بنتے ہیں، الغرض نفس کے ان باطنی اخلاق کی بجائے خارج میں جو اُن کے قائم مقام ظاہری اعمال ہوتے ہیں، ان کا ذکر کرنا انسانوں کی طبیعت میں داخل ہو گیا ہے" صفحہ ۸۴

اب سوال یہ ہے کہ نماز کے ارکان مثلاً دعائیں قیام، رکوع، تشہد اور سجود نفس کی کس باطنی کیفیت کے عملی مظہر ہیں۔ ظاہر ہے جیسا کہ ابھی بیان ہوا نماز کے یہ عملی مظاہر مقصود بالذات نہیں، بلکہ ان کا اصلی مقصد نفس میں کسی خاص کیفیت کو پیدا کرنا اور اس کو تربیت دینا ہے۔ شاہ صاحب ان اعمالِ نماز کو نفس کی صفتِ "احسان" کا مظہر بتاتے ہیں، اس صفت کی کیا خصوصیات ہیں، اس ضمن میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

"اس خُلق" اس باطنی کیفیت اور اس روحانی رنگ سے میری مراد "احسان" کی صفت یعنی خدا تعالےٰ کی جناب میں خشوع و خضوع اور طبیعت کا نفس کے تاریک اور فاسد اثرات سے پاک ہونا ہے۔ اس "خلقِ احسان" کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان میں اس وقت بھی موجود رہتا ہے جب کہ اس کا نفس حیوانیت ہی امتزاج

رکھتا ہو۔ . . . اللہ تعالےٰ نے انسان کے تمام اخلاق میں سے اُس کے اِس "خُلق احسان" کو منتخب فرمایا، اس کے بعد وہ اقوال اور افعال انتخاب کئے جو اس خُلق کی ترجمانی کر سکتے اور اس کے قائم مقام ہو سکتے ہیں . . . اس طرح گویا نماز کے یہ اقوال اور افعال بعینہٖ "خلق احسان" بن گئے" صفحہ ۸۵

خانہ کعبہ

خانہ کعبہ کا حج بھی اسلام کا ایک اہم شعار ہے، اس کی ضرورت کیوں پیش آئی اور ایک گھر کو خدا کے ساتھ کس لئے مخصوص کرنا پڑا، شاہ صاحب نے اس کی بھی وضاحت فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"حضرت ابراہیم سے پہلے لوگ عبادت گاہیں اور کنیسے بناتے تھے، انہوں نے اس زمانہ میں جب کہ آفتاب کی روحانیت کا غلبہ تھا آفتاب کے نام پر عبادت گاہیں بنائیں، اور اسی طرح اور اسی خیال کے ماتحت ماہتاب اور دوسرے ستاروں کے نام سے معابد بنائے . . . . اور وہ اس بات کو ایک امر محال سمجھنے لگے کہ کسی مجرد شے کی طرف جب تک کہ اس کے لئے کوئی خاص جہت اور موقع و محل معین نہ کر دیا جائے، توجہ کی جا سکتی ہے، اس زمانے میں حضرت ابراہیم مبعوث ہوتے ہیں اور ان کے زمانے کا جو دستور تھا، اس کے مطابق ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معبد بنانے کا القاء ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک مخصوص جگہ جو انہوں نے اس معبد کے لئے مناسب سمجھی، اس کا انتخاب کیا ..... اور اس سلسلہ میں قاعدے اور دستور مقرر ہوئے . . . . ."

ان شعائر دینی کو بجا لانے کی بھی مختلف شکلیں ہیں۔ اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں "ایک گروہ شعائر اللہ کے حقوق ادا کرنے میں صرف اپنی نیت کا

پھل پاتا ہے اور وہ اس طرح کہ یہ گروہ سمجھتا ہے کہ یہ شعائرُ اللہ تعالےٰ کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ اور وہ اس کا حکم سمجھ کر ان شعائر کو بجا لاتا ہے۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جن کی روح کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ اپنے روحانی حاسہ سے شعائرُ اللہ کا نور محسوس کرتے ہیں، اور اس کی وجہ سے ان کی بہیمی قوتوں پر ملکی قوتیں غالب آجاتی ہیں، اور تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے، جو شعائرُ اللہ کے نور میں بالکل ڈوب کر اللہ تعالےٰ کی اس تدلی کو جو ان شعائر کی اصل ہے، پا لیتے ہیں۔ . . صفحہ ۸۳ یعنی ان شعائر کو بجا لانے سے بعض لوگ تو قرب الٰہی کی نعمت سے سرفراز ہوتے ہیں، اور بعض ان کے ذریعہ اپنی بہیمی قوتوں پر قابو پاتے ہیں۔ اور ان کے اندر جو ملکی قوتیں ہوتی ہیں، وہ انھیں محسوس ہونے لگتی ہیں، اور بعض جو محض اللہ کا حکم سمجھ کر ان پر عمل کرتے ہیں، اس سے اُن کے اندر ایک نظم اور ضبط پیدا ہوتا ہے۔

آخرت کی زندگی

قرآن مجید میں آیا ہے کہ قیامت کے بعد جو لوگ دوزخ میں جائیں گے، اُن کے چہرے سیاہ ہوں گے اور ان کو تارکول کے کپڑے پہننے کو ملیں گے اور بہشت والے ریشم و حریر میں ملبوس ہوں گے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جو دوزخ میں گئے، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا میں کفر کیا، اور اس کفر کا رنگ ان کے چہروں پر چڑھ گیا۔ اور اس کی وجہ سے وہ اللہ تعالےٰ کی لعنت کے مستوجب ہوئے۔ چنانچہ ان کا دنیا میں کفر کرنا دوزخ میں تارکول کے کپڑوں اور چہروں کی سیاہی میں بدل جائے گا۔ اسی طرح جو جنت میں جائیں گے یہ وہ لوگ ہیں، جو دنیا میں ایمان لائے، اور ان کے ایمان کا

رنگ ان کے نفوس پر چڑھ گیا۔ چنانچہ مرنے کے بعد ان کے ایمان کا یہی رنگ جنت میں ریشم کے کپڑوں اور چہروں کی بشاشت میں بدل جائے گا، اور یہ اس لئے کہ شاہ صاحب کے نزدیک اس دنیا کی کیفیات جن کو ہماری جسمانی آنکھیں دیکھنے سے قاصر ہیں، دوسری دنیا میں مادی شکلوں میں بدل جائیں گی... صفحہ ۲۸۸

اسی آخرت کی زندگی کے بارے میں ایک اور جگہ شاہ صاحب لکھتے ہیں :-

"جب قیامت کا دن آئے گا اور بدن کے یہ حجابات چھٹ جائیں گے تو اس دن روح کی آنکھ بذات خود مستقل حیثیت اختیار کرے گی۔ اور جسم کی آنکھ وہاں روح کی آنکھ کے تابع ہو گی۔ بات یہ ہے کہ آخرت میں زندگی کی جو بھی شکل ہوگی، وہ اس دنیا ہی کی زندگی کا حاصل نتیجہ ہوگی" صفحہ ۱۵۵

ادیان و ملل کا اختلاف

شاہ صاحب کے نزدیک ادیان و ملل کا اختلاف فطری ہے، اور وہ اس لئے کہ دین وملت کا خارجی حالات و اسباب کے مطابق ہونا ضروری ہوتا ہے اور چونکہ زمانے کے ساتھ ساتھ خارجی حالات و اسباب بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے ادیان و ملل بھی کبھی ایک حالت پر نہیں رہ سکتے، لیکن اس اختلاف کے باوجود ان میں اساسی ہم آہنگی اور وحدت پائی جاتی ہے، شاہ صاحب اس وحدت کے قائل ہیں، اور اس کی طرف وہ مکاشفے کی زبان میں بار بار اشارے کرتے ہیں مثلاً چوتھے مشاہدہ میں فرماتے ہیں، اللہ تعالے نے مجھے اپنی عظیم الشان اور جلیل القدر تدلی کی حقیقت سے مطلع فرمایا، جو تمام بنی نوع بشر کی طرف متوجہ ہے۔ اس تدلی سے اللہ تعالیٰ کو منظور یہ ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنے تک پہنچنے کی راہ کو لوگوں کے لئے آسان بنائے، اس تدلی کا عالم مثال میں ایک مثالی پیکر ہے

اور وہاں سے یہ عالم اجساد میں کبھی انبیاء کی صورت میں بالعموم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں بالخصوص اور کبھی نماز کی صورت میں اور کبھی حج کی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے، میں نے اس تدلی کو جو اپنی ذات میں ایک ہی دیکھا اور یہ پایا کہ جیسے جیسے خارجی حالات و اسباب ہوتے ہیں، اسی مناسبت سے وہ طرح طرح کے مظاہر میں صورت پذیر ہوتی ہے"

اس معاملے میں شاہ صاحب کو فکر کی جو وسعت اور ذہن کی جو لا محدودیت حاصل تھی، اس کی ایک مکاشفے میں انہوں نے بڑی اچھی تصویر کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں

"...... اس کے بعد میرے لئے اللہ تعالے کی تدلی اعظم ظاہر ہوئی [تدلی اعظم سے یہاں مراد ہدایت کا وہ ابدی سلسلہ ہے جو آفرینش سے اب تک برابر چلا آرہا ہے۔ مترجم] تو میں نے اسے بے کنار اور غیر متناہی پایا، اور اس وقت میں نے اپنے نفس کو بھی غیر متناہی پایا، اور میں نے دیکھا کہ میں ایک غیر متناہی ہوں جو دوسرے غیر متناہی کے مقابل ہے اور میں اس غیر متناہی کو نگل گیا ہوں" صفحہ ۱۵۶

مذاہبِ فقہ کا اختلاف

شاہ صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے القا ہوا تھا کہ وہ فروعات میں اپنی قوم کی مخالفت نہ کریں، چونکہ ہندوستانی مسلمان عرصہ دراز سے حنفی مسلک پر تھے اس لئے شاہ صاحب نے بھی اپنے اوپر حنفی مذہب کی پابندی واجب کرلی لیکن ادیان وملل کی طرح وہ مختلف مذاہب فقہ میں بھی اساسی وحدت کے قائل تھے چنانچہ وہ اپنے ایک مکاشفہ کا ذکر فرماتے ہیں۔ جس میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی بارگاہ سے استفادہ کیا۔ اِس ضمن میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

"میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ آپؐ مذاہب فقہ میں سے کس خاص مذہب کی طرف رجحان رکھتے ہیں تاکہ میں فقہ کے اس مذہب کی اطاعت کروں میں نے دیکھا کہ آپؐ کے نزدیک فقہ کے یہ سارے کے سارے مذاہب یکساں ہیں . . . . . . واقعہ یہ ہے کہ آپ کی روح کے جوہر میں ان تمام فقہی فروعات کا جو بنیادی علم ہے، وہ موجود ہے اور اس بنیادی علم سے مراد یہ ہے کہ نفوس انسانی سے متعلق اللہ تعالیٰ کی اس عنایت اور اہتمام کو جان لیا جائے، جس کے پیش نظر انسانوں کے اخلاق و اعمال کی اصلاح ہے۔ الغرض فقہ کے تمام قوانین کی اصل بنیاد تو یہ عنایت الہی ہے۔ اس کے بعد جیسے جیسے زمانہ بدلتا ہے اسی کے مطابق اس اصل سے نئی نئی شاخیں اور الگ الگ صورتیں بنتی چلی جاتی ہیں، چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کی اصل جوہر میں فقہ کا یہ بنیادی علم موجود ہے، اس لئے ضروری ہے کہ آپؐ کے نزدیک فقہ کے سارے مذاہب برابر ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ فقہ کے مذاہب گو ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن جہاں تک فقہ کے ضمن میں دین اسلام کے ضروری اصول و مبادی کا تعلق ہے، مذاہب فقہ میں سے ہر مذہب میں وہ موجود ہیں، مزید براں اگر کوئی شخص فقہ کے ان مذاہب میں سے کسی مذہب کا کلی تابع نہ ہو تو اس کی وجہ سے یہ نہیں ہوتا کہ آپؐ اس شخص سے ناراض ہوں۔ ہاں اس سلسلہ میں اگر کوئی ایسی بات ہو جس سے ملت میں اختلاف ہو تو ظاہر ہے اس سے بڑھ کر آپؐ کی ناراضگی کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے . . . . . مذاہب فقہ کی طرح تصوف کے تمام طریقوں کو بھی میں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک یکساں پایا" صفحہ ۱۲۴

حنفی فقہ

حنفی فقہ پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کی بعض مسائل مشہور احادیث

کے خلاف ہیں۔ چنانچہ علمائے حدیث اور حنفی فقہا میں صدیوں سے یہی نزاع چلا آتا ہے۔ شاہ صاحب گو اپنے اہل وطن کے خیال سے حنفی مسلک رکھتے تھے، لیکن وہ حدیث کی اہمیت کو بھی مانتے تھے، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ حنفی مذہب اور احادیث میں اختلاف نہ رہے۔ اس سلسلہ میں آپ کو ایک مکاشفہ ہوا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنفی مذہب کے ایک بڑے اچھے طریقے سے آپ کو آگاہ فرمایا۔" اور حنفی مذہب کا یہ طریقہ ان مشہور احادیث سے جو امام بخاری اور ان کے اصحاب کے زمانے میں جمع کی گئیں، اور ان کی اس زمانہ میں جانچ پڑتال بھی ہوئی، موافق ترین ہے۔ اور وہ طریقہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کے اقوال میں سے وہ قول لیا جائے جو مسئلہ زیر بحث میں مشہور احادیث سے سب سے زیادہ قریب ہو۔ اور پھر ان فقہائے احناف کے فتاویٰ کی پیروی کی جائے جو علمائے حدیث میں شمار ہوتے ہیں۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے دونو ساتھی جہاں تک کہ ان چیزوں کے اصول کا تعلق تھا، وہ اس معاملے میں خاموش رہے۔ اور انہوں نے ان کے بارے میں ممانعت کا کوئی حکم نہیں دیا۔ لیکن ہمیں ایسی احادیث ملتی ہیں جن میں ان چیزوں کا ذکر ہے۔ اس حالت میں ان چیزوں کا اثبات لازمی اور ضروری ہے۔ اعمال اور احکام میں اس روش کو اختیار کرنا بھی مذہب حنفی میں داخل ہے۔" صفحہ ۱۵۱

سنت اور فقہ حنفی میں کس طرح تطبیق دی جائے۔ شاہ صاحب نے اس کا ذکر اکتیسویں مشاہدے میں بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں کہ" اس معاملہ میں نہ تو دور از قیاس تاویل سے کام لیا جائے اور نہ یہ ہو کہ ایک حدیث کو دوسری حدیث سے ٹکرایا جائے، اور نہ امت کے کسی فرد کے قول کے خیال سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کو ترک کیا جائے۔

سنت اور فقہ حنفی میں باہم مطابقت دینے کا یہ طریقہ ایسا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس طریقے کو مکمل کر دے تو یہ دین کے حق میں کبریت احمر اور اکسیر اعظم ثابت ہو"۔

شاہ صاحب کے نزدیک کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں کسی مذہب فقہی کو ماننے والے ہی ملت کی حفاظت کرنے والے ہوں یا مثلاً ایک ملک میں ایک فقہی مذہب کے تمام پیرو ہیں، اور ان کا یہی فقہی شعار خاص و عام میں حق و باطل کے لئے وجہ امتیاز بن گیا ہے، اس طرح تدبیر الٰہی اسی فقہی مذہب میں محدود ہو جاتی ہے اور یہی مذہب فقہی مذہب حق بن جاتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"میں نے دیکھا کہ کسی فقہی مذہب کے حق ہونے کا جو دقیق پہلو ہے، اس کے لحاظ سے آج اس زمانے میں حنفی مذہب کو باقی سب مذاہب فقہ پر ترجیح حاصل ہے" صفحہ ۳۳۵۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے اوپر حنفی فقہ کی پابندی لازم کرلی تھی۔

علماء اور صوفیاء کا اختلاف

علماء شریعت پر زور دیتے ہیں اور صوفیاء طریقت پر۔ ایک کے پیش نظر زیادہ تر ظاہری اعمال دین رہتے ہیں، اور صوفیا کا گروہ باطن پر سارا زور دیتا ہے، علم اور عرفان کی یہ کشمکش بہت پرانی ہے، شاہ صاحب چونکہ عالم بھی تھے اور صوفی بھی، اس لئے قدرتی بات تھی کہ وہ شریعت اور طریقت میں مصالحت کرنے کی کوشش کرتے چنانچہ اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں

"قرب الٰہی کے دو طریقے ہیں، ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم میں آئے تو قرب الٰہی کا یہ طریقہ بھی بندوں کی طرف منتقل ہو گیا۔

قربِ الٰہی کے اس طریقے میں واسطوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اس کے پیشِ نظر طاعات و عبادات کے ذریعہ اعضاء و جوارح کی اور ذکر و تزکیہ اور اللہ اور اس کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کے ذریعہ قوائے نفس کی تہذیب و اصلاح ہوتی ہے چنانچہ عام لوگوں کی تہذیب و اصلاح کے لئے علوم کی نشر و اشاعت، نیک کاموں کا حکم دینا، برائیوں سے روکنا۔۔۔۔۔ یہ سب کے سب قربِ الٰہی کے اس طریقے میں داخل ہیں"۔

"قربِ الٰہی کا دوسرا طریقہ اللہ اور بندے کے براہِ راست اتصال کا ہے۔۔ ۔۔۔۔ جو شخص اس طریقہ پر چلتا ہے، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے "انا" کو بیدار کرتا ہے۔ اور اپنے "انا" ہی کی بیداری کے ضمن میں اس کو ذاتِ حق کا تنبہ اور شعور حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اسی سلسلہ کے یہ "فنا و بقا" اور "جذب اور توحید" وغیرہ مقامات ہیں" صفحہ ۱۸۰

شاہ صاحب کی رائے میں قربِ الٰہی کا دوسرا طریقہ نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عالی منزلت تھا، اور نہ آپؐ کو یہ مرغوب ہی تھا۔ اور آپؐ کی ذاتِ اقدس تو قربِ الٰہی کے پہلے طریقے کا عنوان تھی۔ اور آپؐ ہی کے ذریعہ یہ طریقہ عام طور پر پھیلا۔

تصوف

تصوف کیا ہے؟ تصوف کی تعریف میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن شاہ صاحب نے مختصراً اس کی تعریف یہ کی ہے۔ قربِ الٰہی کا وہ طریقہ جس کے ذریعہ اللہ اور بندے کے درمیان براہِ راست اتصال پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اذکار و اشغال سے انسان کے اندر جو "انا" ہے اس کی حقیقت کو بیدار کیا جاتا

ہے اور "انا" کی حقیقت کی اس بیداری ہی کے ضمن میں انسان کو ذاتِ حق کا تنبہ اور شعور حاصل ہوتا ہے صفحہ ۱۸۰

تصوف کا حاصل "فنا و بقا" "جذب" اور "توحید" وغیرہ مقامات ہیں۔ شاہ صاحب نے ان کمالات کے مقابلے میں جو شخصی اور انفرادی ہیں، اجتماعی خوبیوں کو جن کو وہ امورِ نبوت سے موسوم کرتے ہیں، بلند تر مانا ہے صفحہ ۱۸۴

ہر انسان میں یہ استعداد رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے "انا" کو بیدار کر کے خدا تعالیٰ سے اتصال پیدا کرلے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ انسان کی اس استعداد پر پردے پڑ جاتے ہیں اور ان کو ہٹانے کی ضرورت ہوتی ہے، بات یہ ہے کہ انسان کے نفس کی خاصیت کچھ ایسی ہے کہ اس پر ہر طبیعت کا اثر پڑتا ہے، چنانچہ نفسِ انسانی ان طبائع سے جسقدر متاثر ہوتا ہے، اسی قدر اس کی فطری جلا میں کمی آجاتی ہے۔ اور اس کے اندر "انا" کا جو نقطۂ تدلی موجود ہوتا ہے، وہ چھپ جاتا ہے۔ لیکن جب یہ پردے ہٹ جاتے ہیں تو آپ سے "حقیقت الحقائق" کی طرف تنبہ حاصل ہو جاتا ہے صفحہ ۱۴۲

راہِ طریقت کے جو کامل ہیں، ان کو بالفعل ذاتِ حق کا وصال ہوتا ہے اور یہ اس طرح کہ سالک جب اس حقیقت تک پہنچتا ہے، جس کو "انا" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور نیز جب وہ اس حقیقت "انا" کو اس کے نیچے جو مراتب ہیں، ان سے منزہ اور مجرد کر لیتا ہے، تو اس حالت میں سالک کا اصل وجود مطلق کی طرف التفات ہوتا ہے، اس وجود مطلق کے کئی تنزلات اور بہت سے لباس ہیں۔ سالک وجود مطلق کی طرف التفات کے ضمن میں ہر ہر تنزل اور لباس کو جان جاتا ہے۔ اس سے وہ اور آگے بڑھتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس حقیقت کا جس کے بعد کوئی اور حقیقت نہیں، خود اس حقیقت کے ذریعہ ادراک کرتا ہے اور یہ ہے عارف کا ذاتِ حق سے وصال۔

اس مقام میں اگر اس کو علم ہوتا ہے تو اسی حقیقت "انا" کا اور وہ ادراک کرتا ہے تو

اسی "انا" کی حقیقت کو صفحہ ۲۲۶

اولیاء اللہ سے جو کرامات ظاہر ہوتی ہیں، وہ نتیجہ ہوتی ہیں ان کی اس قوت کا جو نفس ناطقہ میں ہوتی ہے صفحہ ۲۸۹۔ اس سلسلہ میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک نفس میں یہ قوت موجود تھی، لیکن وہ اس کی دوسری قوتوں کے اس طرح تابع ہے کہ وہ ان میں فنا ہو گئی، اس حالت میں اس نفس کی یہ قوت بے اثر ہو جاتی ہے۔ اب جب دوسرا کوئی نفس اس نفس پر اپنا اثر ڈالتا ہے تو اس میں وہ قوت اُبھر آتی ہے اور ایسے موقع پر کہا جاتا ہے کہ فلاں نفس نے اس نفس پر اپنی تاثیر ڈالی۔ اور اس میں یہ کیفیت پیدا کی، حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ متاثر ہونیوالا نفس موثر کرنے والے نفس سے جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے، وہ اس کے اندر کہیں باہر سے نہیں آتا، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ متاثر ہونے والا نفس اپنی عنانِ توجہ کو خود اپنی باطنی استعداد یا اس قوت کی طرف جو پہلے سے اس میں موجود ہوتی ہے، اس طرح پھیر دیتا ہے کہ اس استعداد یا قوت کے مقابلے میں اس نفس کے اندر جو دوسری قوتیں اس قوت کو دبائے ہوئے ہوتی ہیں، موثر کرنے والے نفس کی تاثیر سے بے اثر ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح اس کی وہ استعداد یا قوت اُبھر آتی ہے صفحہ ۶۸

جماعتِ اولیاء میں سے ایک بڑی تعداد ایسے اولیاء کی بھی ہوتی ہے۔ جن کو الہام کے ذریعہ یہ القاء کیا جاتا ہے، کہ اللہ تعالےٰ نے آپ لوگوں سے شرعی قیود اٹھا دی ہیں، اور انھیں اختیار ہے کہ چاہیں تو عبادت کریں، اور چاہیں تو نہ کریں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرے والد اور میرے چچا کو اور خود مجھے بھی اس طرح کا الہام ہوا، اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بیشک یہ الہام برحق تھا۔ لیکن میرے نزدیک یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی عاقل و بالغ سے شرع کی قیود نہیں اٹھ سکتیں۔ اس تضاد کو شاہ صاحب اس طرح رفع کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں، اس حالت

ہیں دراصل شرعی قیود کو کہیں باہر سے اپنے اوپر عائد کیا ہوا نہیں جانا جاتا بلکہ کامل ان کو اس طرح محسوس کرتا ہے، جیسے کوئی شخص بھوک اور پیاس کو محسوس کرے، اور اس صورت میں ان طاعات وعبادات کو ترک کرنے کی اس میں استطاعت نہیں رہتی، چنانچہ اس شخص کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ طاعات وعبادات اس پر شریعت کی طرف سے عائد کی گئی ہیں یا نہیں۔ صفحہ ۱۰۵ اسی حقیقت کی توضیح ایک اور مقام پر وہ اس طرح کرتے ہیں "فرد" کے حق میں جو ان کمالات کا حامل ہوتا ہے، جن کا ذکر اوپر ہو چکا، اپنے رب کی عبادت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ وہ اپنی طبیعت کے کسی فطری تقاضے کو بجا لا رہا ہو۔ صفحہ ۳۱۶، اقبال نے "ساقی نامہ" میں شاید اسی حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ چنانچہ انسان کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر　　طلسم زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود　　کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا　　تری شوخیِ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصد گردشِ روزگار　　کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اور اس کا نتیجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ تم اوپر سے عائد کئے ہوئے نیکی وبدی کے معیاروں کے پابند نہیں رہو گے۔ بلکہ "تم خود" فاتحِ عالم خوب و زشت ہو گے

تو ہے فاتحِ عالم خوب و زشت　　تجھے کیا بتاؤں، تیری سرنوشت

یہ ہے کمال انسانی خودی کے ارتقاء کا۔ اور اسی کمال کے حامل کو شاہ صاحب "فرد" کہتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کی تفضیل کا مسئلہ

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ سوال پیش کیا "حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ حضرت علیؓ سے کس اعتبار سے افضل ہیں۔ باوجود اس کے کہ حضرت علیؓ اس اُمت کے پہلے صوفی، پہلے مجذوب اور پہلے عارف ہیں؟"

آپ کو بتایا گیا کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے نزدیک فضیلت کلی کا مدار امور نبوت پر ہے جیسے کہ علم کی اشاعت، لوگوں کو دین کا مطیع و فرمانبردار بنانا اور اس طرح کے اور امور جو نبوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور وہ فضیلت جس کا مرجع ولایت یعنی "جذب اور فنا" ہے، یہ تو ایک جزئی فضیلت ہے، اور ایک اعتبار سے کم درجے کی۔۔۔۔ وہ عنایت الٰہی جس کا مرکز و موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تھی، وہ بعینہٖ ان دونوں بزرگوں کے وجود گرامی میں صورت پذیر ہوئی۔۔۔ اور گو حضرت علیؓ نسب کے اعتبار سے اور نیز اپنی جبلت اور محبوب فطرت کے لحاظ سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے زیادہ آپؐ سے قریب تھے، اور "جذب" میں بھی قوی تر اور "معرفت" میں بھی بالاتر تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ منصب نبوت کے کمال کے پیش نظر حضرت علیؓ سے زیادہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرف مائل تھے۔۔۔ صفحہ ۱۸۳

سیاست و تنظیم ملت

ایک مکاشفہ میں (صفحہ ۲۹۷) شاہ صاحب کو بتایا گیا کہ ہندوستان میں کفار کا غلبہ ہو رہا ہے، اور انہوں نے مسلمانوں کے مال و متاع لوٹ لئے

اوران کی اولاد کو اپنا غلام بنا لیا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ میں قائم الزمان ہوں" یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نظامِ خیر کو قائم کرنے کا مجھے اپنا ذریعہ کار بنایا ہے۔ چنانچہ میں نے اسلام کے شعائر کو تباہ اور کفر کے رسوم کو سر بلند پایا تو میں غصے سے بھر گیا۔ ساتھیوں نے مجھ سے پوچھا کہ اسوقت اللہ کا کیا حکم ہے؟ میں نے اُن سے کہا کہ ہر نظام کو توڑنا۔

ایک اور مکاشفہ میں (صفحہ ۲۱۹) شاہ صاحب کو بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اُن کے ذریعہ امت مرحومہ کے منتشر اجزا کو جمع کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے انھیں چاہیے کہ وہ فروعات میں اپنی قوم کی مخالفت نہ کریں۔ اور ملت کی تنظیم کے لئے انبیاء کا طریقہ اختیار کریں۔ اور ان کے بار ہائے گراں کو اٹھائیں اور ان کی خلافت کے لئے کوشاں ہوں۔

یہ انبیاء کی خلافت کیا ہے؟ ایک تو خلافت ظاہری ہوتی ہے جسے سیاسی اقتدار یا سلطنت کہہ لیجئے اور دوسری خلافت باطنی ہے جس سے مقصود تعلیم و تربیت کے ذریعہ قوم کی تنظیم ہے۔ شاہ صاحب کو ایک مکاشفہ میں (صفحہ ۲۲۷) دکھایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہر دو قسم کی خلافتوں کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ چنانچہ آپؐ کی مکی زندگی خلافت باطنی کا نمونہ ہے اور مدنی زندگی خلافتِ ظاہری کا۔ پہلے آپؐ نے مسلمانوں کو وعظ و ارشاد اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ تیار کیا، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ آگے چل کر مسلمان مدینہ میں سیاسی اقتدار کے مالک ہو گئے۔ شاہ صاحب کو بھی اسی طریقے پر کام کرنے کو کہا گیا۔ چنانچہ انبیاء کی خلافت کے لئے ان کے کوشاں ہونے کا یہی مطلب ہے۔

شاہ صاحب کے سپرد دین اسلام کی تجدید اور ملت اسلامیہ کی تنظیم کی گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے مکاشفہ میں دیکھا کہ وہ اس امت کے قطب، مجدد

اور وصی ہیں۔ آپ کو علم نبوت کا حامل بنایا گیا ہے، اور انسانی نفوس کے حالات و کوائف کے مطابق شرعی احکام و قواعد کے معارف کو استنباط کرنے اور جود الہی کے جو مختلف مدارج ہیں، ان کے علوم سے آپ کو بہرہ ور کیا گیا ہے (صفحہ ۱۴۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت شاہ صاحب کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی اس عنایت کا جو تمام نوع بشر کے لئے ہدایت عامہ کی مرادف تھی، جسم انسانی میں متشخص ہونا ہے، اور یہی مطلب ہے "تدلی اعظم کے مثالی مظہر کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مثالی کے ساتھ عالم مثالی میں قائم تھا، عالم ناسوت میں آنے کا" اس تدلی اعظم کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایک مکاشفہ میں (صفحہ ۱۵۹) لکھتے ہیں۔ میں تدلی اعظم کے اس مثالی مظہر سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس عالم ناسوت میں نازل ہوا متصل ہو گیا، اور اس سے گھل مل گیا اسوقت میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ اس مثالی مظہر کے جو دو قالب ہیں، میں اُن میں سے ایک ہوں...... تدلی اعظم کے اس مثالی مظہر کا یہ دوسرا قالب وجود علمی سے قریب ہوتا ہے، یعنی میں نے اللہ تعالیٰ کی اس عنایت ازلی کا جو ہدایت عامہ کی شکل میں انبیاء کی صورت میں بالعموم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مبارک میں بالخصوص ظہور پذیر ہوئی، علمی احصار کر لیا، اور میں علمی طور پر اس عنایت الہی کا مظہر بن گیا۔ شاہ صاحب کے لئے اس عنایت ازلی کا احصار تجدید دین کے لئے ضروری تھا، کیونکہ جب تک کسی مسئلے کا تاریخی پس منظر سامنے نہ ہو، اور اس کے تمام پہلوؤں کو نہ جان لیا جائے، اس مسئلے کا صحیح جائزہ نہیں لیا جا سکتا،

اس کے بعد ایک اور مکاشفے میں (صفحہ ۹۹) شاہ صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلم عطا کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت کے جو معارف و علوم

ان پر منکشف ہوئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی تدلیِ اعظم کے اسرار و رموز کو جو بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے بروئے کار آتی رہی ہے، جس طرح انہوں نے مشاہدہ کیا ہے، اس کو وہ لکھیں اور اس طرح وہ دینِ اسلام کی تجدید فرمائیں! اور مسلمانوں کو عروج و اقبال کی راہ دکھائیں۔

کونیات

تخلیق عبارت ہے مختلف اجزاء کو جمع کرنے اور ان جمع شدہ اجزا کے لئے جو صورت مناسب ہو، اُن پر اس صورت کے فیضان کرنے سے تاکہ ایک چیز وجود میں آجائے تخلیق کا عمل کبھی انسان کی صورت اختیار کرتا ہے اور کبھی گھوڑے کی اور کبھی کسی اور چیز کی، یہ تخلیق تو عناصر میں ہوئی، اور بعض دفعہ یہ تخلیق خیالی صورتوں میں بھی ہوتی ہے صفحہ ۲۷۸

اس سلسلے میں اس بات کا بھی خیال رہے کہ کسی محل میں کوئی تخلیق ہو، اس میں ایسا نہیں ہوتا کہ اس محل سے خارج کی کوئی چیز اس میں داخل ہو جائے ایسا ہونا محالات میں سے ہے، اور عقل کبھی اس کو تسلیم نہیں کر سکتی، ہاں اس ضمن میں ایسا ضرور ہوتا ہے کہ سلسلۂ تخلیق میں نشو و نما کا ایک محل سبب بنتا ہے نشو و ظہور کے دوسرے محل کا، اور ایک محلِ ظہور میں ایک چیز جو موجود ہوتی ہے، وہ سبب بنتی ہے، دوسرے محل میں اس چیز کے ظہور کا۔ صفحہ ۲۷۹

نفسیات

انسان کے اندر ایک لطیفہ "نسمہ" ہے، جسے "روح ہوائی" بھی کہتے ہیں، کان، آنکھ، ناک، زبان اور ہاتھ اسی نسمے کے آلۂ کار ہیں، جن کے ذریعہ وہ سنتا

دیکھنا، سونگھنا، چکھنا اور چھونا ہے۔ شاہ صاحب کہتے ہیں۔ کہ انسانی نسمے میں یہ بھی خاصیت ہے کہ وہ بغیر کان کے سُن سکے! اور بغیر زبان کے چکھ سکے اور بغیر ناک کے سونگھ سکے، بغیر ہاتھ کے چھو سکے اور بغیر آنکھ کے دیکھ سکے۔ یہ کیسے؟ اس کی توجیہ وہ اس طرح فرماتے ہیں نسمے میں ایک اجمالی حس ہوتی ہے، جس کا نام حس مشترک ہے، اس کے ذریعہ انسان کے حواس خمسہ میں سے ہر حس صرف قوت خیال سے ہی پہلے چیزوں کا ادراک کر لیتی ہے۔ مثلاً چکھنے کی حس کی قوت خیال یہ ہے کہ انسان کھانے کی ایک مزے دار چیز دیکھتا ہے اور چکھنے سے پہلے محض دیکھنے ہی سے اس کے منہ میں پانی آجاتا ہے، اسی طرح ایک آدمی دوسرے آدمی کو گدگدی کرنے کے لئے اس کے قریب ہوتا ہے لیکن قبل اس کے کہ وہ اس کے بدن کو ہاتھ لگائے، دوسرا آدمی محض خیال سے گدگدی محسوس کرنے لگتا ہے یہ چھونے کی حس کی قوت خیال ہے اور حس سماعت کی خیالی قوت یہ ہے کہ وہ نغمات اور اشعار کو سننے کے ساتھ ہی ان کے اوزان کا پتہ لگا لیتی ہے بعض نسمے جن کی حس مشترک بڑی قوی ہوتی ہے، وہ بدن کے ظاہری جوارح کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتے، بلکہ وہ ان کے بغیر ہی بصارت اسماعت ذوق اور لمس کی حسوں سے لذت یاب ہو سکتے ہیں صفحہ ۲

شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ مجھے آپ کے فیض صحبت سے یہ علم حاصل ہوا کہ ہر وہ عارف جو معرفت حق میں کامل ہوتا ہے، وہ جو کچھ بھی اخذ کرتا ہے صرف اپنے نفس سے کرتا ہے، اب رہے اخذ کے ذرائع واسباب، تو ان کی صورت یہ ہے کہ پہلے سے وہ چیز اس عارف کے نفس میں موجود ہوتی ہے، اور یہ ذرائع واسباب صرف واسطہ بنتے ہیں، اس کو اس چیز سے آگاہ کرنے کے، جو عارف اس طرح سے اخذ علم نہیں کرتا وہ معرفت الٰہی میں کامل نہیں ہوتا صفحہ ۱۹۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

اے اللہ! میں تیری حمد و ثنا کرتا ہوں، اور اسی کے ساتھ میں اس امر کا بھی اقرار کرتا ہوں کہ میں تیری حمد و ثنا میں قاصر ہوں میں تجھ سے مغفرت چاہتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔ اور میں یہ جانتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی گناہوں کا بخشنے والا نہیں۔ اور تیرے سوا کوئی سختی و نرمی میں میری مدد نہیں کرتا۔ اے اللہ! میں سرتاپا تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں، اور اپنے آپ کو تیرے حوالے کرتا ہوں۔ میری عبادت، میری نماز، میرا جینا اور میرا مرنا تیرے ہی لئے ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اہلِ شرک جن کو تیرے ساتھ شریک کرتے ہیں، تو اُن سب سے بلند و برتر ہے۔

اے اللہ! میں اپنے نفس کی بُرائیوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اور تجھ سے اچھے اخلاق اور نیک اعمال کی طرف ہدایت پانے کا بڑے عجز اور اصرار سے سوال کرتا ہوں۔ اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ سوائے تیری ذات کے جس نے مجھے پیدا کیا، اور جس نے کہ زمین اور آسمان کو بنایا، نہ تو کوئی مجھے بُرائیوں سے بچا سکتا ہے۔ اور نہ کوئی اچھے اخلاق اور نیک اعمال کی طرف ہدایت دے سکتا ہے، اور میں اس امر کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اور تو اکیلا ہے، کوئی تیرا شریک نہیں اور نیز میں اس کی شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ تیرے بندے اور رسول ہیں، سب رسولوں سے اور انبیاء سے افضل۔ میری دعا ہے کہ تو آپؐ پر، تمام رسولوں اور انبیاء پر، آپؐ کی آل پر اور آپؐ کے صحابہ پر جب تک کہ دن اور رات کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ اور جب تک کہ آسمان سایہ کئے ہوئے، اور زمین سب کو اُٹھائے ہوئے ہے خیر وسلامتی بھیجتا رہے۔

امابعد ——— بندۂ ضعیف ولی اللہ بن عبدالرحیم (خدا ان دونوں پر لطف و مہربانی فرمائے، اور ان کو اپنی رحمت کے دامن میں ڈھانپے) عرض کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت،

جس سے کہ اُس نے مجھے سرفراز فرمایا، یہ ہے کہ ۱۱۴۳ھ اور اس کے بعد کے سال میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے مقدس گھر کے حج کی، اور اپنے نبی علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی توفیق دی۔ لیکن اس سلسلہ میں اس نعمت سے بھی کہیں زیادہ بڑی سعادت جو مجھے میسر آئی، وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس حج کو میرے لئے مشاہداتِ باطن اور معرفتِ حقائق کا ذریعہ بنایا اور اسے محض حجاب اور بے علمی کا حج نہیں رہنے دیا۔ اور اسی طرح اُس نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی اس زیارت کو میرے لئے بصیرت افروز بنایا، اور اُسے بے بصری اور اندھے پن کی چیز نہ رہنے دیا۔ الغرض اس حج و زیارت کے ضمن میں مجھے جو نعمت عطا کی گئی، وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ بلند مرتبہ ہے۔ اور اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حج کے ان مشاہداتِ باطنی میں جو اسرار و رموز مجھے تلقین فرمائے ہیں، اُن کو ضبطِ تحریر میں لے آؤں، اور نیز نبی علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی روحانیت سے اپنی زیارت کے دوران میں جو کچھ میں نے استفادہ کیا ہے، اُس کو لکھ دوں تاکہ ایک تو یہ چیز خود میرے لئے ایک یادداشت کا کام دے، اور دوسرے میرے اَور بھائیوں کو اس سے بصیرت حاصل ہو سکے۔ میرا خیال ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر جو اس نعمت کا شکریہ عاید ہوتا ہے، شاید اس طرح میں اس کا کچھ حق ادا کر سکوں گا۔

مَیں نے اس رسالے کا نام "فیوض الحرمین" رکھا ہے۔ قصّہ مختصر، اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہماری کفیل ہے، اور وہی سب سے اچھی ہماری کارساز بھی ہے۔ اور پھر خُدائے بزرگ و برتر کے سوا نہ تو کسی کے پاس کوئی اقتدار ہے اور نہ کوئی قوت۔

پہلا مشاہدہ

ان مشاہدات میں سے پہلا مشاہدہ یہ ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ اللہ والوں کی ایک بہت بڑی جماعت ہے۔ اور ان میں ایک گروہ ذکر و اذکار کرنے والوں اور نسبت[1] یادداشت کے حاملوں کا ہے۔ ان کے دلوں پر انوار جلوہ گر ہیں۔ اور ان کے چہروں پر تروتازگی اور حسن و جمال کے آثار نمایاں ہیں۔ اور یہ لوگ عقیدہ وحدت الوجود کے قائل نہیں۔

میں نے دیکھا کہ اللہ والوں کی اس جماعت میں ایک دوسرا گروہ بھی ہے، جو عقیدۂ وحدت الوجود کو مانتا ہے، اور اس کائنات میں

---

[1] "یادداشت" عبارت ہے۔ ذات واجب الوجود کی طرف خالص توجہ کرنے سے، ایسی توجہ جو الفاظ اور تخیلات سے مجرد ہو۔ (مترجم)

ذاتِ باری کے وجود کے جاری وساری ہونے کے متعلق وہ کسی نہ کسی شکل میں غور و فکر کرنے میں مشغول بھی ہے۔ اور چونکہ اس غور و فکر کے ضمن میں اُن سے ذاتِ حق کے بارے میں جو کُل عالم کے انتظام میں بالعموم اور نفوسِ انسانی کی تدبیر میں بالخصوص مصروفِ کار ہے، کچھ تقصیر ہوئی ہے، اس لئے میں نے دیکھا کہ ان لوگوں کے دلوں میں ایک طرح کی ندامت ہے اور اُن کے چہرے سیاہ ہیں، اور اُن پر خاک اُڑ رہی ہے۔

میں نے ان دونو گروہوں کو آپس میں بحث کرتے پایا۔ ذکر و اذکار والے کہہ رہے تھے کہ کیا تم ان انوار اور اس حُسن و تازگی کو نہیں دیکھتے جن سے ہم بہرہ یاب ہیں۔ اور کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ ہمارا طریقہ تم سے زیادہ ہدایت یافتہ ہے۔ ان کے خلاف عقیدہ وحدت الوجود کے قائل کہہ رہے تھے کہ کیا ذاتِ حق میں کل موجودات کا سما جانا یا گم ہو جانا امرِ واقعہ نہیں؟ اب صورت یہ ہے کہ ہم نے اُس راز کو پا لیا، جس سے تم بے خبر رہے، ظاہر ہے کہ اس معاملے میں تم پر ہمیں فضیلت حاصل ہے۔

اِن دونو گروہوں میں اس بحث نے جب ایک طویل نزاع کی شکل اختیار کر لی تو اُنہوں نے مجھے اپنا حَکَم بنایا، اور اس مسئلہ کو فیصلے کے لئے میرے سامنے پیش کیا۔ چنانچہ مَیں نے ان کا حَکَم بننا منظور کیا، اور اس ضمن میں میں نے یُوں گفتگو کی:۔

بات یہ ہے کہ علومِ حقّہ کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ علوم جن سے

نفوس کی تہذیب و اصلاح ہوتی ہے، اور دوسرے وہ علوم جن سے نفوس کی اصلاح نہیں ہوتی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفوسِ انسانی میں الگ الگ استعدادیں ودلیعت فرمائی ہیں۔ اور ان نفوس میں سے ہر ہر نفس اپنی اپنی استعداد کے مطابق علوم حقّہ کا ذوق رکھتا ہے چنانچہ جب کوئی نفس علوم حقّہ ہیں سے اُن علوم میں جو خاص اُس کے ذوق کے مطابق ہوتے ہیں اور اُن سے اُس کی طبیعت کو مناسبت ہوتی ہے، پوری طرح مستغرق ہو جاتا ہے تو اس کی وجہ سے اُس نفس کی تہذیب و اصلاح ہو جاتی ہے۔ بے شک وحدت الوجود کا یہ مسئلہ جو اس وقت مابہ النزاع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علوم حقّہ ہیں سے ہے، لیکن بات دراصل یہ ہے کہ تم دونوں کے دونوں گروہ نہ تو اس کے اہل تھے، اور نہ یہ چیز تمہارے ذوق اور مشرب کے مطابق تھی۔ اس لئے تمہارا مسلک یہ ہونا چاہیئے کہ جس طرح ملاءِ اعلیٰ کے فرشتے بارگاہِ حق میں تضرع و نیازمندی کرتے ہیں۔ تم بھی اُن کی طرح وجود باری کی اُس حقیقت کی طرف جو سب کو جامع ہے یکسر متوجہ ہو جاتے۔

اب رہا ذکر و اذکار والے اصحاب انوار کا معاملہ، سو بات یہ ہے کہ گو وہ مسئلہ وحدت الوجود سے تو بےخبر رہے، لیکن علوم حقّہ میں سے وہ علوم جو خود اُن کے ذوق اور مشرب کے مطابق تھے، وہ انہیں حاصل تھے اور ان کی وجہ سے ہی اُن کے نفوس کی تہذیب و اصلاح ہو گئی چنانچہ جس درجۂ کمال تک پہنچنے کی استعداد لیکر وہ پیدا ہوئے تھے، اس طرح وہ

اُس درجہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ باقی رہا وحدت الوجود پر اعتقاد رکھنے والوں کا معاملہ، تو گو اس مسئلہ میں اصل حقیقت تک تو اُن کی رسائی ہوگئی۔ لیکن علوم حقہ میں سے وہ علم جن سے اُن کی طبیعت کو قدرتی مناسبت تھی، وہ اُنہیں نصیب نہ ہوئے، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب انہوں نے اپنے خیالات کو فکر کی اس وادی میں جہاں کہ یہ سوال درپیش ہوتا ہے کہ موجودات عالم میں وجودِ حق کس طرح جاری و ساری ہے۔ بے عنان چھوڑا تو اُن کے ہاتھ سے ذات حق کی تعظیم، اُس سے محبت، اور موجودات سے اُس کے ماوراء اور منزہ ہونے کا سررشتہ چھوٹ گیا۔ اور در اصل یہی وہ سررشتہ ہے جس کے ذریعے ملاء اعلیٰ کے فرشتوں نے اپنے رب کو پہچانا، اور اُن سے افلاک[1] کی قوتوں نے اپنی فطری استعداد کی بنا پر عرفانِ الٰہی کے اس سررشتہ کی وراثت پائی، اور پھر آگے چل کر اس عالم کی یہ ساری فضا اُن کی معرفت سے بھر گئی۔ اب جو نفوس ذاتِ حق کی تعظیم، اُس کے ساتھ محبت، اور موجودات سے اُسے منزہ ماننے کی اس معرفت کے وارث نہ ہوئے تو اس کی وجہ سے نہ تو اُنکی تہذیب و اصلاح ہو سکی، اور نہ وہ اپنے مقصدِ حیات ہی کو پا سکے۔

الغرض اے وحدت الوجود کو ماننے والو اور وجودِ حق کو موجوداتِ عالم میں جاری و ساری جاننے والو! تم میں سے اُس گروہ نے اس

---

[1] یونانی فلسفہ میں افلاک کو اس دُنیا میں مؤثر مانا جاتا تھا، انہیں سے یہ خیال مسلمانوں میں بھی پھیلا۔ (مترجم)

راز کو زبان سے نکالا جو اِس کا اہل نہ تھا۔ اور وہ گروہ جس کے مشرب اور ذوق کے مطابق یہ علم تھا، وہ خاموش رہا۔ اب تم میں بعض ایسے مسخ شدہ لوگ ہیں، جو اس راز سے بالکل بے خبر ہیں۔ اور اس ضمن میں حصولِ کمال کے لئے عقل و خرد کی جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے، اور وہ نیتجہ ہوتی ہیں فلکی عناصر[1] کی تاثیرات کا، وہ تم میں سرے سے غائب ہیں۔ ان حالات میں قدرتی بات تھی کہ وحدت الوجود کے اس مسئلے کی وجہ سے تمہارے دلوں میں ندامت اور تمہارے چہروں پر سیاہی ہوتی۔ حقیقت میں اس راز کا اہل تو وہ شخص ہے جس میں عقل و خرد کی یہ صلاحیتیں برومند اور ترو تازہ ہوں، اور اس عالم میں مظاہر و اشکال کے جو تہ بہ تہ حجابات ہیں، اُنہوں نے اس کی ان صلاحیتوں کو بے اثر نہ کر دیا ہو۔

میں نے اتنا کہا تھا کہ وہ اس مسئلے کو سمجھ گئے۔ اور اُنہوں نے اس کا اعتراف بھی کر لیا۔ پھر میں نے اُن کو بتایا کہ یہ وہ اسرار ہیں جو خاص طور پر مجھے ربّ کی طرف سے عطا فرمائے گئے تاکہ میں اس معاملے میں تمہارے ان اختلافات کو حل کر سکوں۔ باقی تعریف تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لئے ہے جو سب جہانوں کا پروردگار ہے۔

مَیں یہ کہہ چکا تھا کہ میری آنکھ کھُل گئی۔ اور مَیں بیدار ہو گیا۔

---

[1] قدیم حکمت میں انسانوں کی بعض خصوصیات اور استعدات کو فلکی عناصر یعنی نجوم و کواکب کی تاثیرات کا نتیجہ مانا جاتا ہے۔ (مترجم)

دُوسرا مشاہدہ

میں نے اپنی رُوح کی آنکھ سے اللہ تعالیٰ کی تدلّی[1] کو دیکھا۔ اور مجھے یوں نظر آئی کہ ایک شئے واحد ہے کہ اپنی ذات میں باہم اتصال رکھتی ہے اور سارے عالم میں جاری و ساری ہے۔ گویا کہ یہ عالم اُس کے اوپر ایک پردہ ہے اور وہ تدلّی اُس کے اندر ہے۔ اُس وقت میں سمجھا کہ یہی وہ تدلّی ہے کہ جب عارف اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنی چشم رُوحانی سے اسے دیکھتا اور اس کے اندر گُم ہو جاتا ہے تو عارف کی تاثیر اور اُس کی رشد و ہدایت کی قوت

---

[1] سورۂ "والنجم" میں ہے "ثم دنا فتدلّی فکان قاب قوسین أو أدنی" تصوف کی اصطلاح "تدلّی" اسی "فتدلّی" سے لی گئی ہے۔ کمالات الٰہی اس دُنیا میں تجلیات الٰہی کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہ تجلیات جس تصرف الٰہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اُسے اللہ تعالیٰ کی تدلّی کہتے ہیں۔ مترجم

بہت بڑھ جاتی ہے اور راہِ حق میں حق کی خاطر اُس کا تصرف کرنا جائز ہوتا ہے۔

اس تدلّی کے دو رُخ ہیں۔ اس کا ایک رُخ تو وجودِ خارجی کے مقابل ہوتا ہے۔ اس کو یُوں سمجھئے کہ گویا ایک رنگ ہے جو الواحِ نفوس کے اندر جما ہُوا ہے اس کا نام نُور ہے۔ اور اس تدلّی کا دوسرا رُخ وجود ذہنی کے مقابل ہے۔ اور یہ صادق آتا ہے ذاتِ حق پر، اور اس کو "اسم" یا تدلّی کہتے ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر نقشبندیہ کے ہاں "اندراج النہایہ فی البدایہ"[1] ہے۔ جو عارف اس تدلّی کے ذریعہ ذاتِ حق سے واصل ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اختیار کے سوا اور کسی چیز کو نہیں جانتا۔ اور وہ یُوں محسوس کرتا ہے گویا ایک دریائے ناپیدا کنار ہے جس میں وہ ڈوبا ہُوا ہے۔

معرفتِ عظیمہ:۔ ذاتِ حق جب بندوں کی طرف اپنی عظیم ترین تدلّی کرتی ہے تو اُس کا مشاہدہ اگر رُوح کی آنکھ سے ہو تو یہ افرادِ کاملین

---

[1] سالک جب حقیقت کی تلاش میں نکلتا ہے تو وجود کے ان گوناگوں تعینات اور مختلف مظاہر کے پردوں کو چاک کرتا ہوا آخر میں وہ جس مقام پر پہنچتا ہے، وہ خود اُسی کا وہ نقطہ ہوتا ہے جو اُس کے اپنے وجود کا عین ہے۔ چنانچہ اس بنا پر نقشبندی بزرگوں نے فرمایا ہے کہ "آخری نقطہ تک پہنچنے کے بعد پھر پہلے نقطے کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے"۔ یہ ہے اندراج النہایہ فی البدایہ۔ (از مترجم)

کا مقام ہوتا ہے۔ اور اگر اس تدلّی کا ادراک صرف رُوح کے علم سے ہو تو یہ ایک ایسی چیز ہے جس میں کہ عوام بھی شریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس تدلّی کی بات اگر رُوح کے کانوں سے سُنی جائے تو یہ کاملین کا مقام ہے۔ لیکن اگر رُوح محض اپنے علم کے ذریعہ تدلّی کے کلام کو سُنے تو اس چیز میں عوام بھی شریک ہو سکتے ہیں۔

تحقیق شریف :۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ جس طرح ہمارے بدن کے لئے ظاہر میں آنکھیں، کان اور زبان ہے، اسی طرح ہمارے نفس ناطقہ کی بھی باطن میں آنکھیں، کان اور زبان ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے انسان کے اندر دو لطیفے رکھے گئے ہیں۔ ایک لطیفہ "قیومیت الٰہیہ" کا ہے، جو بدن سے تعلق رکھتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ وہ بدن کے اندر حلول کئے ہوئے ہے۔ لیکن اس لطیفہ کو "نسمہ" یعنی روح ہوائی سے الگ چیز سمجھنا چاہیئے۔ معرفتِ اشیاؑ کے سلسلے میں انسان کے اس لطیفے کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ اس کا ایک رُخ تو یہ ہے کہ اشیاء کی تمام صُور کا جو اصل مبداؑ ہے وہاں سے

---

۵۱ ہر شئے عبارت ہے دو اجزاء سے، ایک جسم اور دوسرا صورت، تمام اجسام کو ایک جسم کل سے صادر مانا جاتا ہے، اور اسی طرح تمام صورتوں کا بھی ایک ہی اصل سے صدور مانا گیا ہے۔ اور یہ ہے مبداءِ صور۔ (مترجم)

اس لطیفہ پر ایک مجرد صورت کا فیضان ہوتا ہے۔ اس طرح کسی شئے کی معرفت کا نام علم ہے۔ اس ضمن میں اس لطیفے کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ انسان کا یہ لطیفہ ایک شئے کی طرف بڑھتا ہے اور اس سے اتصال پیدا کر لیتا ہے۔ اس لطیفے کا کسی شئے سے یہ اتصال اگر کشفِ بصری کے اعتبار سے ہو تو اُس کو نفس ناطقہ کے اس لطیفے کی بصارت کہیں گے۔ اور اگر یہ اتصال کشفِ سماعی کے اعتبار سے ہو تو اُسے اس لطیفے کی سماعت کہا جائے گا۔ اور اگر یہ اتصال کشفِ علمی یعنی کسی کو سمجھانے یا کسی سے سمجھنے کے اعتبار سے ہو تو اُسے نفس ناطقہ کے اس لطیفے کا کلام کہا جائے گا۔

معرفتِ اشیاء کے سلسلہ میں نفس ناطقہ کے اس لطیفہ کا یہی رُخ ہے جس کی بنا پر بندہ اپنے ربّ عزّوجل کو دیکھتا ہے۔ اور اسی بنا پر اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام بھی ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ سے، ارواح سے، ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں سے اور جو نیک لوگ پہلے گزر چکے ہیں، اُن کی ارواح سے باتیں کرتا ہے۔ چنانچہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی روح اللہ تعالیٰ کو دیکھتی ہے، اور روح کی اس رویتِ حق کا ایک رنگ نسمے یعنی انسان کی رُوحِ ہوائی میں آجاتا ہے۔ اور نسمے سے یہ رنگ انسان کی آنکھ میں آجاتا ہے۔ اور پھر یہ رنگ ایک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور اُس وقت آدمی کہہ اُٹھتا ہے کہ میں نے ربّ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے،

اس میں بے شک وہ سچا ہوتا ہے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ربّ کو دیکھا، تو بات یہ ہے کہ آپؐ کا ربّ کو دیکھنا اسی قبیل سے تھا۔ اور اسی طرح حضرت موسیٰؑ کا اللہ تعالیٰ سے کلام کرنا بھی اسی ضمن میں آجاتا ہے۔

میرا خود اپنا واقعہ ہے کہ ایک دن مَیں نے آفتاب[ا] کی روح سے اتصال پیدا کیا۔ مَیں نے اُسے دیکھا، اور اُس کی باتیں سُنیں۔

[ا] روحِ آفتاب ــــــ مولانا محمد قاسمؒ "تقریر دل پذیر" میں لکھتے ہیں "باقی رہا عالم کے لئے رُوح کا ہونا ہر چند نظر سرسری میں ایک نامعقول بات معلوم ہوتی ہے، مگر میں جانتا ہوں کہ وجہ اسکی بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ زندگی سانس کے لینے اور اپنے ارادے سے حرکتوں کے کرنے کا نام رکھ چھوڑا ہے۔ اور اگر ہم تم یہ بات جانتے کہ زندگی اسے نہیں کہتے، بلکہ زندگی حقیقت میں .... اُسے کہتے ہیں کہ جس سے جاننا پہچاننا سوچنا سمجھنا تعلق رکھتا ہے تو ماسوا انسان اور حیوانات کے زمین آسمان، درخت، پہاڑ بلکہ مجموعہ عالم کے حق میں بھی روح کے ہونے کا انکار نہ کرتے .... مجھے بڑی قوی دلیل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ماسوا ان اشیاء کے جن کو ہم جاندار کہتے ہیں، اوروں میں بھی بلکہ ہر شئے میں جان ہے اور ہر ذرّہ اور ہر چیز کے لئے ایک روح ہے، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ پہلے اس سے واضح ہو چکا کہ اس عالم کی ہر چیز کا چھوٹی سے لیکر بڑی تک وجود اور ہے اور ذات اور ہے یعنی دو وجود ہیں ظاہری اور باطنی، سو باطنی وجود کو ذات خداوندی سے کچھ اس قسم کی نسبت ہے، جیسے شعاعوں کو آفتاب سے، اور وجود ظاہری کو بمنزلہ ان دیپوں کے جو شعاعوں سے پیدا ہوتی ہیں اور ہر صحن اور ہر دالان میں جدا جدا نظر آتی ہیں" مترجم

چنانچہ مَیں نے اُس سے کہا کہ اے روحِ آفتاب! لوگ تجھ سے روشنی حاصل کرتے اور فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور ہر رنگ اور ہر طَور میں تیرا غلبہ اور ظہور دیکھنے کے باوجود وہ تیرا انکار کرتے اور تیرے خلاف جھوٹ باندھتے ہیں۔ لیکن تیری حالت یہ ہے کہ نہ تُو اُن سے انتقام لیتی ہے اور نہ اُن پر خفا ہوتی ہے۔ یہ سُن کر روحِ آفتاب بولی کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ان لوگوں کا غرور اور تکبّر اور نیز اُن کا اپنے آپ میں پھُولا نہ سمانا خود میری اپنی ذاتی مسرت کا ایک مظہر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میری نظر ان لوگوں کے غرور و تکبّر کی طرف نہیں جاتی، بلکہ مَیں تو ان لوگوں کی خوشی و شادمانی کو دیکھتی ہوں اور جانتی ہوں کہ یہ سب میری اپنی خوشی و شادمانی کا ایک پرتو ہے۔ اس بات کو جانتے ہُوئے کیا یہ جائز ہے کہ کوئی خود اپنے ذاتی کمال پر بگڑے۔ یا کوئی خود اپنی ذات سے انتقام لے۔ یہ گفتگو ہو چکی تو روحِ آفتاب سے میرا اتّصال اَور بڑھا۔ چنانچہ میں نے اُسے اپنی طبیعت اور جبلّت میں بڑا فیاض پایا اسی طرح مَیں نے اَور افلاک سے بھی اتصال پیدا کیا اور روحِ آفتاب کی طرح مَیں نے افلاک کی ارواح کو بھی اپنے علوم اور اپنی ہمتوں میں باہم متوافق اور ہم آہنگ پایا۔

ایضاحِ مزید:۔ اگر تم اس وجدانی مسئلہ کی حقیقت دریافت

کرنا چاہتے ہو تو جو کچھ میں کہتا ہوں سُنو ! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ نفسِ ناطقہ کا علم اس سے میری مُراد نورِ بسیط سے ہے، یہ ہے کہ انسان کے اندر جو " قیومیتِ الہٰیہ" کا لطیفہ ہے اور جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، وہ ایک جسم سے مخصوص و مقیّد ہو جائے اور " طبیعتِ کلّی[1] " جو خارج میں ایک فعّال نقطے کی حیثیت رکھتی ہے، وہ شئے معلوم کی مخصوص صورت میں ظہور پذیر ہو۔ اور ہمارے نزدیک یہ اُسی وقت ہی ہوتا ہے، جب ادراک کرنے والے اور جس چیز کا کہ ادراک کیا جاتا ہے، دونوں میں اتحاد ہو جائے۔

اب اس ادراک کی یا تو یہ شکل ہے کہ یہ ادراک کلّی مظہر کا ہو اور یہ شامل ہو اس کلّی مظہر کے نفس پر یا جسم پر، جیسے صورۃ الشانیہ، یا حیوانیہ یا زمین یا نور اور باقی عناصر یعنی خاک آگ اور ہوا اور نیز آفتاب اور ماہتاب کی قوت کا ادراک ہے۔ یعنی ادراک کی ایک صورت یہ ہوئی کہ کلّی مظہر کا ادراک ہو۔ اور اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ یہ ادراک کسی خاص شئے کا ہو۔ اور وہ شئے ادراک کرنیوالے نفس کی قسم میں سے ہو۔ جیسے زید کا نفس عمر کے نفس کا ادراک کرے۔ ادراک کی پہلی صورت میں یعنی جب کلّی مظہر کا ادراک کیا جاتا ہے یہ کیفیت ہوتی ہے کہ نفس ناطقہ میں یہ ادراک اس کلّی مظہر کے مقابلہ میں ایک مجرد نقطے کی صورت

---

[1] ہر فرد کا اس دُنیا کے علاوہ دوسرے موطن میں ایک کلّی وجود مانا جاتا ہے۔ یہ کُلّی وجود محض ایک قیاس نہیں، بلکہ خارج میں اس کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ جو طبیعت ہے، اس کا بھی ایک کلّی وجود ہے، اور اسے "طبیعت کلّی" کہا گیا ہے۔ مترجم

اختیار کر لیتا ہے ، چنانچہ جب تک اُس کلی مظہر کی حقیقت نفس میں باقی رہتی ہے اُس وقت تک ادراک کا یہ نقطہ مجرد بھی باقی رہتا ہے اور جب وہ فنا ہو جاتی ہے تو یہ نقطہ بھی باقی نہیں رہتا۔ نفس ناطقہ میں جب یہ نقطہ بیدار ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی مظہر کلی کی جو حقیقت نفس میں موجود ہوتی ہے ، اُس کے آثار و احکام بھی نمودار ہو جاتے ہیں ذوقی اور حقیقی دونوں لحاظ سے۔ اور یہ مُراد اور مطلب ہے ہمارے اس قول کا کہ ادراک کی اس صورت میں ادراک کرنے والے نفس اور جس چیز کا کہ ادراک کیا جاتا ہے دونوں متحد[1] ہو جاتے ہیں۔

اب جب کسی ایسی شئے کا ادراک کیا جاتے کہ وہ ادراک کرنیوالے نفس کی قسم میں سے ہو تو اُس ادراک کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ادراک کرنے والا نفس اُس نفس کے ساتھ جس کا کہ وہ ادراک کر رہا ہے۔ اُن دونوں کی جو طبیعت کلی ہے اُس کی ایک بارگاہ میں جمع ہوتا ہے اور وہاں یہ صورت پیش آتی ہے کہ ایک نفس دوسرے نفس پر غالب آجاتا ہے کہ خود اُس

---

[1] اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے آگ ایک حقیقت ہے ، جس کا کہ تصور ذہن میں ہے اب نفس ناطقہ اس آگ کا ادراک کرتا ہے۔ اور یہ ادراک ایک مجرد نقطے کی صورت میں نفس ناطقہ میں قرار پذیر ہوتا ہے۔ یہ ادراک صرف اسی طرح ہی ممکن ہے کہ خارج میں جو آگ ہے اور جس کا کہ ادراک کیا جارہا ہے ، اُس کا اور نفس ناطقہ میں جو آگ کا پہلے سے تصور ہے اُن دونوں کا اتحاد ہو جائے۔ اور یہ مطلب ہے مُدرِک اور مدرَک کے اتحاد کا۔

مترجم

کے اندر غالب آنے کا جذبہ ہوتا ہے، یا وہ دوسرے سے قوت حاصل کرلیتا ہے، یا یہ ہوتا ہے کہ دوسرے نفس کے مقابلے میں اس میں زیادہ قوتیں ہوتی ہیں۔ اور ان کی وجہ سے وہ اُس پر غالب آجاتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ قوتیں ختم ہونے والی نہ ہوں۔

بات دراصل یہ ہے کہ نفوس کی ایک دوسرے پر تمام تر تاثیر یا تو غلبہ و قہر سے ہوتی ہے اور یا محبت کے ذریعہ، اور ان ہر دو طریقوں میں تاثیر ڈالنے کی صورت یہ ہے کہ ایک نفس کے اندر قدرت کی طرف سے جو قوت ودیعت کی گئی ہے، اب وہ قوت خواہ دوسرے پر غالب آنے کی ہو یا دوسرے سے متاثر اور مغلوب ہونے کی، یہ نفس سب سے کنارہ کش ہوکر صرف اُسی قوت کا ہوجائے۔ چنانچہ یہ وصف افرادِ کاملین کا ہے۔ اور اگر ایک نفس میں صرف غالب آنے والی ہی قوت ہو تو یہ غیر کاملین کی خصوصیت ہے۔ اس کے علاوہ نفس کی ایک اور قسم ہے۔ جس میں غلبہ و محبت کی یہ قوتیں تو موجود ہوتی ہے، لیکن اس کے اثرات و احکام پہلے نفس کے مقابلے میں بہت کم اور ضعیف ہوتے ہیں، اس کے معاملے میں ہوتا یہ ہے کہ تاثیر کرنے والا نفس اُس نفس کا جس پر کہ تاثیر ڈالی جا رہی ہے۔ اور اسی طرح وہ نفس جس پر کہ تاثیر ڈالی جا رہی ہے، دوسرے نفس کا جو موثر ہے، اس قوت کے ذریعہ ادراک کرتا ہے۔ اور یہ دونو نفس باہم متصل ہوجاتے ہیں: اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان دونو نفسوں کے اس طرح ایک دوسرے سے متاثر ہونے اور باہم ملنے سے نفس کی اس قوت سے ایسے

ایسے احکام و آثار ظاہر ہوتے ہیں، جو پہلے نہیں تھے۔

اس ضمن میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نفس میں یہ قوت موجود ہے، لیکن وہ اپنی دوسری قوتوں کے اس طرح تابع ہے کہ وہ اُن میں فنا ہو گئی ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ اپنی خصوصیات اور احکام و آثار بھی کھو بیٹھی ہے۔ چنانچہ اس حالت میں اس نفس کی یہ قوت بے اثر ہو جاتی ہے۔ اب جب دوسرا کوئی نفس اس نفس پر اپنا اثر ڈالتا ہے تو اُس میں وہ قوت اُبھر آتی ہے۔ اور ایسے موقعہ پر کہا جاتا ہے کہ فلاں نفس نے اس نفس پر اپنی تاثیر ڈالی۔ اور اُس میں یہ کیفیت پیدا کی۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ متاثر ہونے والا نفس موثر کرنے والے نفس سے جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے، وہ اُس کے اندر کہیں باہر سے نہیں آتا، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ متاثر ہونے والا نفس اپنی عنانِ توجہ کو خود اپنی باطنی استعداد یا اُس قوت کی طرف جو پہلے سے اس میں موجود ہوتی ہے، اس طرح پھیر دیتا ہے کہ اس استعداد یا قوت کے مقابلے میں اُس نفس کے اندر اُس کی جو دوسری قوتیں اُس قوت کو دبائے ہوئے ہوتی ہیں، موثر کرنے والے نفس کی تاثیر سے بے اثر ہو جاتی ہیں اور اس کی وہ استعداد یا قوت اُبھر آتی ہے۔

الغرض ایک نفس کی تاثیر دوسرے نفس پر خواہ غلبہ کے ذریعہ ہو یا غلبے کے قبیل کی جو اور چیزیں ہیں، اُن کے ذریعے سے۔ یا یہ تاثیر محبت کے ذریعے ہو یا جو محبت سے متعلق اور چیزیں ہیں، اُن کے ذریعہ سے،

بہر حال ان دو میں سے کسی ذریعہ سے بھی تاثیر ہو، اس تاثیر کے لئے دو نفسوں میں اتحاد کا ہونا لازمی ہے۔ لیکن اس اتحاد کے لئے ضروری نہیں کہ دونوں نفسوں کا ہر لحاظ سے مطلقاً اتحاد ہو۔ بلکہ اس کے لئے ایک قوت یا ایک جزو کا اتحاد ہی کافی ہے۔ اور نیز اس اتحاد کے لئے ضروری نہیں کہ ان دو تو نفسوں کی طبیعت کلّی کے جو مواطن ہیں، اُن سب میں ان کا اتحاد ہو، بلکہ اس کے لئے طبیعت کلّی کے جملہ مواطن میں سے ایک آدھ موطن ہی کافی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے اس قول میں کہ ادراک کی اس صورت میں ادراک کرنے والے اور جس شئے کا کہ ادراک کیا جا رہا ہے، دونو کا اتحاد ہو جاتا ہے، اتحاد سے اسی قسم کا اتحاد مقصود ہے۔

اب جب یہ بات واضح ہو گئی تو تمہیں جاننا چاہئیے کہ ایک نفس کی دوسرے نفس کے ساتھ تعلق کی کئی صورتیں اور حالتیں ہوتی ہیں، ان میں سے ایک اتحاد، دوسرے نفس میں گُم ہو جانے، اور اُس نفس کے علاوہ ہر شئے کو بھُول جانے کی صورت ہے۔ اور اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ دونو میں سے ہر نفس خود اپنے آپ کی نفی کرنے کی طرف دھیان دے، دراں حالیکہ وہ دوسرے نفس کے ساتھ اتحاد میں ڈوبا ہوا ہو۔ اس سے یہ ہو گا کہ اُن میں سے ہر ایک نفس دوسرے نفس سے الگ ہونے کے باوجود اُسکے رنگ میں رنگا جائیگا اور اسکے ساتھ ساتھ اُسے یہ بھی محسوس ہو گا کہ وہ ہر لحاظ اور ہر جہت سے تو دوسرے نفس کی طرح نہیں، البتہ ایک نہ ایک لحاظ اور جہت سے وہ دوسرے نفس کا سا ضرور ہے۔ اس صورت کا نام "رؤیت" ہے۔

ایک نفس کی دوسرے نفس کے ساتھ تعلق کی تیسری صورت یہ ہے
کہ ایک پر دوسرے کے جملہ احکام اس طرح غالب آجائیں کہ اُس کے
اندر جو قوت ہے، وہ بے اثر ہو جائے۔ گویا کہ وہ کہیں چھپ گئی۔
اس حالت میں یہ احکام "اتحاد" اور "رؤیت" کی دو سابقہ صورتوں کے
مقابلے میں بہت کمزور شکل میں رونما ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نفس کی
یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کچھ اثر تو وہ "طرف غالب" سے لیتا ہے، اور
تھوڑا بہت اثر نفس کی "جہت مغلوب" سے آتا ہے۔ دو نفسوں کے تعلق
کی اس صورت میں کہا جاتا ہے کہ زید کے نفس نے عمرو کے نفس سے
بات کی اور اُس نے اس نفس کی بات سُنی۔

دو نفسوں کے تعلق کی چوتھی صورت یہ ہے کہ نفس میں غلبہ و محبت
کی جو قوت ہے اُس کا اثر و نفوذ سرے سے غائب ہو جائے اور اُس
کی بجائے اُس کا ایک ہلکا سا خیال رہ جائے۔ لیکن یہ خیال ایسا ہو کہ
اس سے جو اثرات مترتب ہوں، وہ اُس قوت کے اصلی احکام کے خلاف
اور اُن سے الگ ہوں۔ اس صورت میں یہ کہا جاتا ہے کہ ذہن میں
ایک صورت آئی اور آئینے کی طرح اُس میں نقش ہو گئی۔

الغرض ایک نفس کی دوسرے نفس کے ساتھ تعلق کی یہ چار صورتیں
ہیں جن کا کہ اوپر بیان ہوا۔ اور ہر صورت کے اپنے اپنے احکام ہیں۔
تمہیں چاہئے کہ ان معاملات میں غور و تدبّر سے کام لو۔

اس سے پہلے ہم بتا آئے ہیں کہ انسان کے اندر دو لطیفے ہیں۔

ایک لطیفہ "قیومیت الٰہیہ" کا ہے، جو بدن سے متعلق ہے، اور اس کے اندر حلول کئے ہوئے ہے۔ معرفتِ اشیاء کے ذیل میں یہ لطیفہ جس طرح مؤثر ہوتا ہے، ہم ابھی اس کے ذکر سے فارغ ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ انسان کے اندر ایک اور لطیفہ "نسمہ" بھی ہے۔ نسمے میں ایک اجمالی حِس ہوتی ہے اور اس حِس کا جسم کے جوارح سے اتصال ہوتا ہے۔ اگر کان کے فعل سے نسمہ کی یہ اجمالی حِس متصل ہو تو وہ سُننا ہے۔ اور اگر آنکھ سے اس کا اتصال ہو تو وہ دیکھنا ہے اور اگر زبان سے ہو تو وہ چکھنا ہے۔ اور اگر جسم کے کسی حصّے سے چھُونے سے نسمے کی اس اجمالی حِس کا تعلق ہو تو وہ لمس ہے۔ نسمے کی اِسی اجمالی حِس کو "حِسِ مشترک" کا نام دیا گیا ہے۔

نسمے کی اسی اجمالی حِس ہی کا نتیجہ ہے کہ انسان کے پانچ حواس میں سے ہر ایک حِس چھُونے، چکھنے، سونگھنے، دیکھنے اور سُننے سے پہلے ہی ان چیزوں کا خیال کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک نقطہ ہے جو بڑی تیزی سے گھوم رہا ہے۔ اب آنکھ اُسے دیکھتی ہے اور اُسے دائرہ سمجھتی ہے، حالانکہ وہاں دائرہ کا کہیں وجود نہیں ہوتا۔ اس گھومنے والے نقطے کو دائرے کی صُورت دینے والی چیز آنکھ نہیں بلکہ نسمے کی یہی حِس اجمالی یا حس مشترک ہے۔ یہ تو ہُوا دیکھنے کی حس کا معاملہ، ان پانچ حواس میں سے چکھنے کی حِس کی قوتِ خیال یہ ہے کہ مثلاً انسان کھانے کی ایک مزے دار چیز دیکھتا ہے، اور چکھنے سے پہلے محض دیکھنے ہی سے

اُس کے مُنہ میں پانی آجاتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی دوسرے آدمی کو گُدگُدی کرنے کے لئے قریب ہوتا ہے، لیکن قبل اس کے کہ وہ اُس کے بدن کو ہاتھ لگائے، دوسرا آدمی محض خیال سے گُدگُدی محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ چھُونے کی حِس کا خیال ہے۔ اور حِس سماعت کی خیالی قوت یہ ہے کہ وہ نغمات اور اشعار کو سُنتے ساتھ ہی اُن کے اوزان کا پتہ لگا لیتی ہے۔ الغرض انسان کے کان، اُس کا جسم اور زبان وغیرہ تو سُن کر، چھُو کر اور چکھ کر ایک چیز کو معلوم کرتے ہیں، لیکن نسمے کی حِس مشترک محض خیال سے اس چیز کو معلوم کر لیتی ہے۔

بعض نسمے جن کی حِس مشترک بڑی قوی ہوتی ہے وہ بدن کے ظاہری جوارح کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ ان کے بغیر ہی بصارت، سماعت، ذوق اور لمس کی حِسّوں سے لذّت یاب ہو سکتے ہیں۔ اور اگر تم اس مسئلے میں اصل حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہو تو وہ یہ ہے کہ نسمے کی یہی وہ حِس اجمالی ہے جس کے ذریعہ ظاہری جوارح کی حسّیں چیزوں کا ادراک کرتی ہیں۔ اور نیز مرنے پر جب رُوحیں اپنے بدنوں سے الگ ہو جاتی ہیں تو شاید نسمے کی یہی وہ حِس اجمالی ہے جو خود اپنی جگہ مستقل ہو جاتی ہے۔ اور اپنے خیال سے جیسے جیسے اُس کے لئے ممکن ہوتا ہے، مثالی شکلیں پیدا کر لیتی ہے بالکل اُسی طرح جیسے اس دُنیا میں جنّ اور فرشتے مختلف شکلوں میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

تیسرا مشاہدہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کے لئے جو شعائر[1] مقرر کئے گئے ہیں، مَیں نے دیکھا کہ اُن سے نُور کی لپٹیں نکل رہی ہیں۔ اس سے مَیں ان شعائر کی حقیقت کو سمجھ گیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ رُوحانی امور کو سب سے زیادہ مناسبت اگر کسی چیز سے ہے تو وہ نُور ہے۔ چنانچہ اسی روحانیت ہی کا اثر ہے کہ ان شعائر میں نُور کی ہئیت راسخ ہو گئی ہے۔ انسان ان شعائر کے نُور کا اپنے روحانی حاسّہ سے ادراک بھی کر سکتا ہے۔ اور اس ادراک کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ ادراک رُوح کے اندر نقش ہو جاتا ہے۔ اور اس سے انسان کے اندر انشراح پیدا ہوتا ہے اور اس کے دل میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور روحانیات سے اس کی مناسبت اور

---

[1] خانہ کعبہ، نماز، حج، روزہ وغیرہ یہ سب اللہ کے شعائر ہیں۔ مترجم

بڑھ جاتی ہے۔

نیز شعائر اللہ کی طرف جب لوگ متوجہ ہوتے ہیں تو اس سلسلہ میں ان کے یہ یہ گروہ بن جاتے ہیں۔ ایک گروہ شعائر اللہ کے حقوق ادا کرنے میں صرف اپنی نیت کا اجر پاتا ہے اور وہ اس طرح کہ یہ گروہ سمجھتا ہے کہ یہ شعائر اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ اور چونکہ اس کا حکم ہے کہ ان کے حقوق کا خیال رکھا جائے۔ چنانچہ وہ اُس کا حکم سمجھ کر ان شعائر کے حقوق بجالاتے ہیں، دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہوتا ہے جن کی رُوح کی آنکھیں کھُل جاتی ہیں۔ اور وہ اپنے روحانی حاسہ سے شعائر اللہ کا نور محسوس کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ سے اُن کی بہیمی قوتوں پر ملکی قوتیں غالب آجاتی ہیں۔ اور تیسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو شعائر اللہ کے نور میں بالکل ڈوب جاتے ہیں۔ اور اس حالت میں جب وہ غور و خوض کرتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی اس تدلّی کا جو ان شعائر کی اصل ہے ادراک کر لیتے ہیں اور اس سے وہ حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

چوتھا مشاہدہ

یہ مشاہدہ مشاہدۂ عظیم اور تحقیق تحقیق عالی ہے ـــــ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی اُس عظیم الشان اور جلیل القدر تدلّی کی حقیقت سے مطلع فرمایا جو تمام بنی نوع بشر کی طرف متوجّہ ہے۔ اس تدلّی سے اللہ تعالےٰ کو منظور یہ ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنے تک پہنچنے کی راہ کو لوگوں کے لئے آسان بنائے۔ اس تدلّی کا عالمِ مثال میں ایک مثالی پیکر ہے۔ اور وہاں سے یہ عالمِ اجساد میں کبھی انبیاء کی صورت میں بالعموم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں بالخصوص اور کبھی کتب الٰہی کی شکل میں بالعموم اور قرآن کی شکل میں بالخصوص اور کبھی نماز کی صورت میں اور کبھی حج کی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ میں نے اس تدلّی کو جو اپنی ذات میں ایک ہے دیکھا اور یہ پایا کہ جیسے جیسے خارجی حالات

و اسباب ہوتے ہیں، اُسی مناسبت سے وہ طرح طرح کے مظاہر میں صورت پذیر ہوتی ہے۔ خارجی حالات و اسباب سے میری مراد لوگوں کی عادات و اطوار اور اُن کے ذہنوں میں جو علوم مرکوز ہوتے ہیں، اُن سے ہے۔ اور یہ چیزیں ایسی ہیں کہ اِس زندگی کے بعد بھی جب یہ لوگ عالمِ برزخ میں پہنچتے ہیں تو اُن کی یہ عادات و اطوار اور یہ علوم اُن کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ اور ان کی یہ عادتیں اور اُن کے یہ اطوار اور اُن کے یہ مرکزی علوم ذریعہ بنتے ہیں حظیرۃ القدس میں اس عظیم الشان تدلّی کے خاص مثالی پیکر میں بروئے کار آنے کا۔ الغرض اس طرح ایک خاص زمانے میں اس تدلّی کا ایک مثالی پیکر حظیرۃ القدس میں بنتا ہے اور وہاں سے جب کہ ارادۂ الٰہی اس کا متقاضی ہوتا ہے اور جس وقت کہ دُنیا کے علوی اور سفلی حالات اس کے لئے سازگار ہوتے ہیں، یہ مثالی پیکر عالمِ جسمانی میں نازل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے اس تدلّی کے مختلف زمانوں میں مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہونے کی حکمت، اور پھر اس تدلّی کی ایک صورت کا دوسری صورت سے جو وجۂ امتیاز ہے، اور جو دراصل نتیجہ ہوتا ہے، اُن خارجی حالات و اسباب کا جو اِس تدلّی کا باعث بنتے ہیں۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے مجھے اس حکمت اور اس وجۂ امتیاز سے آگاہ فرمایا چنانچہ اب ہم انشاء اللہ اس تدلّی کی جو خود اپنی ذات میں ایک ہے حقیقت اور مختلف زمانوں میں اس کی مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہونے کی

کیفیت بیان کریں گے۔

اس ضمن میں تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ خارج[1] میں جب شخص[2] اکبر کا وجود بنا تو سب سے پہلا کام جو اُس نے کیا، وہ یہ تھا کہ اُس نے اپنے رب کو پہچانا اور اُس کی جناب میں عجز و نیاز مندی کی۔ اور یہ عجز و نیازمندی شخص اکبر کے ادراک میں ایک علمی صورت کی طرح نقش ہوگئی، اب اس علمی صورت کے دو رُخ ہیں۔ اس کا ایک رُخ تو شخص اکبر کا حصّہ جو جسم اور جسمانیات اور روح اور روحانیات سے متعلق ہے اس کے مقابل ہے، اور دوسرا رُخ اُس کے وجود ذہنی کے مقابل ہے۔ اور اس طرح یہ دوسرا رُخ علم کا مقصود یعنی خود "معلوم" بن گیا۔ چنانچہ "تدلیات" الٰہی میں سے یہ تدلّی جو وصال الٰہی کا ذریعہ بنی اسی رخ سے متعلق ہے اور یہ شخص اکبر کے حصّہ میں آئی ہے اور اسی سے اُسے اللہ تعالیٰ کی معرفت نصیب ہوئی۔ اب اس تدلی کا ایک اپنا مخصوص

---

[1] یہ سب کائنات جو ہمیں نظر آتی ہے، اس کا صدور ایک ہی وجود سے ہوتا ہے اور ہو رہا ہے۔ اس وجود کے دو مرتبے ہیں، ایک مرتبۂ غیب ہے جس کے تین درجے ہیں۔ درجۂ اول احدیت دوسرا درجہ وحدت اور تیسرا واحدیت، وجود کا دوسرا مرتبہ خارج میں ظہور کا ہے جس کے یہ تین منازل ہیں، ارواح، امثال اور اجسام۔ خارج سے یہاں مراد وجود کا یہ مرتبہ ظہور ہے۔ مترجم

[2] ایک شخص واحد عبارت ہوتا ہے جسم اور نفس دونوں کے مجموعے سے۔ اسی طرح کُل کائنات کا بھی ایک کلی جسم اور کلّی نفس مانا گیا ہے۔ اور ان دونوں کے مجموعے کو شخص اکبر کا نام دیا جاتا ہے۔ مترجم

مقام ہے۔ جس سے وہ تجاوز نہیں کرتی، چنانچہ جو شخص اُس کے دائرہ اثر میں آتا ہے، اُس کو اس معرفت میں سے حصہ مل جاتا ہے۔ الغرض اس تدلّی کے تنزلات میں سے جب کسی تنزل کا ایک محدود مقام میں نزول ہوتا ہے تو جیسے بھی اُس مقام کے حالات و مقتضیات ہوتے ہیں، انہیں کے مطابق یہ تدلّی صورت پذیر ہوتی ہے، اور اس تنزّل میں دونو جانبوں کے احکام کی رعایت کی جاتی ہے۔ یعنی ایک یہ کہ جو تدلّی اصل مقصود ہے، وہ محفوظ رہے اور دوسرے اُس زمانے اور مقام کے جو حالات و مقتضیات ہوں۔ اُن کو ملحوظ رکھا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ معرفت کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ اسے خوب مضبوطی سے پکڑو، جیسے کہ کوئی کسی چیز کو دانتوں سے پکڑتا ہے۔

شخص اکبر کے ظہور پذیر ہونے کے بعد جب افلاک میں سے ایک ایک فلک اور عناصر میں سے ایک ایک عنصر اپنی ظاہری اور مخفی روح کے ساتھ معرض وجود میں آیا، تو ہر فلک اور ہر عنصر سے جو چیز سب سے پہلے ظاہر ہوئی، وہ یہ تھی کہ اُس نے اپنے رب کو پہچانا۔ اور اس کی جناب میں عجز و نیازمندی کی، اور اس ضمن میں ان میں سے ہر ایک نے خود اپنے فطری تقاضے سے شخص اکبر سے مدد لی۔ اور یہ افلاک اور عناصر کیوں شخص اکبر سے مدد نہ لیتے۔ آخر ان کی اصل اور ان کے وجود کا مبدا تو شخص اکبر ہی ہے۔ چنانچہ یہ فلک اور یہ عناصر اُسی طرح ذات حق کی طرف متوجہ ہوئے جس طرح کہ خود شخص اکبر اُس ذات حق کی طرف متوجہ تھا۔ لیکن اس کا

سلسلہ میں اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ شخص اکبر اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی جو تدلی تھی، وہ سبب بنی ایک فیضان کا جو ایک ایک فلک اور ایک ایک عنصر کے ادراک میں ایک خاص صورت میں رونما ہوا۔ یہ اس باب میں معرفت کا دوسرا نکتہ ہے۔

شخص اکبر، افلاک اور عناصر کی تخلیق کے بعد "اعیان"[1] کا ظہور ہوا۔ ان اعیان کو "ارباب الانواع" بھی کہا گیا ہے۔ الغرض جب یہ اعیان معرضِ وجود میں آئے تو ان میں سے ہر ہر نوع کے الگ الگ احکام کا تعین ہوا۔ لیکن یہ اس دنیا کا نہیں بلکہ عالمِ مثال کا ذکر ہے۔ اب ان انواع میں سے ایک نوع انسان کی ہے۔ اور یہ نوع اس لحاظ سے کہ اس میں معرفت الٰہی کی استعداد رکھی گئی ہے۔ اور یہ اپنے اعمال کی جواب دہ بھی ہے اور نیز اسے بیکار اور مہمل نہیں چھوڑا گیا، اور پھر اس بنا پر کہ اس کو خدا کی امانت[2] کا حامل بنایا گیا ہے دوسری انواع سے ممتاز ہے۔ جب عالمِ مثال میں نوعِ انسان کا یہ مثالی پیکر بنا تو اس سے تقسیم انحصاری[3] کے قاعدہ پر افرادِ انسانی ظاہر ہو ہو کر عالمِ اجسام میں

---

[1] "اعیان" جمع عین کی۔ افلاطون کے نزدیک ہر چیز جو اس دنیا میں پائی جاتی ہے اس دنیا کے ماورا ایک دنیا ہے، جس میں اس چیز کی اصل موجود ہے۔ اس اصل چیز کو عین کہتے ہیں۔ ان اعیان کو "مثلِ افلاطون" کا نام بھی دیا گیا ہے۔ مترجم

[2] یہ اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف انا عرضنا الامانۃ علی السموٰت والارض الخ مترجم

[3] تقسیم انحصاری:۔ مثال کے طور پر کلمہ کو ہم صرف اسم، فعل اور حرف پر ہی تقسیم کر سکتے ہیں اور ان کے سوا کلمہ سے کچھ اور نہیں نکل سکتا۔ یہ تقسیم، تقسیم انحصاری کہلاتی ہے۔ مترجم

آنے لگے۔ ان افراد کے ظاہر ہونے کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کہ کوئی موسیقار ہو اور وہ اپنے ساز کی تاروں کو جانچنے کے بعد یہ معلوم کرلے کہ ان تاروں میں یہ یہ راگ ہے، نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم۔ اس کے بعد سوچے کہ اگر میں اس راگ کو فلاں راگ سے ملا دوں تو ان دونوں کے ملنے سے یہ یہ اور راگنیاں پیدا ہوجائیں گی، نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم، جیسے کہ حصر کرنے والی عقلی تقسیم کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ ان راگنیوں کو ایک دوسرے سے ملائے اور اس طرح وہ برابر کرتا رہے، یہاں تک کہ وہ راگوں اور راگنیوں کی ایک بہت بڑی تعداد جو بہرحال محدود ہی ہوگی، معلوم کرلے۔ اب وہ اپنے راگوں اور راگنیوں کو یاد کرلیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہر راگ کے کیا اصول و احکام ہیں، اور اُن میں سے ہر ایک کی کیا خاصیت ہے۔ اور نیز ایک راگ کو دن کے کس حصّے میں اور کس مجلس میں گایا جائے اور دوسرے کو دن کے کس حصّہ میں اور مجلس میں۔ الغرض اس طرح راگوں اور راگنیوں کا یہ سلسلہ بے نہایت حد تک چلا جاتا ہے اب فرض کیا اگر اس موسیقار کی عمر ابد تک ممتد ہو جائے تو ظاہر ہے اس شخص کی راگوں کے معاملہ میں یہ تجوبہ کاری کبھی ختم ہونے میں نہیں آئے گی۔

قصہ مختصر، نوع انسانی کے اُس مثالی پیکر سے جو عالمِ مثال میں قائم ہے، اس طرح افراد انسانی ظاہر ہوئے اور اس طرح وہ الگ الگ استعدادوں اور قوتوں کے مالک بنے۔ چنانچہ ان افراد انسانی

میں سے بعض ذہین ہیں اور بعض کُند ذہن ، اور بعض اُن میں سے پاک نفوس رکھتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہُوا کہ حظیرۃ القدس[1] میں ان افراد کی ہمتیں ، ان کے نفوس اور ان کی انسانیت کا جوہر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہُوا۔ چنانچہ وہاں یہ سب کے سب افراد اس طرح ہو گئے جیسے کہ یہ ایک چیز ہیں۔ اور ان پر ایک ہی نام صادق آتا ہے ، اور ان تمام کے تمام کا ایک ہی طرف انتساب ہے۔ حظیرۃ القدس میں ان سب کے ایک ہونے کا "انسانِ الٰہی" نام رکھا گیا ہے۔ اور حظیرۃ القدس میں اُن کے اس طرح ایک ہونے کا نیتجہ ہے کہ ہم مختلف افرادِ انسانی کو باوجود اُن کے باہمی اختلافات کے ان معاملات اور ادراکات میں ایک دوسرے سے قریب پاتے ہیں۔ چنانچہ یہی وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی تدلّی اعظم کا نزول ہوتا ہے۔ اور یہی چیز ہے جو عالمِ مثال میں اُن کے لئے "قدم صدق[2]" اور ان کے پروردگار

---

[1] حظیرۃ القدس۔ تمہیں کہیں یہ گمان نہ گزرے کہ جس مقام کو ہم حظیرۃ القدس کہہ رہے ہیں، شاید وہ بنی آدم سے کئی مسافت دُور ہوگا، یا وہ اس دُنیا سے کہیں کسی بلندی پر یا کسی اُور طرف واقعہ ہوگا۔ بات یہ نہیں ہے۔ بلکہ در اصل حقیقت یہ ہے کہ حظیرۃ القدس اور بنی آدم میں اگر فرق و تفاوت ہے تو صرف مرتبہ کا ہے۔ بُعدِ مسافت کا نہیں۔ اور حظیرۃ القدس کو ہم سے وہی نسبت ہے جو روح کو جسم سے ہوتی ہے۔
چو جاں اندر تن و تن جاں ندیدہ"
ہمعات کا اُردو ترجمہ (مترجم)

[2] اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف۔ "اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ"۔ سورہ یونس ۔ ۲ ۔ (مترجم)

کی طرف سے "مقامِ معلوم" کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

اب ہوتا یہ ہے کہ نفوسِ انسانی جب کبھی اپنی حیوانی عادات کی آلودگیوں اور جسم کی شہوانی کیفیات سے تجرد اختیار کرتے ہیں تو وہ فوراً ہی حظیرۃ القدس کی طرف جھپک لئے جاتے ہیں۔ اور وہاں خدا تعالیٰ کے جلال کی بجلی چمکتی ہے، جس سے ان لوگوں کے ہوش گم ہو جاتے ہیں۔ اور یہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ اُن کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ انہیں اس بات کی سُدھ بُدھ نہیں رہتی کہ وہ کہاں سے آئے، اور کہاں جائینگے۔ اور جہاں سے وہ آئے تھے، اُن کے واپس لوٹنے کی وہاں کوئی تدبیر ممکن بھی ہے یا نہیں۔ اِس مقام پر ان لوگوں کی یہ حالت دیکھ کر تدبیر الٰہی اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ تدلّی جو بندوں کو اُس تک پہنچانے کا ذریعہ بنتی ہے ان کی طرف حرکت کرے۔ چنانچہ یہ تدلّی نیچے اُترتی ہے۔ اور مشخص اور متعین ہوتی ہے، اور اس تشخص اور تعین کی وجہ سے ان لوگوں کے لئے اس تدلّی کا قُرب اور اس کے رنگ میں رنگا جانا ممکن ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس تدلّی کا مختلف صورتیں اختیار کرنا اُن خارجی حالات و مقتضیات کا نتیجہ ہوتا ہے، جن میں یہ تدلّی متشخص اور متعین ہوتی ہے۔ تدلّی کی ان صورتوں میں سے ایک نبوت ہے۔

نبوت کی حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں جب لوگ آپس میں مل کر

لہ اشارہ ہے سورۂ "الصافات" کی آیت ۱۶۴ کی طرف۔ "وَمَا مِنَّا اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ" (مترجم)

رہتے ہیں، تو اُن میں جو کامل تر، عاقل تر اور قابل تر ہوتا ہے، وہ اُن لوگوں پر جو اُس سے تدبیرِ منزل اور سیاستِ اجتماعی میں کم درجے کے ہوتے ہیں، حکومت کرتا ہے۔ یہ رجحان انسانوں کی طبیعت میں داخل ہے۔ اور یہ گویا اُن کی عادت سی بن گئی ہے۔ چنانچہ جس طرح لوگوں کو کھانے، پینے، اوڑھنے پہننے، گھر بنانے اور مل جُل کر رہنے کی اجتماعی ضرورتوں کا احساس ہوتا ہے، اسی طرح وہ اس فطری رجحان کو بھی اپنے دلوں میں بغیر کسی تکلّف کے موجود پاتے ہیں۔ اور یہ چیز مرنے کے بعد برزخ اور معاد میں بھی اُن کے ساتھ رہتی ہے۔ چنانچہ انسانوں کی یہی وہ فطری خصوصیّت ہے، جو تدلّیِ الٰہی کو ایک جسمانی صورت دینے کا باعث بنتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ لوگوں میں سے ایک شخص آگے بڑھتا ہے اور وہ اُن کا پیشوا بنتا ہے۔ اور سب اُس کی راہ پر چلتے ہیں۔ اور یہ جو تدلّی کی جسمانی صورت ہوتی ہے، اس میں رُوحِ الٰہی پھونکی جاتی ہے، اور اُس سے خیر و برکت کا ظہور ہوتا ہے۔ الغرض یہ ہے شکل نبوت اور رسالت کی۔

نبوّت سے یہاں میری مُراد اُس نبوّت سے ہے، جو لوگوں کی قیادت، اُن کی رہنمائی، اُن سے بحث و جدل اور اُن کو مسخّر کرنے کے متعلق ہے، نہ کہ وہ نبوّت جس سے فقط علوم کا فیضان ہوتا ہو۔ اور گو بالواسطہ اُس سے لوگ مطیع بھی ہو جاتے ہوں۔ اور اس نبوّت سے میری مُراد یہاں وہ نبوّت بھی نہیں جو سب پر جامع اور سب لوگوں کیلئے بطور شاہد[1] کے

---

[1] اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف۔ "وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِم مِّنْ أَنفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ" (مترجم)

ہوتی ہے۔ جیسے کہ ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تھی۔

تدلّی الٰہی کی ایک صورت نماز ہے، اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کے اندر اخلاق و اطوار کی جو نفسی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ اُن میں سے ہر نفسی کیفیت کا خارج میں کوئی نہ کوئی عملی مظہر ہوتا ہے۔ اور یہ عملی مظہر ہی اس عالم محسوس میں اُس خُلق کی نفسی کیفیت کا مادّی قائم مقام بن جاتا ہے۔ اب اخلاق انسانی کے یہ عملی مظاہر ذریعہ بن جاتے ہیں نفس میں ان اخلاق کی باطنی کیفیات کی تربیت کا۔ چنانچہ اگر تعریف ہوتی ہے تو ان عملی مظاہر[ل] کی، اور مذمت کی جاتی ہے تو اِن کی۔ اور ذکر ہوتا ہے تو ان عملی مظاہر کا، اگرچہ اصل مقصود یہ عملی مظاہر نہیں، بلکہ وہ نفسی کیفیات ہوتی ہیں، جن کے یہ اعمال خارج میں مظہر بنتے ہیں۔ الغرض نفس کے ان باطنی اخلاق کی بجائے خارج میں اُن کے قائم مقام ظاہری اعمال کا ذکر کرنا انسانوں کی طبیعت میں داخل ہو گیا ہے، اور یہ گویا اب ان کی ایک عادت سی بن گئی ہے۔ اور اُن کے ذہنوں میں اچھی طرح سے راسخ ہو گئی ہے۔

انسانی زندگی کی اس حقیقتِ واقعی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ کیا کہ انسانوں کے اخلاق میں سے ایک خُلق، اُن کی نفسی کیفیات میں سے

[ل] مثال کے طور پر نماز کو لیجئے۔ قیام، رکوع، تشہد اور سجود سے اصل مقصود نفس کے اندر خدا تعالیٰ کے لئے عجز و نیاز کی کیفیت کا پیدا کرنا ہے لیکن یہ اعمال اس نفسی کیفیت کے قائم مقام بن گئے ہیں۔ اسی طرح روزے، زکوٰۃ اور حج کو لیجئے، ان کے ظاہری اعمال بھی فی الحقیقت باطنی کیفیات کے لئے بطور ایک ذریعہ کے ہیں۔ (مترجم)

ایک کیفیت اور اُن کی رُوحوں کے رنگوں میں سے ایک رنگ، اور خاص طور پر وہ جو حظیرۃ القدس کے "مقامِ معلوم"[۱] میں انسانوں کے رنگے جانیکا رنگ ہے، انتخاب فرمایا۔ اس خُلق، اس باطنی کیفیت اور اس رُوحانی رنگ سے میری مُراد "احسان" کی صفت یعنی خدا تعالیٰ کی جناب میں خشوع و خضوع اور انسان کی طبیعت کا نفس کی تاریک اور فاسد کیفیات سے پاک ہونا ہے اس خُلق "احسان" کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان میں اُس وقت بھی موجود رہتا ہے، جب کہ اُس کا نفس حیوانیت سے امتزاج رکھتا ہو۔ اور گو اصل میں یہ خُلق حظیرۃ القدس کے بلند مرتبہ "مقام معلوم" سے سب سے زیادہ مشابہ ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو یہ خُلق گویا خود حظیرۃ القدس کا "مقام معلوم" بن جاتا ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح کہ انسان کا بدن کلیتۃً اُس کے نفس کا مرادف بن جاتا ہے۔ قصہ مختصر، اللہ تعالیٰ نے انسان کے تمام اخلاق میں سے اُس کے اِس خُلق "احسان" کو انتخاب فرمایا۔ اس کے بعد اُس نے وہ اقوال اور افعال منتخب فرمائے جو اس خُلق کی ترجمانی کرتے اور اس کے قائم مقام ہو سکتے ہیں، یہاں تک کہ اُن اقوال اور اعمال پر اس خُلق کا پوری طرح انطباق ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اِن اقوال اور افعال کو مرادف اور قائم مقام قرار دیا اُس خُلق کا۔ گویا یہ اِقوال و اعمال بعینہٖ یہ خُلق بن گئے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز کے افعال اور اقوال ترجمان اور قائم مقام ہیں نفس انسانی کے

---

[۱] اس کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔ دیکھئے صفحہ ۸۲

اُس باطنی خُلق کے جسے "احسان" کہتے ہیں۔ اور یہ خُلق "احسان" نمونہ ہے حظیرۃ القدس کے "مقامِ معلوم" کا جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور حظیرۃِ القدس کا یہ "مقامِ معلوم" ایک صورت ہے اللہ تعالیٰ کی تدلّی کی

تدلّی الٰہی کی ایک صورت آسمانی کتابیں ہیں۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسانوں کو پہلے پہل جب یہ ضرورت پیش آئی کہ اُن کے ہاں جو علوم و اخبار مروّج ہیں، وہ زمانہ دراز تک محفوظ رہ سکیں، اور دُور دُور ملکوں والے بھی ان سے استفادہ کر سکیں تو الہام کے ذریعہ اُنہیں کتابوں کو لکھنے اور رسالوں کو مدوّن کرنے کی تعلیم دی گئی۔ اس میں مصلحت یہ بھی تھی کہ مصنّف کی اصل تحریر بجنسہٖ محفوظ رہ سکے، اور اس میں نہ تو کوئی بھول واقع ہو، اور نہ اُس کے معانی کی غلط روایت ہو سکے۔ الغرض آگے چل کر کتابوں کو لکھنے اور رسالوں کو جمع کرنے کا رواج لوگوں میں خوب پھیل گیا، اور ان حالات میں جب اللہ کی تدلّی حرکت میں آئی تو لامحالہ اُس وقت لوگوں کا جو دستور بن چکا تھا، اُسی کے مطابق اِس تدلّی نے صورت اختیار کی۔ چنانچہ ہُوا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس امر کا مقتضی ہُوا کہ رسول ایسی تجلّیات سے بہرہ یاب ہو جو اُسے عالمِ بشریت سے اُچک کر حظیرۃ القدس میں پہنچا دیں۔ اور اس طرح ملاءِ اعلیٰ کے علوم، ملاءِ اعلیٰ کی طرف سے انسانوں کو اُن کے ناپاک شبہات کے جوابات، رحمتِ الٰہی کے ارادے، اور وہ الہاماتِ خیر جو لوگوں کے دلوں میں ہیں، یہ سب رسول کے ادراک میں تلاوت کی جانے والی وحی کی شکل میں قرار پذیر ہو جائیں۔

الغرض یہ ہے شانِ نزولِ الہامی کتابوں کے وجود میں آنے کا۔ اس سلسلہ کی پہلی کتاب تورات ہے۔ تورات سے پہلے جو صحف تھے، وہ اُن علوم پر مشتمل تھے جن کا نبی کے قلب پر فیضان ہوا تھا، اور نبی کے بعد اُس کی اُمت میں سے کسی فرد نے جس کے کہ جی میں آیا، ان علوم کو صحیفوں میں مدوّن کر دیا۔

تدلّی الٰہی کی صورتوں میں سے ایک صورت "ملت" کی ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسانوں کو فطرت کی طرف سے یہ الہام ہُوا کہ وہ آپس کے تعلقات کو اُستوار رکھنے کے لئے دستور اور قواعد بنائیں۔ اس الہام کی بنا پر اُنہوں نے شہری زندگی کے قاعدے بنائے، خانہ داری کے طریقے وضع کئے، معاشی اور کاروباری دستور مرتب کئے۔ چنانچہ اجتماعی زندگی کے لئے قواعد اور دستور بنانے کی یہ عادت اُن کی فطرت کا اصل الاُصول بن گئی۔ اور اِس کا شمار اُن کے ہاں ضروری علوم میں سے ہونے لگا۔ جب یہ چیز لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو گئی تو اس کے بعد ایسا ہُوا کہ اللہ تعالےٰ نے نبی کے قلب کو یہ قابلیت بخشی کہ اُس میں اللہ تعالیٰ کا تعلیم کردہ دستور جگہ پکڑ سکے۔ اس دستور میں اللہ تعالیٰ کی رُوح ہوتی ہے اور اس میں برکت اور نور ہے۔ یہ ہے اللہ کی شریعت، اور اس کا نام "ملت" ہے۔

تدلّی الٰہی کی ایک صورت "بیت اللہ" ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے لوگ عبادت گاہیں اور معبد بناتے تھے۔ اُنہوں نے اُس زمانے میں جب کہ آفتاب کی رُوحانیت کا غلبہ

تھا، آفتاب کے نام پر عبادت گاہیں بنائیں۔ اور اسی طرح اور اسی خیال کے ماتحت ماہتاب اور دوسرے ستاروں کے نام سے معابد بنائے گئے۔ اُس زمانے میں ان لوگوں کا اعتقاد یہ تھا کہ جو شخص ان معابد میں داخل ہوتا ہے، وہ ان کواکب کا جن کے نام پر یہ معابد ہیں، مقرب بن جاتا ہے۔ الغرض اس طرح کے معابد اور کنیسے بنانا اُن کے ہاں ضروری امور میں سے قرار پایا۔ چنانچہ اس کے پیش نظر وہ اس بات کو ایک امر محال سمجھنے لگے کہ کسی مجرد شئے کی طرف جب تک کہ اُس کے لئے کوئی خاص جہت اور موضع و محل معین نہ کر دیا جائے، توجہ کی جا سکتی ہے۔ اس زمانے میں حضرت ابراہیم مبعوث ہوتے ہیں۔ اور اُن کے زمانے کا جو دستور اور طریقہ تھا، اُس کے مطابق اُن کے قلب پر اللہ تعالیٰ کے لئے معبد بنانے کا القا ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مخصوص جگہ جو اُنہوں نے اس معبد کے لئے مناسب سمجھی، اُس کا انتخاب کیا۔ اس جگہ کی خصوصیت یہ تھی کہ افلاک اور عناصر کی قوتوں کا تقاضہ تھا کہ اس جگہ کو بقائے[1] دوام حاصل ہو۔ اور لوگوں کے دل اس طرف خود بخود کھنچے چلے آئیں۔ اب اس معبد کی تعظیم و احترام کے سلسلہ میں قاعدے اور دستور مقرر

---

[1] گزشتہ زمانوں میں جب کسی نئے شہر کی بنیاد رکھی جاتی تھی تو نجومیوں سے اُس کے محل وقوع کے متعلق اور جس مبارک ساعت میں اس کی بنا پڑتی تھی، اُس کے بارے میں استصواب کر لیا جاتا تھا۔ تاریخوں میں بغداد اور قاہرہ کی تاسیس کے ضمن میں اس قسم کی روایات بڑی تفصیل سے ملتی ہیں۔ مترجم

ہوتے۔ اور تدریجی الٰہی کے ذریعہ ان قاعدوں کو مناسک حج کی صورت میں لوگوں کے لئے واجب کر دیا گیا۔

اس ضمن میں تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ شریعتوں کے احکام و قواعد کی تشکیل لوگوں کی عادات کے مطابق ہوتی ہے۔ اور اس بات میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ جب کسی شریعت کی تشکیل ہونے لگتی ہے تو اُس وقت اللہ تعالےٰ لوگوں کی عادات پر نظر ڈالتا ہے۔ اب جو عادتیں بُری ہوتی ہیں اُن کو تو ترک کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اور جو عادتیں اچھی ہوتی ہیں، اُن کو اپنے حال پر رہنے دیا جاتا ہے۔ یہی کیفیت "وحی متلو" یعنی وہ وحی جس کے الفاظ کی تلاوت کی جاتی ہے، کی ہے۔ یہ وحی اُن الفاظ، کلمات، اور اسالیب میں جو خود صاحب وحی کے ذہن میں پہلے سے محفوظ ہوتے ہیں، صورت پذیر ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عربوں کے لئے اللہ تعالےٰ نے عربی زبان میں وحی کی۔ اور سریانی بولنے والوں کے لئے سریانی میں۔ اور اسی قبیل سے رویائے صالحہ اور سچے خواب ہیں۔

رویائے صالحہ اور سچے خوابوں کی کیفیت یہ ہے کہ خواب دیکھنے والے کے ذہن میں جو جو صورتیں اور خیالات پہلے سے محفوظ ہوتے ہیں، وہ اُنہیں کے لباس میں خوابیں دیکھتا ہے چنانچہ اسی بنا پر جب مادر زاد اندھا خواب دیکھتا ہے تو اُس کو خواب میں رنگ اور شکلیں دکھائی نہیں دیتیں، بلکہ وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ چیزوں کو چھو رہا ہے۔ یا اُن کی آوازیں سُن رہا ہے۔

یا وہ خواب میں چیزوں کو چکھتا اور سونگھتا ہے۔ اور یا وہ اُن کے متعلق خیال آرائی کرتا ہے۔ اسی طرح جو شخص پیدائشی بہرہ ہے، وہ خواب میں کبھی آواز نہیں سنتا، بلکہ اُس کا خواب صرف دیکھنے، چھُونے اور اس طرح کے دوسرے ذرائع علم تک محدود رہتا ہے۔ اور اگر اس معاملے میں مزید تحقیق چاہتے ہو تو سنو! عالمِ غیب سے جب کوئی فیضان ہوتا ہے، خواہ یہ فیضان روزمرہ کا سا عام فیضان ہو یا یہ فیضان اعجاز اور خارق عادت کی نوعیت کا ہو، بہرحال یہ فیضان محلِ فیضان کی جو ضروری خصوصیات ہوتی ہیں اُنہیں کے لباس ہی میں صورت پذیر ہوتا ہے۔ اور یہی خصوصیات ہی ایک فیضان کو دوسرے فیضان سے جُدا کرتی ہیں۔

مثال کے طور پر گھوڑے کو دیکھئے۔ گھوڑے کی جو بھی ذاتی خصوصیات ہیں، وہ سب کی سب گھوڑے کی جنس میں موجود ہیں۔ اب گھوڑا چار ہاتھ لمبا ہو سکتا ہے، اور اس سے قدرے زیادہ بھی اور کچھ کم بھی۔ غرضیکہ گھوڑے کا کم و بیش چار ہاتھ لمبا ہونا خود اُس کی اصل جنس میں داخل ہے۔ اسی طرح اب ایک نوع کی خصوصیات کو لو، جو ایک نوع کو دوسری نوع سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ نوعی خصوصیات بھی خود اس نوع کی اصل جنس میں داخل ہوتی ہیں۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ ہر فیضانِ غیبی کی جو بھی اپنی مخصوص صورت اور وضع ہوتی ہے۔ اگر اُس مخصوص صورت اور وضع کا سبب ڈھونڈنا چاہو تو وہ تمہیں اُس محل کی خصوصیات میں ملے گا۔ جہاں کہ یہ فیضان واقع ہوا۔

اس مبحث میں اب ایک مسئلہ باقی رہ گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ فیضانِ علمی کی مختلف نوعیتوں کے الگ الگ صورت پذیر ہونے کا توانحصار اس پر ہے کہ محلِ فیضان میں کون سی خصوصیات ممکن اور مقدّر ہیں۔ لیکن جہاں تک تدلّی اور شعائر کے ظہور کا تعلق ہے، تو لوگوں کے جو مسلّمات ہوتے ہیں۔ اور جو چیزیں اُن کے ہاں مشہور ہوتی ہیں اور لوگوں کے دل اُن سے مطمئن ہوتے ہیں، تدلّی اور شعائر اُن چیزوں کی صورت ہی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی تدلّی کا ظہور ہوتا ہے، لوگوں کے مسلّمات ہی اُس کے نزول کا ذریعہ بنتے ہیں، اور ایسا کیوں نہ ہو۔ آخر تدلّی سے اللہ تعالیٰ کا مقصد تو یہی ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ جہاں تک کہ اُن سے ہو سکے، اُسی کی اطاعت کریں اور اپنے اعضاء و جوارح کو اعمالِ اطاعت کا عادی بنائیں۔ اور اس لئے ضروری ہے کہ تدلّی لوگوں کے لئے جو مانوس صورتیں ہیں اُن میں ظاہر ہو۔

ہاں اس ضمن میں یہ ہو سکتا ہے کہ جہاں حالات و اسباب اس امر کے متقاضی ہوں کہ ایک دس ہاتھ کا انسان ظاہر ہو، وہاں ایک دس ہاتھ کا انسان وجود میں آجائے۔ بے شک یہ چیز ممکن ہے، لیکن ایسا ہونا مانوس اور معروف نہیں ہوتا کہ لوگ اس سے مطمئن ہو جائیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ تدلّیاتِ الٰہی اور شریعتیں ہمیشہ لوگوں کے مسلّمات اور جو چیزیں کہ اُن کے ہاں مشہور ہوتی ہیں، اُن کے موافق ہی صورت پذیر ہوتی ہیں۔ بیشک اس سلسلہ میں اتنا ضرور ہوتا ہے کہ اس تدلّی کی وجہ سے اِن چیزوں میں پہلے

کے مقابلہ میں مزید خیر و برکت پیدا ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ یہی سچ کو جھوٹ سے اور حق کو باطل سے تمیز کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے ۔

ممکن ہے تمہارے دل میں یہ خیال گزرے کہ ہر تدلی کا خارق عادت اور اعجاز ہونا ضروری ہے ، اس لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تدلی لوگوں کے مسلمات کے مطابق ہو ۔ اس معاملے میں ہماری رائے یہ ہے کہ بس اس مجمل اور پیچیدہ بات پر رُک کر نہ رہ جاؤ بلکہ اس مسئلے کی پوری تحقیق کرو ۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر چیز کا صدور اپنی اصل عادت ہی کے مطابق ہوتا ہے چنانچہ وہ کبھی اپنی عادات سے تجاوز نہیں کرتی ۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریش کا مطالبہ تھا کہ رسول بشر نہ ہو بلکہ فرشتہ ہو ۔ لیکن رسول فرشتہ نہیں ہو سکتا تھا ، اور اسی طرح نہ قرآن مجید عجمی زبان میں اور نہ بیت اللہ نور کا ہو سکتا تھا ۔ کیوں ؟ اس لئے کہ ایسا ہونا ان چیزوں کی عادت کے خلاف تھا ۔ ہاں اس سلسلے میں یہ ضرور ہوا کہ ان چیزوں کا خارق عادت ہونا دراصل اس غیر معمولی خیر و برکت کے لحاظ سے تھا ، نہ کہ اس وجہ سے کہ ان چیزوں میں خلاف عادت کوئی تبدیلی ہو گئی ہو ۔ اور اس معاملے میں قریش مکہ کا قصور یہ تھا کہ وہ ان دو چیزوں میں یعنی ایک چیز کا اعجاز اور اُس کا خارق عادت ہونا بلحاظ خیر و برکت کے اور اُس کا اعجاز و خرقِ عادت اس حیثیت سے کہ یہ چیز خلافِ عادت ظاہر ہوتی ہے ان میں جو فرق ہے اُس کی حکمت کو وہ نہ سمجھ سکے ۔ اور اسی ناسمجھی کی بنا پر اُن کی یہ خواہش تھی کہ رسول انسان کی بجائے فرشتہ ہو ۔ اور نیز انہیں اس بات پر تعجب ہوتا

تھا کہ یہ کیسا رسول ہے، جو عام آدمیوں کی طرح کھاتا پیتا اور گلیوں بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالٰے نے اُن کی اِن باتوں کی اور اِس معاملہ میں اُن کے جو فاسد عقائد تھے، اُن کی تردید فرمائی۔

واقعہ یہ ہے کہ رسول کے غالب آنے کی یہ صورت نہیں ہوتی کہ اُس کے ساتھ فرشتہ ہو جو اس امر کی شہادت دے کہ یہ رسول سچا ہے۔ نہ رسول کے برحق ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُس کے لئے آسمان سے کوئی کتاب اُترے، اور لوگ اپنی آنکھوں سے اس کو اُترتا دیکھیں جیسا کہ خُدا تعالٰے نے سورۂ "الفرقان" میں اور دوسری جگہ اس کی صراحت فرمائی ہے۔ بلکہ جس طرح بادشاہ جہاد اور جنگ کے ذریعہ اپنے مخالفوں پر غالب آتے ہیں۔ یہی صورت رسول کے غلبے کی بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک طے شدہ امر ہے۔ اور خود ہمارا وجدان بھی اس کی شہادت دیتا ہے۔ اور ہم نے خود کتاب و سنّت کو اس امر کی اور نیز اس امر سے جو اور شاخیں پھوٹتی ہیں؛ اور پھر نہ صرف اس مسئلے میں بلکہ اس کے علاوہ اور بہت سے مسائل میں وضاحت کرنے والا پایا ہے۔ بس اللہ ہی کے لئے تعریف ہے اوّل میں بھی اور آخر میں بھی۔

---

[1] وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ

پانچواں مشاہدہ

ملاء اعلیٰ[1] کی طرف سے میرے دل میں بڑے بڑے اسرار القا کئے گئے چنانچہ ان اسرار سے میرا نفس اور نسمہ بھرپور ہو گیا۔ اب میں یہاں ان اسرار کو تمہارے لئے بیان کرتا ہوں۔ تمہیں چاہئے کہ ان اسرار کو خوب مضبوط پکڑو جیسے کہ کوئی چیز دانتوں سے پکڑی جاتی ہے۔

اگر تمہاری خواہش ہو کہ تمہیں ملاء اعلیٰ کے فرشتوں[2] کا جو آپس میں بحث مباحثہ کرتے ہیں، کمال حاصل ہو تو اس کے لئے سوائے اس کے کہ تم دعا

---

[1] اشارہ ہے ترمذی اور دارمی کی اُس حدیث کی طرف جس کا ترجمہ یہ ہے "میں نے اپنے رب کو اچھی صورت میں دیکھا۔ میرے رب نے کہا کہ اے محمدؐ! ملاء اعلیٰ کے فرشتے کس بات میں جھگڑتے ہیں۔ میں نے کہا، آپ بہتر جانتے ہیں۔ پس اُس نے اپنا ہاتھ میرے کاندھوں کے درمیان رکھا۔ اور اُس کی وجہ سے میں نے اپنے سینہ (باقی حاشیہ صفحہ ۱۹۶ پر)

کرو، اور کثرت سے اپنے رب کی جناب میں عاجزی کرو۔ اور اُس سے
اپنے پُورے ارادے اور پوری دلی ہمت سے سوال کرو، اور کوئی تدبیر نہیں
اور اس ضمن میں یہ اور بھی بہتر ہے کہ تمہارا یہ سوال کسی ایسی چیز کے متعلق
ہو جس کو حاصل کرنے کے لئے تمہارے اندر عقلاً اور طبعاً دونوں لحاظ سے بڑا
اشتیاق پایا جاتا ہو۔ اور پھر یہ چیز جس کا تم سوال کر رہے ہو، خود تمہارے
لئے اور نیز دوسرے لوگوں کے لئے ترقی و تکمیل ذات کا باعث ہو۔ اور اس
سے عام خلق اللہ کو بھی آرام و آسائش پہنچ سکتا ہو۔ الغرض اللہ تعالےٰ سے
ایسی چیز کے سوال کے لئے جب تمہارے اندر دُعا کا ملکہ راسخ ہو جائے
اور تم یہ بھی جان لو کہ اللہ تعالےٰ سے اس چیز کے لئے کس طرح خلوص
ہمت سے دعا کی جاتی ہے، تو اُس وقت تم سمجھ لو کہ تم ملاء اعلیٰ کے زمرہ
میں منسلک ہو گئے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں کہ
"جس کے لئے دُعا کا دروازہ کھُلا، گویا اس کے لئے جنت اور رحمت کا دروازہ
کھُل گیا" یا اس ارشاد سے ملتا جلتا کہیں اور جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، تو گویا
اس میں آپؐ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ تو ملاء اعلیٰ کے کمال کے حصول کا طریقہ ہوا۔ اب اگر کوئی شخص ملاء

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۵) میں ٹھنڈک پائی۔ اور جو کچھ آسمانوں اور زمینوں کے درمیان ہے
مَیں نے اُن سب (اسرار و حقائق) کو جان لیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے " کَذٰلِکَ نُرِیْٓ اِبْرٰہِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
لِیَکُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ " آیت تلاوت فرمائی۔ مترجم

سافل کے فرشتوں کا کمال حاصل کرنا چاہے تو اس کی یہ صورت ہے کہ وہ سختی سے طہارت کی پابندی کرے۔ اور وہ اُن قدیم مسجدوں میں جائے، جہاں کہ اولیاء کی جماعتوں نے نمازیں پڑھی ہوں۔ اور وہ کثرت سے نمازیں پڑھے۔ کتاب اللہ کی تلاوت کرے۔ اور اللہ کے کُل اسمائے حسنہ کا یا اُن میں سے جو چالیس اسماء مشہور ہیں، اُن کا ذکر کرے۔ یہ سب چیزیں جو اوپر بیان ہوئیں، اس مقصد کے لئے جس کے حصول میں وہ کوشاں ہے، ایک رُکن کا درجہ رکھتی ہیں۔ اور اس سلسلہ کا دوسرا رُکن یہ ہے کہ وہ اہم معاملات کے لئے کثرت سے استخارے کرے۔ اور استخارے کے دوران میں وہ اپنے نفس کو اس ڈھب پر رکھے کہ گویا اُس کے لئے اس کام کا کرنا یا اُسے ترک کر دینا برابر ہے۔ اس کے بعد وہ شخص اللہ تعالیٰ سے جو کام کہ اُس کے پیش نظر ہے، اُس کی وضاحت چاہے کہ آیا مصلحت کام کرنے میں ہے یا اُس کو ترک کرنے میں، چنانچہ اس غرض کے لئے وہ پاک اور طاہر ہو کر بیٹھے اور اُسے پوری دل جمعی نصیب ہو۔ اور اس حالت میں وہ اس بات کا برابر منتظر رہے کہ کام کرنے یا اُسے ترک کرنے کے بارے میں اُس کے دل کو ان دونوں میں سے کس جانب انشراح ہوتا ہے۔ الغرض جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے ملاء سافل کے فرشتوں کا یہ کمال عطا فرما دیا، تو اُس نے گویا تازہ

اور طہارت کے نور کی حقیقت کو پالیا۔ چنانچہ اس شخص کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب کبھی اُسے نماز میں دیر ہو جاتی ہے یا اُس پر ناپاکی اور کثافتوں کا ہجوم ہوتا ہے تو اُس کے حواس میں طرح طرح کے رنگ اور آوازیں بھر جاتی ہیں۔ اور اس سے اُس کے اندر ایک ایسی حالت پیدا ہوتی ہے۔ جس کو وہ سمجھتا اور جانتا ہے، اور اس حالت سے اُس کو اذیت ہوتی ہے۔ اور اُس کی طبیعت اس سے متنفر رہتی ہے۔ لیکن اس کے بعد جب وہ خوب پاک صاف ہوتا ہے، کثرت سے نمازیں پڑھتا ہے۔ اور اپنے جملہ حواس کو ذکر میں لگا دیتا ہے، تو ان اعمال سے اُس کے اندر ایک اور کیفیت پیدا ہوتی ہے اور وہ اس کیفیت کو جانتا اور پہچانتا ہے اور اس کے اچھا ہونے کو محسوس کرتا ہے اور اس کیفیت سے اُسکے دل میں کشائش پیدا ہوتی ہے۔

الغرض جو شخص ناپاکی اور کثافتوں کے ردِّعمل سے نفس میں جو کلفت آمیز حالت پیدا ہوتی ہے اور نیز پاکیزگی اور نماز و ذکر سے نفس میں مسرت کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، ان ہر دو کو جان جاتا، اور ان میں ہر ایک کو ایک دوسرے سے تمیز کر سکتا ہے، تو وہ شخص صحیح معنوں میں مومن ہے اور اس مومن کی صفتِ ایمان کو "احسان" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسمیں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ جس شخص نے دعا و ذکر کے ضمن میں کیفیت حضوری کو جان لیا۔ خواہ وہ اس کیفیتِ حضوری کو الفاظ حروف اور خیالات سے یکسر مجرد کر کے نہ دیکھ سکے، تو اس نے باب "احسان" کا جو اہم جزو تھا، اُس کو پورا کر دیا۔

چھٹا مشاہدہ

۱۱۴۲ھ ماہ صفر کی دسویں تاریخ کو مکہ معظمہ میں میں نے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو خواب میں دیکھا کہ وہ میرے گھر میں تشریف لائے ہیں۔ اور حضرت حسن رضؓ کے ہاتھ میں ایک قلم ہے، جس کی کہ نوک ٹوٹی ہوئی ہے۔ آپ نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ وہ مجھے یہ قلم عطا فرمائیں۔ اور فرمایا کہ یہ میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلم ہے۔ اس کے بعد آپ نے قدرے توقف کیا اور فرمانے لگے کہ ذرا ٹھہر جاؤ تاکہ حسین رضؓ اس قلم کو ٹھیک کردیں۔ کیونکہ اب یہ قلم ویسا نہیں ہے جیسا کہ پہلے تھا جب کہ حسین رضؓ نے اس کو ٹھیک کیا تھا۔ چنانچہ حضرت حسین رضؓ نے اُن سے یہ قلم لیا، اور اُسے ٹھیک کرکے مجھے عطا فرمایا۔ مجھے اس سے بیحد خوشی ہوئی۔ اس کے بعد

ایک چادر لائی گئی، جس میں سبز اور سفید رنگ کی دھاریاں تھیں۔ یہ چادر حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے سامنے رکھی گئی حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یہ چادر اٹھائی اور فرمایا کہ یہ چادر میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اس کے بعد آپؓ نے یہ چادر مجھے اوڑھائی۔ اور میں نے تعظیم واحترام کے خیال سے اوڑھنے کے بجائے اُسے اپنے سر پر رکھ لیا۔ اور اس نعمت کے شکرانے میں خُدا تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنے لگا۔ اس کے بعد یک بارگی میری آنکھ کھل گئی ۔

ساتواں مشاہدہ

یہ مشاہدہ، مشاہدۂ عظیم اور تحقیق، تحقیق عالی ہے ــــ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کچھ اُتارا ہے، اُس پر ایمان لانے کی دو قسمیں ہیں۔ اس کی ایک قسم تو یہ ہے کہ ایک آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح اور روشن دلیل دیکھ کر ایمان لائے۔ اور اس ایمان کی دوسری قسم ایمان بالغیب ہے۔ وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح اور روشن دلیل دیکھ کر ایمان لاتا ہے؛ اُس کی مثال تو یوں سمجھیے کہ ایک شخص حاکم کو دیکھتا ہے کہ اُس نے اپنے وزیر کو خلعتِ وزارت پہنائی۔ اور سلطنت کا انتظام اُس کے سپرد کیا۔ اور اُسے لوگوں کی طرف اپنا نائب بنا کر بھیجا۔ اور اس بات کا اعلان بھی کر دیا کہ میں فلاں،

آدمی کو اس منصب پر مقرر کر رہا ہوں۔ الغرض وزیر کو خلعتِ وزارت پہنا کر اور اُسے اس طرح لوگوں کی طرف بھیج کر حاکم نے اس سلسلہ میں کوئی ڈھکی چھپی بات نہ رہنے دی۔ چنانچہ اُس کی طرف سے لوگوں کو اس امر کا مکلّف بنا دیا گیا کہ وہ وزیر کی بات مانیں۔

یہ جو کچھ ہُوا، اس شخص کے رُوبرو ہُوا۔ اور اس نے اپنی آنکھوں سے حاکم کو وزارت کی خلعت پہناتے دیکھا۔ اور اس نے اپنے کانوں سے وزیر کی اطاعت کے بارے میں حاکم کو فرمان دیتے سُنا۔ اب جب کہ اُس نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اپنے کانوں سے سُن لیا تو اس کے بعد جا کر اُس شخص کے دل نے وزیر کو مانا۔ بے شک یہ شخص جب حاکم کی طرف سے وزیر کو وزارت کا منصب دیا جا رہا تھا، اُس موقعہ پر وہاں موجود تھا۔ لیکن وہاں محض موجود ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے یہ شخص وزیر تو نہیں بن گیا۔ اور نہ اس بنا پر یہ شخص اس کا اہل ہو سکتا تھا کہ وہ حاکم کے نام سے لوگوں پر حکومت کرے لیکن اس سے یہ ضرور ہُوا کہ حاکم نے اس کے سامنے جس وزیر کو مقرر کیا تھا، اُس وزیر کو ماننے کے لئے اس شخص کے پاس ایک روشن اور واضح ثبوت فراہم ہو گیا۔ اور وزیر کے احکام کو تسلیم کرنے کے لئے اس شخص کو حاکم کی طرف سے بالمشافہ حکم بھی مل گیا۔

اس کے برعکس ایک اور شخص ہے جو ایمان بالغیب لاتا ہے۔ اُس کی مثال یُوں سمجھئے کہ ایک شخص ہے۔ ۔۔۔۔۔۔

جو خود تو اندھا ہے، لیکن ایک آنکھوں والے نے اُس کو سورج کے طلوع ہونے کی خبر دی اور وہ اس پر یقین لے آیا۔ چنانچہ وہ اپنے دل میں اس خبر کے خلاف کوئی دوسرا خیال نہیں پاتا۔ اور نہ اُسے اس خبر کے بارے میں کوئی ادنےٰ سا احتمال باقی رہا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس اندھے آدمی کا یہ یقین کہ سُورج طلوع ہو چکا ہے، محض اس بنا پر ہے کہ ایک آنکھوں والے نے اُسے بتایا ہے۔ ان حالات میں اِس آدمی کا یقین ظاہر ہے آنکھوں والے کے اعتماد پر منحصر ہو گا۔

افرادِ انسانی میں فردِ کامل وہ ہے جو ایمان کی ان دو قسموں کو اپنے اندر جمع کرلے۔ فردِ کامل کا ذاتِ حق کے ساتھ ایک تو وہ ربط ہوتا ہے، جس میں کہ وہ کسی توسط کو قبول نہیں کرتا۔ اس نوع کے ربط سے فردِ کامل کو وہ تمام علوم حاصل ہو جاتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء پر اُتارے گئے۔ فردِ کامل ان علوم پر یقین رکھتا ہے اور صرف یقین نہیں، بلکہ فردِ کامل کو ان علوم پر پُورا اطمینان بھی ہوتا ہے۔ اور اس بارے میں اُس کے پاس پروردگار کی طرف سے روشن اور واضح دلیل بھی ہوتی ہے۔ ذاتِ حق کے ساتھ فردِ کامل کے اس ربطِ خاص کے یہ معنی نہیں کہ اُس کے پاس اللہ تعالیٰ کا ایک فرمان ہو کہ وہ اس کی حفاظت کرتا رہے۔ اور اُس کو اپنے ہاتھوں میں لئے پھرے۔ بلکہ اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فردِ

کامل کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے۔ اور وہ اُس کو ہر ایک سے بچاتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ اُس کی اس طرح نگرانی اور حفاظت کرتا ہے کہ خود فردِ کامل اس کو محسوس کرتا ہے۔ اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کی اس حفاظت اور نگہداشت سے محروم ہو گیا، تو میرا ٹھکانا جہنم ہے۔ الغرض فرد کامل اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس ربطِ خاص کی بنا پر علوم الٰہیہ کا محقق بن جاتا ہے +

فردِ کامل کے ایمان کی یہ پہلی خصوصیت ہوئی۔ اس کے علاوہ اُس کے ایمان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اُس تدلّی کا بھی حامل ہوتا ہے۔ جو کہ عوام کے لئے ہوتی ہے۔ اور جس کا نقطۂ کمال عبارت ہے "ایمان بالغیب" سے اور نیز شریعت کے قواعد و قوانین کی پابندی سے کہ نبی کے محض بتلانے سے وہ اُن کی بات پر یقین کر لیتا اور مخبر صادق کی پوری پوری فرمانبرداری اور اُس سے پُر خلوص محبّت کرنے لگتا ہے۔ الغرض فرد کامل کی ذات میں یُوں تو ایمان کی یہ دونوں قسمیں جمع ہوتی ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں ہوتا یہ ہے کہ جب دل پر ایمان کی پہلی قسم کے انوار کی بارش ہوتی ہے تو اُس وقت ایمان کی دوسری قسم کے اثرات ظاہر نہیں ہوتے +

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں خانہ کعبہ میں تہجد کی نماز پڑھ رہا تھا کہ پہلی قسم کے انوار میرے باطن میں چمک اُٹھے۔ اور میں اُن کی تاثیر سے اپنے آپ سے بے قابو ہو گیا اور مجھ پر ایک حیرت سی چھا گئی۔

اُس وقت مَیں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اُس سے ایمان بالغیب مفقود ہے۔ میں نے پھر اپنے دل کی طرف توجّہ کی اور اُس میں دوبارہ ایمان بالغیب کو تلاش کیا، لیکن اب بھی مَیں نے اُسے وہاں نہ پایا۔ اس سے مجھے بڑی حسرت ہوئی اور میں ایمان بالغیب کے جانے پر افسوس کرنے لگا۔ لیکن ذرا سی دیر کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ "ایمان بالغیب" میرے دل میں موجود ہے۔ چنانچہ اس سے مجھے اطمینان ہوگیا۔ الغرض یہ واقعہ خود مجھ پر گزرا ہے۔ اب تم اس میں غور و خوض کر کے ایمان بالغیب کی اس حیثیت کو سمجھ لو۔

تحقیق عالی ـــــ جماعت اولیاء میں سے ایک بڑی تعداد ایسے اولیاء کی بھی ہوتی ہے جن کو الہام کے ذریعے یہ القاء کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں سے شرع کی قید اُٹھا دی ہے، اور تمہیں اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ چاہو تو عبادات اور طاعات بجا لاؤ اور چاہو تو بجا نہ لاؤ۔ اس سلسلہ میں والد بزرگوار رضی اللہ عنہٗ نے اپنے متعلق یہ فرمایا کہ خود مجھے ایک دفعہ یہ الہام ہُوا کہ تم سے شرع کی قید اُٹھائی جاتی ہے۔ اور تمہیں اب اختیار ہے کہ چاہو تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور چاہو تو نہ کرو۔ لیکن والد

بزرگوار فرماتے ہیں کہ اس الہام کے بعد میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ التماس کی وہ مجھ سے شریعت کی قیود کو نہ اُٹھائے۔ چنانچہ آپ نے اس معاملہ میں کہ اُن کا جی چاہے تو عبادت کریں۔ اور جی نہ چاہے تو نہ کرے، اوّل الذکر چیز کو اپنے لئے پسند فرمایا۔ اور اس ضمن میں والد بزرگوار کا مسلک یہ تھا کہ اللہ کی مخلوق میں سے کسی شخص سے بھی اگر وہ عاقل و بالغ ہے، شرع کی قیود نہیں اُٹھ سکتیں۔ اور اس معاملہ میں میں نے اُنہیں دیکھا کہ اس الہام کو بھی کہ "تمہیں اختیار ہے کہ چاہو تو عبادت کرو اور چاہو تو نہ کرو" اور اپنے اس مسلک کو بھی کہ کسی بشر سے کسی حال میں اگر وہ عاقل و بالغ ہے، شرع کی قیود اُٹھ نہیں سکتیں، برحق ملنتے تھے اور وہ حیران تھے کہ ان دو متضاد باتوں کو باہم کیسے تطبیق دیں۔

والد بزرگوار کی طرح عمِّ بزرگوار کے متعلق بھی مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ اُنہیں بھی اپنے آپ سے شرع کی قید کو اُٹھا دینے کا الہام ہوا تھا۔ اور اُن سے بھی یہ کہا گیا تھا کہ اگر تم دوزخ کے ڈر سے عبادت کرتے ہو تو جاؤ ہم نے تمہیں دوزخ سے امان دے دی۔ اور اگر تمہاری یہ عبادت جنّت کو حاصل کرنے کے لئے ہے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تمہیں جنّت میں ضرور داخل کریں گے۔ اور اگر اس عبادت سے تمہیں ہماری خوشنودی مطلوب ہے تو جاؤ ہم تم سے ایسے راضی ہوئے کہ اس کے بعد کبھی ناراضگی کی نوبت نہ آئے گی۔

اس کے جواب میں عم بزرگوار قدس سرہ کا بھی اِس معاملہ میں یہی میلان تھا کہ کاملوں سے شریعت کی قیود اُٹھ تو جاتی ہیں۔ لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ ان کاملوں کو خود اپنی طرف سے شرع کا مکلف بنا دیتا ہے۔ اور اس صورت میں ان قیود کے متعلق اُن کے اختیار یا عدم اختیار کا کوئی سوال نہیں رہتا۔

اس طرح کے الہام کا یہ واقعہ بہت سے اور اولیاء کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک اس الہام کی اصل حقیقت یہ ہے کہ قوانین شریعت کو ماننے کے ضمن میں جب کوئی شخص "ایمان بالغیب" سے اُس قسم میں آتا ہے، جہاں کہ روشن اور واضح دلیل کے ذریعہ ان چیزوں کا ایمان حاصل ہوتا ہے تو اُس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ شرعی قیود کو کہیں باہر سے اپنے اوپر عائد کی ہوئی نہیں جانتا، بلکہ وہ اپنے اندر شریعت کی مقرر کی ہوئی طاعات و عبادات کی ضرورت کو اس طرح محسوس کرتا ہے، جیسے کوئی شخص بھوک اور پیاس کو محسوس کرے۔ اور اس میں اِن طاعات و عبادات کو ترک کرنے کی استطاعت نہیں رہتی۔ چنانچہ اس حالت میں اُس شخص کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ طاعات و عبادات اُس پر شریعت کی طرف سے عائد کی گئی ہیں یا نہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ چیزیں خود اُس شخص کی اصل جبلت میں اس طرح داخل ہو جاتی ہیں کہ گویا وہ ان چیزوں کو اپنی جبلت میں ساتھ لے کر پیدا ہوا تھا۔ ایسا یہ دوسری بات ہے کہ

یہ حقیقت اس شخص پر کھلے طور پر منکشف ہو جائے یا اُس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجمالی طور پر یہ خیال ڈال دیا جائے۔ بہر حال اُس شخص پر اس حقیقت کے انکشاف کا کوئی بھی ذریعہ ہو، اصل مقصود تو صرف اتنا ہے کہ اُس شخص کے اندر اجمالی طور پر یا تفصیل سے یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس سے شریعت کی قید اُٹھا دی ہے۔ اور اس کے بعد خود اُس نے اپنی مرضی اور اختیار سے شریعت کے قواعد کو اپنے اوپر عائد کر لیا ہے۔

میرے نزدیک اس طرح کے الہامات میں ضرورت ہوتی ہے کہ خوابوں کی طرح اُن کی تعبیر کی جائے۔ اور ان کی تعبیر کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اُس مقام کو حاصل کرلے، جس کا اقتضاء یہ الہامات ہیں۔ اور اس مسئلہ میں اگر تم مجھ سے اصل حقیقت پوچھتے ہو تو وہ یہ ہے کہ اس طرح کے جو بھی الہامات ہوتے ہیں، وہ سب اپنی جگہ صحیح اور برحق ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک قسم تو اُن الہامات کی ہوتی ہے، جن کا خاص زبان اور خاص مقام سے فیضان ہوتا ہے۔ اور بعض الہامات نیتجہ ہوتے ہیں اُس قضاو قدر کا جو ہر زمانے پر نافذ ہے۔ جہاں تک پہلی قسم کے الہامات کا تعلق ہے اُنکا دائرۂ اثر محدود ہوتا ہے کہ ایک مقام پر انکی اطاعت ضروری ہوتی ہے اور دوسرے مقام پر نہیں لیکن اس قبیل کے الہامات کی جو دوسری قسم ہے، اُنکی ہر حال میں اطاعت ضروری ہے۔ اور نیز اس قسم کے بعض الہامات میں تعبیر کی ضرورت

پڑتی ہے، اور بعض میں نہیں۔ اور ان الہامات کی تعبیر وہ آدمی کرے جو تام المعرفت ہو۔ ان معاملات میں اب تم خوب غور و تدبّر کرو ✦

آٹھواں مشاہدہ

تحقیق عالی اور متعدد مشاہدے ــــــ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ انسانوں کی روحیں جب اپنے بدلوں سے جدا ہوتی ہیں، تو اس سے ایک تو اُن کی بہیمی قوت میں قدرے کمی ہو جاتی ہے اور دوسرے اُن کی ملکی قوت ــــ اور ترقی کر جاتی ہے۔ اور نیز ان روحوں نے اس دُنیا کی زندگی میں جو کمالات حاصل کیے تھے، وہ کمالات ان روحوں کے ساتھ بدن چھوڑنے کے بعد مستقل طور پر ملحق ہو جاتے ہیں۔ ان کمالات کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک تو "نور اعمال" کا کمال ہے۔ اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ انسان کی ملکی قوت جب اُس کی بہیمی قوت کو مجبور کرتی ہے کہ وہ نیک کام کرے تو بہیمی قوت اس کا حکم مانتی ہے۔ اور اپنے آپ کو وہ بالکلیہ اُس کے

تصرف میں دے دیتی ہے۔ اس سے ایک تو قوت ملکیہ میں ایک قسم
کا بسط اور انشراح پیدا ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے اس کی وجہ سے خود
قوت بہیمی بھی ملکی قوت کے مناسب کوئی ہیئت اختیار کر لیتی ہے۔
قوت بہیمی کا ملکی قوت کے رنگ میں اس طرح رنگا جانا دراصل نقطۂ
کمال ہوتا ہے اس قوت بہیمی کا ۔ الغرض اس طرح جب بار بار ہوتا
ہے اور بہیمی قوت پیہم ملکی قوت کے رنگ میں رنگی جاتی ہے تو اس
سے انسان کی ملکی قوت اور بہیمی قوت کے اصل جوہر میں "نورِ اعمال"
کا یہ کمال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور آگے چل کر یہ کمال نفس کے لئے
بمنزلہ ایک عادت اور جبلّت کے بن جاتا ہے، جو کسی حال میں بھی
اُس سے الگ نہیں ہوتا۔

اِن کمالات کی دوسری قسم "نورِ رحمت" ہے۔ اور اس کی تفصیل
یہ ہے کہ انسان جب کوئی ایسا کام کرتا ہے، جس سے کہ اللہ تعالیٰ
خوش ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے اُس شخص پر اپنی رحمت نازل
فرماتا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اس کام سے یا تو تمام انسانوں کی تکلیف
دُور ہوئی، یا وہ کام سبب بنا اللہ تعالےٰ کے کسی ارادہ کی تکمیل کا۔
مثلاً اللہ تعالےٰ دُنیا میں ہدایت و نور کی اشاعت کرنا چاہتا تھا۔ اس
شخص نے جو یہ کام کیا، تو اُس کا یہ کام ہدایت و نُور کی اس تدلّی الٰہی کے ظہور کا ذریعہ بن گیا یا
ایسا ہُوا کہ اس شخص کا خود اس تدلّی الٰہی کے ضمن میں شمار ہونے لگا اور وہ اس طرح کہ یہ شخص اُس تدلّی
کی طرف متوجہ ہُوا اور اُس نے اپنی ساری ہمت اُدھر لگا دی۔ یہاں تک کہ خود اُس تدلّی

کا ایک حصہ بن گیا۔ الغرض نیک کام کرنے پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے جو رحمت نازل ہوتی ہے، اس سلسلہ میں اوپر جو تین صورتیں بیان ہوئیں۔ ان سب کے یکجا ہونے یا اُن میں سے کسی ایک کے وقوع پذیر ہونے سے نیک کام کرنے والے کو اللہ تعالےٰ کی یہ رحمت گھیر لیتی ہے۔ اور اس سے اُس شخص کے نفس کو ملکی سرور و انبساط حاصل ہوتا ہے۔ "نورِ رحمت" کے فیضان کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص جب اللہ تعالیٰ کے جلال و جبروت کا ذکر کرتا ہے۔ اب یہ ذکر الفاظ سے ہو یا محض خیال سے جیسے کہ قلب کے اشغال ہوتے ہیں، یا یہ شخص عالم جبروت کو اپنے خیال میں منعکس کرنے کی کوشش کرے۔ اور ہمارے زمانے کے اکثر لوگ اس کو "یادداشت" کا نام دیتے ہیں۔ قصۂ مختصر، اس ذکر سے نفس کے اندر ایک بسیط ملکہ اور جبروتی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور بہت سے لوگ اس کو "نور یادداشت" کہتے ہیں۔

ان کمالات میں سے ایک کمال "نور احوال" کا ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص کے نفس پر جب خوف، اُمید، بیقراری، شوق، اُنس، ہیبت، تعظیم و احترام اور اس طرح کی کیفیات برابر وارد ہوتی رہتی ہیں، تو ان سے اُس شخص کے نفس میں صفائی اور رقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس کے بعد جب اس شخص پر موت آتی ہے اور اُس کا نفس جسم سے جُدا ہو جاتا ہے۔ اب اگر اس

حالت میں یہ نفس تغیر پذیر ارادوں میں گھر نہ جائے تو اس کے اندر اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ کے رنگ اور اُن کے انوار سرایت کر جاتے ہیں۔ اور اس سے اُس نفس میں بڑی لطافتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور اُن میں سے ہر ہر لطافت اُس نفس کے لئے مسرت و انبساط کا باعث بنتی ہے۔ غرضیکہ اکثر ارواح کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ چنانچہ ان انوار سے نفس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ جیسے ایک آئینہ ہے، جو دھوپ میں رکھا ہُوا ہے اور اُس پر سُورج کی شعاعیں پڑ رہی ہیں، جن کی وجہ سے وہ سرتاپا نوُر بن گیا ہے۔ یا جیسے کوئی حوض ہو جو پانی سے لبالب بھرا ہُوا ہے۔ اور دوپہر کا وقت ہو۔ اور اُس حوض پر سورج اپنی پوری تابانی سے چمک رہا ہو۔ اور اس طرح پانی نے سورج کو اپنے دامن میں لے لیا ہو۔ اب اگر تم یہ بات جو ہم ابھی بتا رہے ہیں، سمجھ گئے ہو، اور جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے، اُس کی حقیقت کو جان گئے ہو تو پھر اس ضمن میں مَیں تم سے ایک اَور بات کہتا ہوُں، ہُوا یہ کہ جب میں نے غزوۂ بدر کے شہداء کی زیارت کی اور اُن کی قبروں پر کھڑا ہُوا تو مَیں نے دیکھا کہ اُن کی قبروں سے یکبارگی ایک نوُر روشن ہُوا اور وہ ہماری طرف بڑھا۔ شروع میں تو مَیں یہ سمجھا کہ یہ نوُر اُن انوار میں سے ہے، جن کو صرف ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد مَیں اس نوُر کے معاملے میں کچھ تردد میں پڑ گیا۔ اور مَیں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ آیا مَیں اس نور کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہُوں یا اسے

رُوح کی آنکھ سے دیکھتا ہُوں۔ چنانچہ پھر مَیں نے اس پر غور کیا اور سوچنے لگا کہ آخر اس نُور کی نوعیت کیا ہے۔ مجھے معلوم ہُوا کہ یہ نُور "انوارِ رحمت" میں سے ہے۔ بعد ازاں جب میں نے مقامِ صفراء میں اس قبر کی زیارت کی جو حضرت ابو ذر غفاریؓ کی بتائی جاتی ہے (اس کی اصل حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے) الغرض جب مَیں اس قبر کے پاس بیٹھا۔ اور مَیں نے حضرت ابو ذر غفاریؓ کی رُوح کی طرف توجہ کی تو اُن کی رُوح میرے سامنے تیسری رات کے چاند کی طرح ظاہر ہوئی۔ مَیں نے جب اس میں مزید غور کیا تو مجھ پر یہ کھلا کہ حضرت ابوذرؓ کی رُوح کا یہ نُور، "نورِ اعمال" اور "نورِ رحمت" دونو پر جامع ہے۔ البتہ اس میں "نورِ رحمت" "نورِ اعمال" پر غالب ہے +

اس سے پہلے مَیں مکہ معظمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ ولادت پر حاضر ہُوا تھا۔ یہ دن آپ کی ولادت مبارک کا دن تھا، اور لوگ وہاں جمع تھے اور آپ پر درود وسلام بھیج رہے تھے اور آپؐ کی ولادت پر آپؐ کی بعثت سے پہلے جو معجزات خوارق ظاہر ہوئے تھے اُن کا ذکر کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس موقعہ پر یکبارگی انوار روشن ہوئے۔ مَیں کہہ نہیں سکتا کہ ان انوار کو مَیں نے جسم کی آنکھ سے دیکھا یا اُن کا رُوح کی آنکھ سے مشاہدہ کیا۔ بہر حال اس معاملہ کو صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ جسم کی آنکھ اور رُوح کی آنکھ کے بین بین کون سی حِس تھی جس سے مَیں نے ان انوار کو دیکھا۔ پھر مَیں نے ان انوار پر مزید توجہ کی تو مجھے اُن فرشتوں کا فیض اثر نظر آیا، جو اس قسم کے مقامات اور اس نوع کی مجالس پر مؤکل ہوتے ہیں الغرض اس مقام پر مَیں نے دیکھا کہ فرشتوں کے انوار بھی انوارِ رحمت سے خلط ملط ہیں۔"

نواں مشاہدہ

میں مدینہ منوّرہ میں داخل ہُوا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مقدّسہ کی زیارت کی، تو مَیں نے آپؐ کی رُوحِ اقدس کو ظاہر اور عیاں دیکھا۔ اور عالمِ ارواح میں نہیں، بلکہ عالمِ محسوسات سے قریب جو عالمِ مثال ہے، مَیں نے اُس میں آپؐ کی رُوح کو دیکھا۔ چنانچہ اُس وقت میں سمجھا کہ عوام مسلمانوں کا یہ جو کہنا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں تشریف لاتے ہیں، اور نمازیوں کے امام بنتے ہیں۔ اور اسی قبیل کی جو وہ اَور باتیں کہتے ہیں، وہ سب اسی نازک مسئلہ کے متعلق ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عامۃ النّاس کی زبانوں سے جو کچھ نکلتا ہے، وہ درحقیقت نتیجہ ہوتا ہے اُس علم کا جو اُن کی روحوں پر القاء ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اُن

کے اس علم کی دو صورتیں ہو جاتی ہیں۔ یا تو وہ اِس علم کی جو اُن کی رُوحوں پر القاء کیا جاتا ہے ۔ اصل حقیقت کو پا لیتے ہیں۔ یا وہ محض اُس کی ظاہری شکل ہی پر اکتفا کرتے ہیں ۔ پھر اُن میں سے ایک اِس کی دوسرے کو خبر دیتا ہے ، اور دوسرا اجمالی طور پر اِس بات کو سمجھتا ہے اور اُس کو قبول کر لیتا ہے ۔ پھر وہ اپنی اس سمجھی ہوئی بات کو تیسرے کو بتاتا ہے۔ تیسرا اس کو سُنتا ہے اور وہ کسی اور نقطۂ خیال سے اس کو مان لیتا ہے۔ پھر یہ چوتھے آدمی کو بتاتا ہے ۔ اور چوتھا آدمی یہ بات سُن کر اُس کو اپنے خیال پر ڈھالتا ہے اور پانچویں کو بتاتا ہے ۔ اور اس طرح یہ سلسلہ آگے چلتا ہے ۔ یہاں تک کہ یہ بات لوگوں میں مشہور ہو جاتی ہے ۔ اور بہت سے لوگ اس بات پر متفق ہو جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ضمن میں لوگوں کا ایک بات پر متفق ہو جانا بے کار محض نہیں ہوتا ۔ اور نیز عوام میں جو باتیں زبان زد اور مشہور ہو جائیں ، اُن کی تحقیر نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اس سلسلہ میں ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ جو کچھ عوام کی زبانوں پر ہو ، تم اُس کی جو اصل حقیقت ہو ، اُس تک پہنچنے کی کوشش کرو۔

بعد ازاں مَیں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند مرتبہ اور مقدس قبر کی طرف بار بار توجہ کی تو آپؐ میرے سامنے لطیف در لطیف صورت میں ظہور فرما ہوتے۔ چنانچہ کبھی آپ مجرد عظمت و جلال کی صورت میں ظہور فرماتے اور کبھی جذب و شوق اور اُنس و انشراح کی

صورت میں نظر آتے۔ اور کبھی اس طرح کی جاری و ساری صورت میں ظاہر ہوتے کہ مجھے خیال ہوتا کہ تمام کی تمام فضا آپؐ کی رُوح سے بھری ہوئی ہے۔ اور آپؐ کی رُوح اس فضا میں تیز ہوا کی طرح یوں حرکت کر رہی ہے کہ دیکھنے والا اس میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی موجودگی میں دوسری لطافتوں کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ نیز میں نے یہ محسوس کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار مجھے اپنی وہ صورت مبارک دکھلاتے ہیں، جو آپؐ کی اس دنیا کی زندگی میں تھی۔ اور آپؐ مجھے اپنی یہ صورت اس حالت میں دکھا رہے تھے جب کہ میری تمام توجّہ آپ کی رُوحانیت کی طرف تھی، نہ کہ آپ کی جسمانیت کی طرف۔ اس سے میں یہ سمجھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیّت ہے کہ آپؐ کی رُوح جسمانی شکل میں صورت پذیر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف آپؐ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے۔ "بے شک انبیاء کو اوروں کی طرح موت نہیں آتی۔ وہ اپنی قبروں میں نمازیں پڑھتے اور حج کرتے ہیں۔ اور انہیں وہاں زندگی نصیب ہوتی ہے۔ .... الخ" الغرض اس حالت میں مَیں نے آپؐ پر درود بھیجا تو آپ نے مسرّت کا اظہار فرمایا۔ اور مجھ سے خوش ہُوئے اور میرے سامنے ظہور فرمایا۔ اور آپکا اس طرح لوگوں کے سامنے آنا، اور آپکی رُوح کا فضا میں جاری و ساری ہونا بیشک نتیجہ ہے آپکی اس خصوصیّت کا کہ آپؐ سب جہانوں کے لئے باعثِ رحمت بن کر مبعوث ہوتے تھے[1]۔

---

[1] اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف "وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعالمین"۔ سُورۃ الانبیاء ۱۰۷

دسواں مشاہدہ

مدینہ منورہ میں پہنچنے کے تیسرے دن بعد پھر میں روضہ اقدس پر حاضر ہوا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے دونو ساتھیوں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو سلام کیا۔ اور میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ پر جو فیضان فرمایا تھا، اُس سے مجھے بھی مستفید فرمایئے۔ میں خیر و برکت کی اُمّید لے کر آپ کے حضور میں آیا ہوں۔ اور آپؐ کی ذات رحمت اللعالمین ہے۔ میں نے اتنا عرض کیا تھا کہ آپؐ عالتِ انبساط میں میری طرف اس طرح ملتفت ہوئے کہ مَیں یوں سمجھا کہ گویا آپؐ نے اپنی چادر میں مجھے لے لیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر خوب بھینچا۔ اور آپؐ میرے سامنے رونما ہوئے۔ اور مجھے اسرار و رموز

سے آگاہ فرمایا۔ اور نیز خود اپنی ذات اقدس کی حقیقت مجھے بتائی۔ اور اس ضمن میں آپؐ نے اجمالی طور پر مجھے بہت بڑی مدد دی۔ چنانچہ آپؐ نے مجھے بتایا کہ میں کس طرح اپنی ضرورتوں میں آپؐ کی ذات سے استمداد کروں۔ اور آپؐ نے مجھے اس کیفیت سے بھی آگاہ فرمایا۔ کہ آپؐ کس طرح اُن لوگوں کو جو آپ پر درود بھیجتے ہیں، جواب دیتے ہیں۔ اور جو لوگ آپؐ کی مدح و ثنا کرتے اور آپؐ کی جناب میں عجز و نیازمندی کرتے ہیں، اُن سے آپؐ کس طرح خوش ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مَیں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کو دیکھا کہ آپؐ اپنے جوہر رُوح، اپنی طبیعت، اپنی فطرت اور جبلّت میں سرتاسر مظہر بن گئے ہیں اُس عظیم الشان تدلّی کا، جو کہ تمام بنی نوع بشر پر حاوی ہے۔ اور مَیں نے دیکھا کہ اس حالت میں یہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے کہ ظاہر اور مظہر یعنی ظاہر ہونے والی چیز اور جس چیز میں کہ اُس کا اظہار ہو رہا ہے، ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ چنانچہ یہی وہ تدلّی ہے، جسے صوفیاء نے "حقیقتِ محمدیہ" کا نام دیا ہے۔ اور اس کو وہ "قطب الاقطاب" اور "نبی الانبیاء" کا بھی نام دیتے ہیں۔ غرضیکہ یہ "حقیقتِ محمدیہ" عبارت ہے اللہ تعالےٰ کی اس تدلّی کے مظہر بشری میں ظہور سے۔ چنانچہ جب کبھی عالم مثال میں اس تدلّی کی حقیقت متمثّل ہوتی ہے تاکہ وہ عالم مثال سے بنی نوع انسان کے لئے عالم اجسام میں ظاہر ہو تو "حقیقتِ محمدیہ" کے اس بروز کو قطب یا نبی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ہوتا یہ ہے

کہ اللہ تعالٰی کی طرف سے جب کوئی شخص لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتا ہے تو حقیقت محمدیہ کا اُس شخص کی ذات کے ساتھ اتصال ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ اس زندگی میں اپنا فرض پورا کر لیتا ہے اور لوگوں سے منہ موڑ کر اس دُنیا سے اپنے رب کی رحمت کی طرف لوٹتا ہے تو یہ "حقیقت محمدیہ" اُس کی ذات سے الگ ہو جاتی ہے لیکن ان سب کے برعکس جہاں تک ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تعلق ہے، یہ "حقیقت محمدیہ" اُن کی اصل بعثت میں داخل ہے۔ اور یہ اس لئے "تاکہ آپؐ قیامت کے دن تمام بنی نوع انسان کے لئے شاہد[1] ہوں۔ اور نیز اس لئے کہ آپؐ ذریعہ بنیں اللہ تعالٰی کے لطف و کرم کا اُس کے فرمانبردار بندوں کی طرف، اور وہ اس طرح کہ آپؐ قیامت کے دن اُن سب کی شفاعت کریں۔ الغرض یہ ہیں وہ وجوہ جن کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے عظیم الشان ہمت کا ظہور عمل میں آیا۔ چنانچہ آپؐ کی اس ہمت کا تقاضہ یہ ہوا کہ تمام کے تمام انسانوں کو آپؐ کی رحمت اپنے دامن میں لے لے۔ اور ان سب کی ملکی قوتوں کو بہیمی قوتوں سے امان دلا دے۔ اور اس طرح آپؐ کا وجود تمام اقوام کے لئے اللہ کی رحمت کا واسطہ بن جائے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ قدرت کو نسلوں کی بقا اور تسلسل منظور تھا تو اس کے

---

[1] یہ اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف "وَیَوْمَ نَبْعَثُ فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ شَھِیْدًا عَلَیْھِمْ مِّنْ اَنْفُسِھِمْ وَجِئْنَا بِکَ شَھِیْدًا عَلٰی ھٰۤؤُلَآءِ۔"

لئے اُس نے انسانوں میں قوتِ تناسل پیدا کردی۔ یا جیسے ہر نوع کو اپنے آپ کو خطرات سے بچانے کی ضرورت تھی تو اُس کے لئے قدرت کی طرف سے ہر نوع میں مدافعت کی کوئی نہ کوئی چیز پیدا کردی گئی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عامّہ کو بھی ایک واسطہ کی ضرورت تھی۔ جس کے ذریعہ تمام افرادِ انسانی کو مستفید کرسکتی۔ چنانچہ ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس یہ واسطہ بنی۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپؐ موت کے بعد بھی ہمیشہ خلقت کی طرف متوجّہ رہتے ہیں، اور سب کا خیال رکھتے ہیں۔ اور اسی بنا پر آپؐ ہی کی ذات تمام انبیاء سے زیادہ اس امر کی مستحق تھی کہ وہ اس تدلّی الٰہی کا جو کہ تمام نوع بشر پر حاوی ہے، اور جسے صوفیاء نے "حقیقت محمدیہ" کا نام دیا ہے، مستقر بنتی۔ اور اس تدلّی الٰہی کی مثالی شکل جو عالمِ مثال میں قائم ہے، آپؐ کی ذات سے اس طرح متصل ہوتی کہ ظاہر اور مظہر میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا، گویا کہ ظاہر ہی عین مظہر ہے۔ اور دونو اس طرح مل جاتے کہ ان کو کسی طرح جُدا نہ کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس مشہور شعر کے ایک معنی یہی ہیں:۔

أَفَلَتْ شُمُوسُ الأَوَّلِينَ وَشَمْسُنَا

أَبَداً عَلَى أُفُقِ العُلَى لَا تَغْرُبُ

(پہلوں کے سُورج کبھی کے غروب ہوگئے۔ لیکن ہمارا سُورج ایسا ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ اُفقِ عظمت پر تاباں رہے گا اور کبھی نہیں ڈوبے گا)

الغرض "حقیقت محمدیہ" کے ساتھ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس کا اتحاد و اتصال میں نے اپنی روح کی آنکھ سے دیکھا۔ اور اس کی کیفیت کو مَیں سمجھ گیا۔

علاوہ ازیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ اُسی ایک ہی حالت پر قائم ہیں۔ اور آپؐ کی اُس حالت میں نہ تو کوئی نیا ارادہ مخلّ ہوتا ہے۔ اور نہ کوئی اِس میں رخنہ ڈالتا ہے۔ ہاں اس ضمن میں یہ ضرور ہوتا ہے کہ جب آپؐ خلقت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو آپؐ اُن سے اتنا قریب ہو جاتے ہیں کہ اگر انسان اپنی پوری ہمت سے آپؐ کی طرف توجہ کرے تو آپؐ اس کی مصیبت میں مدد کرتے ہیں۔ اور اُس پر اپنی طرف سے خیر و برکت کا فیضان فرماتے ہیں۔ چنانچہ اس حالت میں آپؐ کے متعلق یہ خیال ہوتا ہے کہ آپؐ کی ذات اقدس نئے نئے ارادوں کا مورد بن رہی ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے کہ ایک شخص ہے جو داد خواہوں اور محتاجوں کی مدد میں کوشاں ہے، ظاہر ہے اُن کی مدد کرتے وقت اُس شخص کے دل میں ضرور نئے نئے ارادے وقوع پذیر ہوں گے۔

اِس حالت میں مَیں نے اِس بارے میں سوچ بچار کی اور یہ معلوم کرنا چاہا کہ آپؐ مذاہب فقہ میں سے کس خاص مذہب کی طرف رجحان رکھتے ہیں تاکہ میں فقہ کے اُس مذہب کی اطاعت کروں۔ اور اُس کو مضبوطی سے پکڑوں۔ مَیں نے دیکھا کہ آپؐ کے نزدیک فقہ کے یہ

سارے کے سارے مذاہب یکساں ہیں۔ اور اس حالت میں جس میں کہ آپؐ اس وقت ہیں، آپؐ کی رُوح کے لئے یہ مناسب بھی نہیں ہے کہ وہ مذاہب فقہ کے بارے میں ان فروعات میں پڑے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آپؐ کی رُوح کے جوہر میں تو ان تمام فقہی فروعات کا جو بنیادی علم ہے، وہ موجود ہے۔ اور اس بنیادی علم سے مُراد یہ ہے کہ نفوسِ انسانی کے متعلق اللہ تعالےٰ کی اُس عنایت اور اہتمام کو جان لیا جائے۔ جس کے پیشِ نظر انسانوں کے اخلاق و اعمال اور اور اُن کی اصلاح ہے۔ الغرض فقہ کے تمام قوانین کی اصل بنیاد تو یہ عنایت الٰہی ہے۔ اس کے بعد جیسے جیسے زمانہ بدلتا ہے، اُسی کے مطابق اِس اصل سے نئی نئی شاخیں اور الگ الگ صورتیں بنتی چلی جاتی ہیں۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی رُوح کے اصل جوہر میں فقہ کا یہ بنیادی علم موجود ہے، اس لئے ضروری ہے کہ آپؐ کے نزدیک فقہ کے سارے مذاہب برابر ہوں۔ اور آپؐ کی نظر میں ان میں سے ایک کو دوسرے پر کوئی امتیاز نہ ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ فقہ کے مذاہب گو ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن جہاں تک فقہ کے ضمن میں دینِ اسلام کے ضروری اُصول ومبادی کا تعلق ہے، مذاہب فقہ میں سے ہر مذہب میں وہ موجود ہیں۔ مزید برآں اگر کوئی شخص فقہ کے ان مذاہب میں سے کسی مذہب کا بھی تابع نہ ہو تو اس کی وجہ سے یہ نہیں ہوتا کہ آپؐ اُس شخص سے ناراض ہوں۔ ہاں اُس

سلسلہ میں اگر کوئی ایسی بات ہو جس سے ملت میں اختلاف ہو یا اس بنا پر لوگ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگیں۔ اور اُن میں ناچاقی پیدا ہو جائے تو ظاہر ہے اس سے بڑھ کر آپؐ کی ناراضگی کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

مذاہب فقہ کی طرح تصوف کے تمام طریقوں کو بھی میں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک یکساں پایا۔ لیکن اس مقام پر ایک نکتے کے بارے میں متنبہ کر دینا ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بعض دفعہ ایک آدمی کو یہ خیال گزرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں مذہب فقہ کو پسند فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ سمجھتا ہے کہ وہی مذہب فقہ برحق و مطلوب من اللہ ہے۔ اب اگر اس شخص سے فقہ کے اس مذہب کے متعلق کوئی کوتاہی ہو جاتی ہے، تو اُس کے دل میں یہ یقین بیٹھ جاتا ہے کہ اُس نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کے حق میں تقصیر کی ہے۔ اس کے بعد جب یہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں کھڑا ہوتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اُس کے اور آپؐ کے درمیان ایک بند دروازہ حائل ہے۔ چنانچہ وہ سمجھتا ہے کہ آپؐ کا یہ عتاب نتیجہ ہے میری اس کوتاہی کا جو فلاں مذہب فقہ کے متعلق مجھ سے ہوئی۔ لیکن واقعہ یوں نہیں ہے۔ اس معاملہ میں اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں اس حالت میں آتا ہے کہ اس کا دل مخالفت و سرکشی سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اور چونکہ خود

اُس کے اندر قبولیت کی استعداد نہیں ہوتی، اس لئے یہ اپنے سامنے فیض کا دروازہ بند پاتا ہے +

اسی طرح بعض دفعہ ایک آدمی کو یہ خیال ہوتا ہے کہ فقہ کے یہ جو مدوّن اور مروّج مذاہب ہیں، اُن سے خروج کے معنی یہ ہیں کہ گویا آدمی شریعت کی حدود سے خارج ہو گیا۔ اور اُس نے احکام الٰہی کی اطاعت چھوڑ دی۔ چنانچہ اس ضمن میں وہ سمجھنے لگتا ہے کہ فقہ کے ان مذاہب کے علاوہ شریعت کا اور کوئی قابلِ اعتماد مسلک ہی نہیں ہے۔ اسی لئے اُس کے نزدیک ان مذاہب فقہ سے خروج اطاعت خداوندی سے سرتابی کے مرادف یا اُس کے لوازم میں سے بن جاتا ہے۔ اور وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح کرنے سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عتاب کا مستوجب ہو جاتا ہے۔ الغرض یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے شبہے ہیں، جو اس سلسلہ میں طالب کو پیش آتے ہیں۔

یہاں ایک اور مسئلے کے متعلق بھی متنبہ کر دینا ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ لوگ جب مدینہ منورہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اور وہ مدینہ والوں کو ایسے اعمال کرتے دیکھتے ہیں، جو اُن کے نزدیک یا تو وہ فی نفسہٖ اچھے نہیں ہوتے یا وہ اُنہیں اچھے نہیں لگتے، تو اس بنا پر یہ لوگ مدینہ منورہ کے باشندوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں، اور اُن کی طرف سے اِن لوگوں کے دلوں میں کینہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ روضۂ مقدسہ پر حاضر ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ اُدھر توجہ

کرتے ہیں۔ اور اُن کے دلوں کی صفائی وطہارت کا وقت آتا ہے تو اُس کینہ کی وجہ سے جو اُن کے دلوں میں پہلے سے راسخ ہو چکا ہوتا ہے، اُن کے اندر تلخی پیدا ہو جاتی ہے اور بجائے اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں اُن کے دل صاف وطاہر ہوں، اُلٹا اُن میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے ضروری اور اشد ضروری ہے کہ تم اس طرح کی باتوں سے بچو۔ اور بار بار بچو تاکہ کہیں یہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نورِ کامل سے استفادہ کرنے کی راہ میں تمہارے لئے روک نہ بن جائیں۔

علاوہ ازیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ "ملکوت" کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ اور "جبروت"[1] سے مشابہ ہیں۔ اور آپؐ کی ذاتِ اقدس حامل ہے بہت سی لطافتوں کی۔ اور یہ لطافتیں ایک تو خود آپؐ کے ذاتی کمالات میں سے ہیں۔ اور دوسرے جو مختلف استعدادوں کے لوگ آپؐ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، تو اُن کی ان استعدادوں کے اعتبار سے بھی آپؐ میں یہ لطافتیں موجود ہیں۔ چنانچہ اس مجلس میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے اپنی اجمالی مدد سے سرفراز فرمایا اور یہ اجمالی مدد عبارت تھی مقامِ مجددیت، وصایت اور قطبیت ارشادیہ سے، یعنی آپؐ نے مجھے ان مناصب سے نوازا۔ اور نیز مجھے شرفِ قبولیت عطا فرمایا اور امامت بخشی۔ اور تصوف میں میرا جو مسلک ہے۔ اور فقہ میں میرا جو مذہب ہے، ہر دو کو اصل اور فرع دونوں اعتبار سے

---

[1] دوسرے صفحہ پر

راہ راست پر بتایا۔ لیکن یہ سب کے لئے نہیں بلکہ صرف مخصوص لوگوں کے لئے جن کی فطرت میں تحقیق کا مادہ ہے۔ لیکن اس میں بھی شرط یہ رکھی کہ اس مسلکِ تصوّف اور مذہب فقہی کا اتباع باہمی اختلاف اور آپس کی لڑائی جھگڑے کا باعث نہ بنے۔ چنانچہ جو شخص بھی فقہ میں اصل اور فرع کے لحاظ سے اور تصوّف میں سلوک کے اعتبار سے ہمارے مذہب فقہی اور مسلکِ تصوّف کو اختیار کرے، اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سلسلہ میں مندرجہ بالا نکتہ پر اپنی نگاہ رکھے۔

اس کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ آپؐ سے مبادئ وجود کے مسائل، وجود کے مراتب اور فنا و بقا کے مقامات کے بارے میں سوال کروں۔ لیکن اُس وقت میں نے دیکھا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالےٰ کی اُس تدلّی کی طرف پوری طرح متوجہ ہیں، جس تدلّی کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ چنانچہ جب کبھی میں آپؐ سے ان مسائل کے متعلق پوچھنے کا ارادہ کرتا تو میں خود بھی تدلّی مذکور کی طرف آپؐ کی توجّہ کی اسی کیفیت میں کھو جاتا۔ اور یہ چیز آپ سے سوال کرنے میں مانع آتی۔ اس ضمن میں آپؐ نے مجھ سے فرمایا کہ میں آپؐ کے سامنے بیٹھوں اور اپنے ربّ سے ان مسائل کے بارے میں اپنی اُس زبان میں سوال

---

[۱] ذاتِ حق کا پہلا مرتبہ ذات بحت کا ہے۔ اسی مرتبے میں ذاتِ حق ہر اسم و رسم و لغت و صفت سے منزّہ ہے۔ اس کا نام عالمِ لاہوت ہے جب اُس ذات نے اسم و رسم و لغت و صفت پایا تو اسکا نام وحدت ہُوا۔ اسکو عالمِ جبروت کہتے ہیں۔ اور صوفیاء نے اسی عالم کو حقیقتِ محمدیہ کا نام دیا ہے۔

کروں جو زبان کہ ملاء اعلیٰ کے مقابل میں ہوتی ہے۔ مَیں اس حالت میں تھا کہ آپؐ کے نُور نے مجھے پُوری طرح سے گھیر لیا۔ پھر میں نے سوال کرنا چاہا تو آپؐ کے نُور نے پھر مجھے گھیر لیا۔ اس کے بعد پھر میں نے سوال کرنا چاہا تو پھر آپؐ کے نُور نے مجھے حلقہ میں لے لیا۔ الغرض یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ میرا سوال اور آپؐ کی ہمّت عالی دونوں مل گئے۔ اور اس طرح تیر نشانے پر جا کر لگا۔ چنانچہ مَیں نے آپؐ کو دیکھا کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کی تدلّی مذکور کے محل اور ظرف بھی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ آپؐ اپنی مبارک صورت کو محفوظ رکھے ہوئے ایک ہی حالت پر قائم بھی ہیں اور خلقت کی طرف متوجّہ بھی ہیں۔ اور آپ "عظموت" کا لباس بھی پہنے ہوئے ہیں۔ اور آپؐ کی ذات اقدس میں قبولیت، اور جذب و اُلفت کی اتنی فراوانی ہے کہ نہ اُس کا حساب ہو سکتا ہے اور نہ کوئی اُس کی آخری حد کا ادراک کر سکتا ہے۔ مَیں نے دیکھا کہ جب کوئی شخص اپنی پوری ہمّت کے ساتھ آپؐ کی ذاتِ اقدس کی طرف متوجّہ ہوتا ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ یہ شخص عالی ہمّت ہی ہو۔ بہر حال کوئی شخص ہو، جس کے سینے میں دل ہے، اور وہ کسی چیز کا اس طرح شوق رکھ سکے کہ وہ اُس کی طرف پورے عزم و ارادہ اور شوق و رغبت سے متوجّہ ہو جائے۔ الغرض یہ شخص جب اپنی پوری ہمّت سے آپؐ کی طرف متوجّہ ہوتا ہے تو آپؐ بھی اُس کی طرف تدلّی فرماتے ہیں۔ اور آپؐ کی تدلّی یہ ہے کہ آپ اُسکے

سلام اور اُس کے درُودوں کا جواب دیتے ہیں۔ یعنی یہ شخص جب اس طرح آپؐ کی طرف توجّہ کرتا ہے تو اُس کی اس توجّہ سے آپؐ میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو مشابہ ہوتی ہے تجدد پذیر ارادے کے۔

یہاں میں تمہیں ایک بہت بڑے راز سے آگاہ کرتا ہُوں۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جو آپؐ کے نسمہ مبارک کو اپنی اس تدلّی کا محلّ اور ظرف بنایا، تو اُس میں حکمت یہ تھی کہ اس طرح ذاتِ حق دُنیا والوں سے اور خاص طور پر اُن لوگوں سے جو پستی میں ہیں، بہت زیادہ قریب ہو جائے۔ اور یہ اُس وقت تک ممکن نہ تھا۔ جب تک کہ عنایتِ الٰہی کسی انسانی نسمے کو اپنا واسطہ نہ بناتی۔ چنانچہ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسمہ مبارک تدلّی الٰہی کا محلّ و ظرف بنا۔

اس ضمن میں میں نے دیکھا کہ جب کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر درود وسلام بھیجتا ہے یا آپؐ کی مدح و ثنا کرتا ہے تو آپؐ اس بات سے بہت مسرور ہوتے ہیں۔ اور نیز جس طرح مشائخ صوفیا کے فیضِ صحبت کا اہلِ مجلس پر اثر ہوتا ہے، اسی طرح میں نے آپؐ کی ذاتِ اقدس کو بھی ظاہر و عیاں دیکھا۔ اور آپؐ کو توجّہ کرنے والوں پر فیضان فرماتے پایا۔ مَیں اس وقت آپؐ کے رو برو حاضر تھا۔ اور جو کچھ میں تمہیں بتا رہا ہُوں، یہ میرے مشاہدات میں سے ایک مشاہدہ ہے۔

میرا بھائی محمد عاشق جو اس سفر میں میرا رفیق ہے، وہ اس عجیب راز کو خوب سمجھ گیا ہے۔ اور مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ

اُس کا اِس عجیب راز سے واقف ہونا محض فیضانِ الٰہی کا عطیہ ہے۔
اور عجیب راز یہ ہے کہ جملہ کمالات میں سے حج ایک بہت بڑا کمال ہے۔
چنانچہ حج کے بہت بڑا کمال ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ حج بس حاجیوں کے
دل مسّرت و سرور سے بھر جاتے ہیں۔ اس امر کی تفصیل یہ ہے کہ اس
میں شک نہیں کہ اللہ تبارک وتعالےٰ کا قُرب بمنزلہ ایک کمال کے ہے۔
اب یوں ہُوا کہ جب ذاتِ حق نے خلقت کی طرف تدلّی فرمائی۔ اور خانۂ
کعبہ کو اُس نے اپنی اس تدلّی کے شعائر میں سے ایک شعار بنایا، تو اس
طرح بلحاظ مسافت کے خانہ کعبہ کا قُرب اللہ تعالےٰ کا قُرب قرار دیا گیا۔
بات دراصل یہ ہے کہ اللہ سے قُرب حاصل کرنے کی کئی صورتیں ہیں۔
چنانچہ اللہ تک مسافت طے کرکے پہنچنے کا جو راستہ ہے، اُس کی
آخری منزل حج ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ ان معاملات کو بہتر جانتا ہے +

گیارھواں مشاہدہ

میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آپؐ کے اس قول کے کہ "ابھی آدم کا خمیر پانی اور مٹی میں تیار ہو رہا تھا کہ میں نبی تھا" معنی دریافت کئے۔ لیکن میرا یہ سوال زبانِ مقال سے نہ تھا۔ اور نہ یہ سوال خیال کی صورت میں میرے دماغ میں آیا تھا۔ بلکہ ہُوا یہ کہ میری رُوح اس راز کو جاننے کے شوق اور اُس کی محبّت میں سرشار ہو گئی۔ اِس حالت میں مَیں نے اپنی رُوح کو زیادہ سے زیادہ جتنا بھی مجھ سے ممکن تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے قریب کر دیا۔ اس کی وجہ سے میری رُوح آپؐ کی ذاتِ اقدس کی جو مثالی صُورت ہے، اُس سے بھر گئی۔ اس کے بعد آپؐ نے مجھے اپنی وہ مثالی صورت دکھائی، جو اس عالمِ اجسام میں تشریف فرما ہونے سے پہلے عالمِ مثال میں آپؐ کی

تھی۔ پھر آپؐ نے مجھے عالمِ مثال سے اِس عالمِ اجسام میں اپنے منتقل ہونے کی کیفیت بتائی۔ اور اس طرح مجھے دُوسرے انبیاء کی بھی مثالی صورتیں دکھائی گئیں۔ اور خداوند کارساز کی جناب سے ان انبیاء پر جیسے جیسے نبوت کا فیضان ہُوا۔ اور نیز جس طرح آپؐ پر عالمِ مثال میں خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس نعمت کا فیضان ہُوا تھا، اُس کی کیفیت دیکھنے میں آئی۔ بعد ازاں مجھے اولیاء کی مثالی صورتیں، اور اُن پر جس طرح علوم و معارف کا فیضان ہوتا ہے، یہ چیزیں دکھائی گئیں۔ اور اس طرح میرے لئے یہ حقائق خوب واضح ہو گئے۔ الغرض جو کچھ اُس مثالی صورت سے مجھ پر فیضان ہُوا، میں نے اُسے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ اور اس فیضان سے جو مقصود و مطلوب تھا، وہ میں اچھی طرح سمجھ گیا۔ چنانچہ اس ضمن میں جو کچھ میں سمجھا ہوں، اب تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں۔

تمہیں جاننا چاہیئے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ایک عظیم الشان تدلّی ہے، جو خلق کی طرف متوجّہ ہے۔ لوگ اسی تدلّی کے ذریعہ ہدایت پاتے ہیں اور اسی کی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ اس تدلّی کی ہر زمانے میں ایک نئی شان ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ ایک زمانے میں ایک مظہر میں ظاہر ہوتی ہے اور دوسرے زمانے میں دوسرے مظہر میں۔ اور جب کبھی یہ تدلّی کسی خاص مظہر میں ظاہر ہوتی ہے تو دُنیا میں اس مظہر کا ایک عنوان بنتا ہے، اور یہ عنوان عبارت ہوتا ہے رسول سے، جو لوگوں کو نیک کاموں کا حکم دینے اُنہیں بُرے کاموں سے روکنے، اور اُن کو فرائض و واجبات بتانے کیلئے

مبعوث کیا جاتا ہے۔ الغرض یہ رسول اور جو کچھ کہ وہ خدا تعالےٰ کی طرف سے لے کر آتا ہے، وہ اس تدلّی کے مظہر کا عنوان بنتے ہیں۔ اور یہ مظہر فی نفسہٖ اصل حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ جب کبھی تدلّی کے مظاہر میں سے کوئی مظہر بروئے کار آتا ہے تو اسی مظہر کی مناسبت سے لوگوں میں علوم و معارف کا ظہور ہوتا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ لوگوں کو اس کا سرے سے علم ہی نہ ہو کہ یہ علوم و معارف تدلّی الٰہی کے اسی مظہر کا فیضان اور اُسی کے مناسب اور مطابق ہیں۔ وہ لوگ جن پر ان علوم و معارف کا ظہور ہوتا ہے۔ اگر وہ اُس گروہ میں سے ہوں، جن کا کام کسی رسول کے کلام سے مسائل کا استنباط کرنا ہوتا ہے تو یہ احبار اور رہبان کی جماعت ہوگی۔ اور اگر وہ اُس گروہ میں سے ہوں جن کی اس طرح ان مسائل کے استنباط کی طرف توجہ نہیں ہوتی، بلکہ وہ براہ راست اللہ تعالےٰ سے اخذ علم کی ہمت رکھتے ہیں، تو یہ حکماء اور محدثین یعنی حکمت ربّانی کے حاملوں کی جماعت ہے۔ غرضیکہ احبار اور رہبان اور حکماء اور محدثین، یہ دونوں کے دونو گروہ تدلّی الٰہی کے اسی مظہر سے علم حاصل کرتے ہیں۔ خواہ وہ اس حقیقت سے باخبر ہوں یا نہ ہوں۔ تدلّی الٰہی کی اس طرح ظہور فرمائی ہی دراصل اللہ تعالےٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ ورنہ جہاں تک رسول کی تبلیغ و اشاعت کا تعلق ہے، اُس کا تو حلقہ ظاہر ہے بڑا محدود ہوتا ہے یعنی اُس کی آواز ایک قوم سنتی ہے، اور دوسری قوم تک اُس کی آواز نہیں

پہنچتی، اور وہ اُس سے محروم رہتی ہے۔ لیکن اس تدلی کا فیض عام ہے۔ اور اس سے احبار اور رہبان اور حکماء اور محدثین برابر اخذِ علم کرتے ہیں ہے

قصّہ مختصر، جب اللہ تعالےٰ نے ارادہ کیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو پیدا کرے، تاکہ وہ تمام بنی نوع انسان کے لئے بمنزلہ باپ کے ہوں تو اللہ تعالےٰ کے اِس ارادے کا دراصل مقصد یہ تھا کہ وہ آدم کے ساتھ ساتھ تمام بنی نوع انسان کو پیدا کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ہُوا یہ کہ تخلیق آدم کے وقت تمام بنی نوع انسان کی ارواح نے عالم مثال میں اُن کے اجسام کی جو مثالی صورتیں تھیں اُن کی طرف حرکت کی۔ اس ضمن میں عالم مثال میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مثالی پیکر بھی متشکل ہو گیا اور اس مثالی پیکر کے مناسب تدلی الٰہی کا جو مظہر تھا، وہ اس پر منطبق ہو گیا۔ آپؐ کے مثالی پیکر پر تدلی الٰہی کے مظہر کا انطباق ایسا تھا جیسے کہ ایک کُل پر اُس کے جزو کا انطباق ہو جائے۔

اور ایسا اس لئے ہُوا کہ اوّل تو عنایت الٰہی میں آپؐ کی ذات اقدس کے لئے یہ خصوصیت مقدر ہو چکی تھی۔ اور دوسرے ایک ایسے فرد کا وجود میں آنا ایک طے شدہ امر تھا، جو حشر کے دن تمام بنی نوع انسان کے لئے اللہ تعالےٰ کی رحمت کا واسطہ بنے۔ اور اُس کے ذریعے اُن کے لئے شریعت کی تکوین ہو۔ اور نیز جب لوگوں کو ضرورت پڑے تو وہ اُن کی بیماریوں کو بھی دُور کر سکے، الغرض آدم کی تخلیق سے پہلے آپؐ کے نبی ہونے سے یہ مُراد ہے۔

بہر حال جب افرادِ انسانی وجود میں آ گئے۔ اور اُنہوں نے اپنی اپنی راہیں اختیار کر لیں، تو اُن میں سے بعض افراط کے مرتکب ہُوئے۔ اور اُن میں سے بعض تفریط میں پڑ گئے۔ چنانچہ اس وقت تدبیرِ الٰہی اس امر کی متقاضی ہوئی کہ وہ سب کو ایک ہی راہ پر لے آئے۔ اس کے لئے ان افراد میں سے ایک فرد پر تدلّی الٰہی منطبق ہُوئی۔ اور اس فرد کو وحی کے ذریعہ بتایا گیا کہ کس کس چیز میں اُس کی قوم کے لئے فلاح ہے۔ غرضیکہ اس طرح اس فرد کے اس منصب پر مبعوث ہونے سے تدلّی الٰہی کے مظاہر میں سے ایک مظہر ظاہر ہُوا۔ اور عام طور پر اس ضمن میں ہوتا یہ ہے کہ تدلّی کے اس مظہر کا انطباق اِس نبی کے وجودِ بشری پر ہوتا ہے۔ باقی رہا عالم مثال میں اُس کا مثالی وجود، وہ تو اس سلسلے میں محض اس بات کی حکایت کرنے کے لئے ہے کہ اِس فرد میں یہ یہ استعداد ہے، اور اس لئے اِس استعداد کے مطابق اُس پر فیضان ہونا چاہیے۔

لیکن اس کے برعکس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود خارج میں ظہور پذیر ہُوا۔ تو اُس کے ساتھ ساتھ تدلّی الٰہی کا بھی ایک مظہر ظاہر ہُوا۔ اور چونکہ یہ مظہر قوتِ مثالی پر مشتمل تھا۔ اس لئے اُس نے پُوری طرح مثالی لباس اختیار کر لیا۔ اور اس حالت میں تمام آفاق اس سے بھر گئے۔ اور یہ اس لئے کہ اس سے پہلے کوئی تدلّی مثالی لباس میں ظہور پذیر نہیں ہُوئی تھی۔ لیکن اس کے یہ معنی

نہیں کہ عالمِ مثال فی نفسہٖ اُس وقت تک موجود نہیں تھا۔ یعنی عالمِ مثال تو موجود تھا، لیکن کسی تدلّی نے اُس وقت تک مثالی ہئیت اختیار نہیں کی تھی۔ غرضیکہ اس سے میری مُراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان تدلّی الٰہی کے اِس منظر کی کوئی مثالی صورت نہیں تھی۔ لیکن آپؐ کے بعد تدلّی الٰہی کی اس مثالی صورت سے یہ ساری کی ساری فضا اور یہ کُل زمینیں اور آسمان بھر گئے۔ چنانچہ اب حالت یہ ہے کہ جو شخص بھی علم، معرفت، روحانی کیفیت یا اس قبیل کا کوئی اور کمال اخذ کرتا ہے، تو اُس کے لئے سب سے قریبی ماخذ تدلّی الٰہی کا یہی مثالی منظر ہوتا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ وہ اس حقیقت کو جانتا ہے، یا وہ اس سے بے خبر ہے۔ الغرض یہ ہیں وہ وجوہ، جن کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم خاتم النبیین ہیں۔ اور آپؐ کے بعد نبوّت کا سلسلہ منقطع ہو گیا کیونکہ آپؐ کی ذاتِ اقدس کی اصل حقیقت جس کے لئے آپؐ کا لوگوں کے لئے نبی مبعوث ہونا محض ایک عنوان تھا، تدلّی الٰہی کا یہی مثالی منظر ہے۔ اور یہی مثالی منظر ہے۔ جس سے یہ فضا اور زمین اور آسمان بھر گئے ہیں۔

اب اگر تم یہ بات سمجھ گئے تو بے شک تم اس حقیقت کو بھی پا لوگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم واقعی تمام جہانوں کے لئے رحمت اور خاتم النّبیین تھے۔ اور یہ کہ انبیاء علیہم السلام اِس عالم

اجسام میں اللہ تعالےٰ کی اسی تدلّی سے فیض حاصل کرتے تھے لیکن جہاں تک اولیاء کا تعلق ہے، اُن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اس تدلّی کے مثالی مظہر سے اخذِ معرفت کرتے ہیں۔ اور اس مثالی مظہر کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقتِ بعثت ہے۔ گروہِ انبیاء میں سے مَیں نے اِس معاملے میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو ممتاز پایا ہے کہ بے شک اُن کی نبوّت بھی عالمِ ارواح میں یعنی جب تخلیق آدم کے ساتھ تمام بنی نوع انسان کی ارواح اپنے مثالی پیکروں میں ظاہر ہُوئی تھیں، متشکل ہوئی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت کی مثالی صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی مثالی صورت سے قدرے کمزور تھی، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت سے تدلّی الٰہی کا ایک روحانی مظہر ظاہر ہُوا۔ لیکن یہ بھی اُس روحانی مظہر سے ضعیف تھا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت ظہور پذیر ہُوا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد اُن کی اُمت کے سوا اور کہیں کامل نبی اور محدّث پیدا نہیں ہُوا۔ لیکن اس کے باوجود نبوّت کا سلسلہ منقطع نہیں ہُوا۔ پر جب ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ظاہر ہوئے تو تدلّی الٰہی کا مثالی مظہر خوب نمایاں طور پر ظاہر ہوگیا۔ اور اسی بنا پر آپؐ کی نبوت کے بعد کسی اَور نبی کی ضرورت نہ رہی۔ اور نبوّت کا سلسلہ سرے سے ختم ہوگیا۔ اور علوم و معارف کا فیضان موسلا دھار بارش کی طرح ہونے لگا۔ کیونکہ

جہاں تک ان علوم و معارف کا تعلق ہے، اُن کا مستقر تو زیادہ تر عالم مثال ہی ہوتا ہے +

تحقیق عالی ——— اب اگر تم مجھ سے یہ پوچھو کہ آخر اس میں کیا حکمت ہے کہ زمانۂ قدیم میں آدم علیہ السلام کے بعد لوگوں کا رجحان ذہن کے جمود اور طبیعت کی سُستی کی طرف زیادہ رہا۔ اور وہ حیوانی خواہشات میں بیشتر اُلجھے رہے۔ اور اُس زمانے میں معدودے چند کے سوا کہیں اجتماعی ادارے وجود میں نہ آئے۔ اور شاذ و نادر ہی خطابت، طبیعات اور الٰہیات کے علوم میں سے کوئی علم ایجاد ہُوا۔ باوجود اس کے کہ اُس زمانے میں لوگوں کی بڑی لمبی عمریں ہوتی تھیں۔ اور وہ ان علوم میں بہت غور و خوض بھی کرتے تھے۔ لیکن جب حضرت ابراہیمؑ مبعوث ہوتے ہیں تو اُن کے بعد یونان، روم، فارس، بنی اسرائیل، مغرب اور عرب میں ان علوم میں قدرے ترقی ہوتی ہے پھر جونہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوتی ہے۔ ان علوم کا بڑے زور شور سے فیضان ہوتا ہے۔ اور علوم حکمت، فنونِ ادب و خطابت اور علوم شرعیہ اس طرح پھوٹ پڑتے ہیں کہ اُن کی کوئی اور چھور نہیں رہتی +

اس کے جواب میں میں عرض کرتا ہوں کہ بات یہ ہے کہ اللہ

تعالےٰ کی ایک بہت بڑی تدلّی ہوئی، جس سے کہ زمینوں اور آسمانوں کی کُل فضا بھر گئی۔ اس تدلّی کی حقیقت عبارت ہے اُس معرفت سے جو شخص اکبر کو اپنے رب کے بارے میں حاصل ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شخص اکبر نے جب اپنے رب کو اس طرح جان لیا جیسا کہ اُس کے جاننے کا حق تھا۔ اور اس نے اپنے رب کا اُسی طرح تصور کر لیا، جس طرح کہ اُس کا تصور کرنا چاہیے تھا، تو رب کو اس طرح جاننے اور اُس کا اس طرح تصور کرنے سے شخص اکبر کے ادراک میں اللہ تعالیٰ کی ایک باعظمت صورت نقش ہوگئی، جو ترجمان بن گئی اللہ تعالےٰ کی جلالتِ شان اور اُس کی عزّت و رفعت کی۔ چنانچہ جب تک شخص اکبر کا وجود قائم ہے، اللہ تعالےٰ کی یہ صورت بھی اُس کے اندر موجود رہے گی۔ اس صورت کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کا کلیتہً اللہ پر انطباق ہوتا ہے۔ اور وجود باری تعالیٰ جو فی نفس الامر ہے، یہ صورت اُس وجود کی بہت اچھی طرح اور بہت صحیح ترجمانی کرتی ہے۔

بعد ازاں جب طبیعت کلیہ[1] کے اندر عناصر و افلاک کا ظہور ہوا تو یہ طبیعت کلیہ اِن عناصر و افلاک میں اسی طرح محفوظ ہوگئی، جس طرح کہ طبیعت ارضی معدنیات، نباتات، حیوانات، اور نوع انسانی میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ اور نیز اس طبیعت کلیہ کے خواص، اُسکے

---

[1] جس طرح ہر چیز کا ایک کلی وجود ایک دوسرے عالم میں موجود ہے۔ اسی طرح طبیعت جو کل کائنات کی ہے، اُس کا بھی ایک کلی وجود پہلے ظہور میں آیا تھا۔ اسکا نام طبیعت کلیہ ہے مترجم

تقاضے اور اُس کی قوتیں بھی ان عناصر و افلاک میں داخل ہوگئیں۔
اب ان عناصر و افلاک کے بعد جب معدنیات، نباتات، حیوانات،
اور بنی نوع انسان معرض وجود میں آئے۔ تو عناصر و افلاک کے طبائع
ان میں منتقل ہوگئے۔ اور اس ضمن میں معدنیات، نباتات، حیوانات
اور بنی نوع انسان کی حیثیت آئینوں کی سمجھئے کہ یہ چیزیں افلاک کے
خواص، اور ان کی حرکات، اور عناصر اور اُن کے طبائع کے اظہار کا ذریعہ
بن گئیں۔ باقی رہا طبیعت کلیہ، وہ تو پہلے ہی اپنی تمام قوتوں کے ساتھ
افلاک و عناصر میں محفوظ ہو چکی تھی۔

الغرض اس طرح بنی نوع انسان کے ہر فرد کے دل کی گہرائیوں
میں، اُس کے جوہر نفس میں، اور اس کی اصل بناوٹ میں اللہ تعالٰی
کو جاننے کی استعداد رکھی گئی ہے۔ لیکن اِس استعداد پر بہت سے
پردے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ پردے انسان کی اِس استعداد پر کیسے
پڑے؟ بات یہ ہے کہ انسان کے نفس کی خاصیت کچھ ایسی ہے
کہ اُس پر ہر طبیعت کا خواہ وہ عناصر و افلاک کی اساسی طبائع میں سے
کوئی طبیعت ہو، یا معدنیات، نباتات اور حیوانات کی طبائع میں سے،
ان میں سے ہر ایک کا انسان پر اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ نفس انسانی ان
طبائع سے جس قدر متاثر ہوتا ہے، اُسی قدر اِس کی فطری جِلا میں کمی
آجاتی ہے اور نفس کے اندر جو نقطہ تدلّی موجود ہوتا ہے، اور جس
کی حیثیت ایک مضبوط رسّی کی سی ہے کہ جس نے اُسے پکڑ لیا، اُس نے

گویا اپنے رب کی معرفت کی رسّی کو پکڑ لیا، طبائع کے ان اثرات کی وجہ سے چھپ جاتا ہے۔ الغرض یہ پردے جو انسان کی اس استعداد پر پڑ جاتے ہیں، یہ تہ بہ تہ اور ایک دوسرے کے اوپر بچھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اب ایک شخص ہے، جس کو کہ "حقیقت الحقائق" کی طرف تنبیہ نصیب ہوا۔ اور اُس نے یہ بھی جان لیا کہ اسی حقیقت الحقائق سے طبیعت کلیہ اور اس کے اجزاء اور انواع کا ظہور ہوا ہے۔ اس شخص کے لئے اللہ کے نور کی مثال قرآن مجید کی اس آیت کی ہے۔ "ایک طاق ہے، جس میں کہ چراغ رکھا ہوا ہے۔ اور یہ چراغ شیشے کے اندر ہے"۔ اس نور سے اس شخص کے تمام حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔ اور یہ حجابات خود اس نور کی روشنی سے جگمگا اُٹھتے ہیں۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ یہ حجابات جو پہلے معرفتِ الٰہی میں حارج تھے، اس نور کی وجہ سے اب بجائے اس کے کہ یہ پہلے کی طرح معرفتِ الٰہی میں سدِّ راہ ہوں، یہ حجابات اُس شخص کو اللہ تعالےٰ کے پہچاننے میں مدد دیتے ہیں۔ اب ایک اور شخص ہے جس کو حقیقت الحقائق کی طرف یہ تنبیہ نصیب نہیں ہوا۔ اور نہ وہ حقیقت الحقائق سے طبیعت کلیہ اور اُس کے اجزاء کا ظہور سمجھ سکا۔ چنانچہ اس کی وجہ سے اس شخص کے نفس پر جو پردے پڑ جاتے ہیں، اُن کی مثال قرآن مجید کی اس آیت کی ہے کہ "ایک عمیق سمندر ہے جس پر تاریکیوں کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ اور سمندر میں موجیں اُٹھ رہی ہیں اور اوپر سے بادل

گھیر گھیر کر آ رہے ہیں"۔

الغرض یہ تو اس بحث کی تمہید ہوئی۔ اس کے بعد تمہیں جاننا چاہیئے کہ نفس انسانی کے جس نقطہ تدلّی کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اُس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جیسے جیسے اسباب و حالات ہوتے ہیں، اُنہی کے مطابق یہ نقطہ تدلّی اور اُس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب اسباب و حالات وافر اور درجۂ کمال کے ہوں تو اُسی قدر یہ نقطۂ تدلّی واضح اور روشن ہوتا ہے۔ اس نقطۂ تدلّی کو برسرِ ظہور لانے والے اسباب میں سے ایک سبب ملاء اعلیٰ ہے۔ اور ملاء اعلیٰ سے میری مُراد یہاں صرف فرشتوں سے نہیں۔ بلکہ ملاء اعلیٰ میں اُن کاملوں کے نفوس کا بھی شمار ہوتا ہے، جب کہ وہ موت کے بعد اپنے آپ سے اپنے بدنوں کے ثقیل حجابات اُتار دیتے ہیں، جو اِس دُنیا کی زندگی میں اُن کے نفوس کو گھیرے رہتے ہیں۔ اور اس طرح وہ ملاء اعلیٰ سے بہت زیادہ مشابہ اور اُن میں بہت بڑا درجہ رکھنے والے ہو جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ جب کوئی کامل اِس دُنیا سے گزر جاتا ہے تو عوام یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بزرگ دُنیا سے نابود ہو گئے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس موت کے بعد اس کامل کا وجود عرض و جوہر کے مرکّب سے نکل کر سرتاپا جوہر ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ اپنے کمال میں اور قوی تر ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ ملاء اعلیٰ کے

جو اکابر ہیں ۔ اُن میں سے ہر بڑے فرد کو اس امر کی توفیق نصیب ہوتی ہے کہ اپنے نفس سے وہ تہ بہ تہ حجابات جو اُس کے اوپر پڑے ہوتے ہیں ، ہٹا کر نقطۂ تدلّی تک پہنچ جائے ۔ اس کے بعد اُس کامل کے نقطۂ تدلّی سے ایک موج اُٹھتی ہے جو اُس کامل کے نفس کے اندر داخل ہوتی ہے ۔ اور اُس سے یہ نفس معرفت الٰہی سے بھر جاتا ہے ۔ پھر یہ موج اُسی تدلّی کی طرف لوٹتی ہے ، چنانچہ اب یہ تدلّی ایک اور تدلّی کے ظہور کا ذریعہ بنتی ہے ۔ یہ دوسری تدلّی اُن انسانی نفوس سے جو اجسام میں محبوس ہیں ، زیادہ قریب ہوتی ہے ۔ اور اس کی وجہ سے ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسانی نفوس پر اس زندگی میں معرفت الٰہی کا فیضان ہوتا ہے ۔ الغرض اس طرح جُوں جُوں زمانہ گزرتا ہے ، اور ملاء اعلیٰ کے انوار بڑھتے جاتے ہیں ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کے اسباب میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔ ان افراد کاملین میں سے بعض افراد تو درجۂ اعلےٰ کے قریب ہوتے ہیں اور بعض اُن سے نیچے ، اور بعض ان دو درجوں کے بیچ ہیں ۔ غرضیکہ ان انوار سے نفوسِ انسانی کی زمین سے لے کر معرفت الٰہی کے آسمان تک جو بھی فضا ہے ، وہ پوری بھر جاتی ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ پہلے کے مقابلے میں بعد کے زمانے میں نفوس انسانی کی معرفت زیادہ تیز اور زیادہ واضح اور نمایاں ہوتی گئی ۔ چنانچہ اسی نکتے کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے ۔

"جب قیامت کا زمانہ قریب آئے گا تو مومن جو بھی خواب دیکھے گا، اُس میں شاذونادر ہی غلطی ہُوا کرے گی"۔

القصّہ جس طرح عناصر و افلاک میں طبیعت کلیہ محفوظ ہے اور معدنیات، نباتات، حیوانات اور بنی نوع انسان میں طبیعت اصلی موجود ہے، اِسی طرح ایک طبیعت عرشی ہے، جس میں انسانی زندگی کے اجتماعی تقاضوں کے علوم جمع ہیں، اور نہ صرف یہ علوم بلکہ اس طبیعت عرشی میں ہر نوع کے اجتماعی تقاضے، نیز تمام کے تمام نفوس اور انواع کے سب کے سب احکام و معاملات کے علوم جمع ہیں۔ چنانچہ جب کوئی شخص زندگی کے اِن اجتماعی علوم کو استنباط کرنے میں کمال حاصل کرتا ہے، تو وہ دراصل اِسی طبیعت عرشی سے کسب فیض کرتا ہے۔ اور جب یہ فیض اُس شخص کے قلب میں اچھی طرح سے راسخ ہو جاتا ہے۔ تو پھر یہ فیض اپنے اصلی مقام یعنی طبیعت عرشی کی طرف لوٹتا ہے، اور اس موقعہ پر اس شخص کے کمال کے مطابق طبیعت عرشی سے دوسرے انسانی نفوس کے لئے ایک اور تدلّی کا ظہور ہوتا ہے۔ اور اس طرح یہ اجتماعی علوم عام ذہنوں میں آسانی سے اپنی جگہ پیدا کر لیتے ہیں۔

اس کے بعد جب یہ کامل اس دُنیا سے وفات پاتا ہے، تو نہ تو وہ خود بالکل نابود ہوتا ہے، اور نہ اُس کا یہ کمال اور نہ اُس کے نفس کا وہ ظرف جو طبیعت عرشی کی تدلّی کا مرکز بنا تھا، فنا ہوتا ہے۔ بلکہ ان میں سے ہر چیز اپنی اصلی حالت پر رہتی ہے۔ چنانچہ اس طرح کے جو

، صاحب کمال نفوس ہوتے ہیں، اُن میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے تقویت کا سبب بنتا ہے۔ ان نفوس کی نسبت "طبیعت انسانیہ" سے جو عالم مثال میں ایک شخص واحد کی طرح موجود ہے، ایسی ہی ہے؛ جیسے کہ انسان کی قوتوں اور اُس کے ذہنی تصورات کی نسبت خود اُس سے ہوتی ہے۔ غرضیکہ جس طرح منطقی استدلال میں مقدمات ذریعہ بنتے ہیں نتیجہ اخذ کرنے کا، اسی طرح پاکیزہ نفوس بھی واسطہ ہوتے ہیں دوسرے نفوس کے لئے حصول پاکیزگی کا۔ اور یہی وہ معرفت ہے جس کی طرف میں نے اپنے "قصیدہ "لامیہ" کے اس شعر میں اشارہ کیا ہے:-

شَہِدْتُ تَدَاوِیرَ الْوُجُوْدِ جَمِیْعَہَا
تَدُوْرُ کَمَا دَارَ الرَّحیٰ المتمایل

وجود کے جتنے بھی چکر ہیں، میں نے اُن سب کا مشاہدہ کیا۔ اور وجود اس طرح چکر کاٹ رہا تھا جیسے کہ چکی ایک طرف جھکی ہوئی چکر لگاتی ہے :-

بارھواں مشاہدہ

مدینہ منورہ میں قیام کے دوران میں بالجملہ میرے ساتھ یہ اکثر ہُوا کہ جب بھی میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قبر کی طرف متوجہ ہُوا میں نے آپؐ کو حاضر و ظاہر پایا۔ اور وہ اس طرح کہ یا تو میری رُوح کی آنکھ کھُل گئی۔ اور میں نے آپؐ کو جس حالت میں کہ آپ تھے، دیکھا اور یا میرا نفس آپؐ سے بے حد متاثر ہُوا۔ اور میرا یہ تاثر ہی ذاتِ اقدسؐ کا ترجمان بن گیا۔ چنانچہ ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں آپ کی طرف متوجہ ہُوا۔ اور اُس وقت میرے اندر یہ شوق بھرا ہُوا تھا کہ انسانی نفوس کے حالات و کوائف کے مطابق مجھے جو شرعی احکام و قواعد کے معارف کو استنباط کرنے، اور جُود الٰہی کے جو مختلف مراتب ہیں، اُن کے علوم سے بہرہ ور ہونے کی خصوصیت دی گئی ہے، خُدا

کرے میرے سامنے اس خصوصیت کی جو اصل حقیقت ہے، وہ عیاں ہوجائے۔ الغرض میں اس فکر میں تھا کہ میرا نفس ذاتِ اقدس سے ملحق ہوگیا۔ اور اس کی وجہ سے میرے اندر اُن علوم و معارف کی خوشی اور ٹھنڈک یکسر سما گئی۔

علاوہ ازیں ایک دن مجھ پر ذاتِ حق کی نظر کا فیضان ہوا۔ اور یہ وہ چیز ہے جو انبیاء میں سے صرف ہمارے ہی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نصیب ہوئی ہے، جیسا کہ تدلّی کے سلسلہ میں ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ ذاتِ حق کی نظر کا یہ فیضان آپؐ کی ذات کے لئے خاص تھا۔ اور جب آپؐ عالمِ ناسوت میں تشریف لائے، تو وہ فیضان بھی عالمِ ناسوت میں آپ کے ساتھ منتقل ہوگیا۔ الغرض جب مجھ پر ذاتِ حق کی نظر کا یہ فیضان ہوا تو میں بھی پوری توجہ سے اُدھر ملتفت ہوا۔ اس سے اس فیضان کا ایک رنگ میرے اندر جاگزیں ہوگیا۔ اور اُس وقت میں نے اپنے آپ کو یوں محسوس کیا جیسے کہ اللہ تبارک و تعالےٰ میری طرف دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ مجھے یقین ہوگیا کہ ذاتِ حق کی یہ جو نظر ہے اور جس کا مطمح میں بنا ہوں، اِس کی خصوصیت یہ ہے کہ جس شخص پر ذاتِ حق کی اس نظر کا فیضان ہوتا ہے، وہ شخص جب کسی جگہ بیٹھ کر اپنے رب کا ذکر کرتا ہے، تو تمام کی تمام زمینیں اور سارے کے سارے آسمان اُسکی پیروی کرتے ہیں۔ اور خاص طور پر زمین کے وہ اجزاء جو پاتال تک نیچے چلے گئے ہیں، اور فضا کے وہ حصّے جو ساتویں آسمان بلکہ عرش تک

پھیلے ہوئے ہیں۔ اور نیز جب یہ نظرِ حق کسی شخص میں جاگزین ہو جائے تو وہ قطب بن جاتا ہے۔ مزید براں میں اس نظر کے فیضان کے وقت اس حقیقت کو بھی جان گیا کہ یہ نظر اور نقوش کی طرح دل کے اندر نقش نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ انسان کی رُوح کے اصل جوہر اور اُس کے نفس کی گہرائی میں اپنی جگہ بناتی ہے +

نیز ایک دن کا واقعہ ہے کہ میرے سامنے ملاء سافل کے رنگ میں ایک نُور ظاہر ہُوا۔ اور مَیں نے دیکھا کہ یہ نُور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ مُبارک سے چشمے کی طرح پوری قوت سے پھوٹ رہا ہے +

تیرھواں مشاہدہ

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مصلّے پر جو مسجد نبوی کے منبر اور آپؐ کی قبر کے درمیان ہے، چاشت کی نماز پڑھ رہا تھا کہ مجھ پر وہ راز ظاہر ہوا، جس راز کی اصل کا میں نے حقیقتِ کعبہ سے استفادہ کیا تھا، اور وہ راز ہے ملاء اعلیٰ کا قرب اور عبادت کا جوہر اصلی۔ چنانچہ اس وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اشارہ کا کہ "مسجدوں میں خوب دعائیں کرو" اور نیز آپؐ کے ایک صحابی کو یہ کہنے کا کہ "کثرتِ سجود سے اپنے نفس کی مدد کرو" مطلب سمجھا۔ بات یہ ہے کہ ملاءِ اعلیٰ کا قرب صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ بڑی عاجزی اور پوری توجہ سے دعا کی جائے۔ اور آدمی اپنے آپ کو اللہ کے روبرو ڈال دے۔

اور اُس کی بارگاہ میں عجز و زاری کرے۔ اور اُس کے آستانے کو اپنے لئے پناہ گاہ بنائے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی سجدے میں پڑکر خُدا سے پوری توجّہ اور ہمّت سے دُعا کرے۔ کیونکہ سجدہ ہی دراصل ملاء اعلیٰ کے قرُب کا قالب ہے۔ اور ایک چیز کے قالب کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ یہی قالب راستہ اور ذریعہ بنتا ہے اُس چیز کے اصل جوہر تک پہنچنے کا۔

الغرض اللہ تعالےٰ کی رحمتِ عامّہ جب نوعِ بشر کی طرف متوجّہ ہُوئی۔ اور اُس نے انسانوں کو اس رحمت سے مستفیض فرمانے کا ارادہ کیا تو اس رحمتِ عامّہ کی معطّر لپٹوں سے متعلق ہونا، اُس کے نزول کو ممکن بنانا، اور اُس کے لئے وجود میں آنے کا سامان کرنا، ظاہر ہے یہ سب چیزیں اس رحمت کے لئے بطور مدد اور اعانت کے ہوں گی۔ اور ان سے رحمت کا جو اصل مقصد ہے، وہ تکمیل پذیر ہوگا۔ اور چونکہ سجدہ اللہ تعالےٰ کی رحمت عامّہ سے تعلّق کی قریب ترین صورت ہے، اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر کثرتِ سجدہ کا حکم دیا۔ اس ضمن میں مجھ پر آپؐ کے اس ارشاد کی بھی حقیقت ظاہر ہوئی جس میں کہ آپؐ نے اپنے صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ "کیا تمہاری آنکھوں کو چودھویں رات میں ماہِ کامل کو دیکھنے سے اذیت ہوتی ہے؟" اس پر صحابہ نے جواب دیا کہ بالکل نہیں۔ اس پر آپؐ

نے ارشاد فرمایا۔ کہ "تم بعینہٖ اسی طرح قیامت میں اپنے رب کو دیکھو گے۔ تمہیں چاہیے کہ طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب سے پہلے کی جو نمازیں ہیں، اُن کو کبھی ترک نہ کرو۔ اور اس معاملہ میں کسی چیز سے مغلوب نہ ہو" یعنی مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ کی جو تجلّی ہوگی، وہ وہی تجلّی ہے جو نمازی کے سامنے جب کہ وہ نماز پڑھ رہا ہوتا ہے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اور یہی وہ تجلّی ہے جو اُس حدیث کے مطابق جس میں کہ آپؐ نے فرمایا کہ "بندہ جب نماز پڑھتا ہے تو خُدا اُس میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ یعنی جب وہ کہتا ہے "الحمد للہ" تو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف کی ...... الخ" الغرض اللہ تعالےٰ کی یہی وہ تجلّی ہے جو نماز میں بندے کے ساتھ شریک ہوتی ہے اور اُس کی دعاؤں کا جواب دیتی ہے لیکن اس ضمن میں ہوتا یہ ہے کہ لوگوں کو اس زندگی میں ان کے حجاباتِ بدن رُوح کی آنکھ سے بھی اس تجلّی کو دیکھنے نہیں دیتے۔ اگرچہ رُوح کی آنکھ جسم کی آنکھ پر غالب ہوتی ہے۔ لیکن جب قیامت کا دن آئے گا۔ اور بدن کے یہ حجابات چھُٹ جائیں گے تو اُس دن رُوح کی آنکھ بذاتِ خود مستقل حیثیت اختیار کرلے گی۔ اور جسم کی آنکھ وہاں روح کی آنکھ کے تابع ہوگی۔ بات یہ ہے کہ آخرت میں زندگی کی جو بھی شکل ہوگی، وہ اس دُنیا ہی کی زندگی کا حاصل نتیجہ ہوگی۔

چنانچہ رُوح کی آنکھ جو اس دُنیا میں بعض افراد کو عطا ہوتی ہے۔ اِس رُوح کی آنکھ میں، اور وہ آنکھ جو آخرت میں عامۂ مسلمین کو میتسر ہو گی، کوئی فرق نہیں۔ البتہ عامۂ مسلمین کو اِس زندگی کے بعد حجابات بدن اُتارنے پر ہی رُوح کی اس آنکھ سے بہرہ یاب ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔ لیکن بعض ممتاز افراد کو اِس دُنیا کی زندگی ہی میں یہ آنکھ میتسر ہو جاتی ہے۔

اِس کے بعد مَیں نے دیکھا کہ قرآن کی ہر آیت اور ہر حدیث گویا ایک بحرِ مواج ہے اسرار و رموز کا۔ اور اگر مَیں اِن میں سے ایک کی بھی شرح لکھنے بیٹھوں تو جلدیں کی جلدیں لکھی جائیں۔ اور پھر بھی اُس کا حق ادا نہ ہو۔ نیز میں نے دیکھا کہ قرآن اور سنّت کے اشارات میں بڑے بڑے پوشیدہ اسرار ہیں، اور مجھے یہ معلوم کر کے بڑا تعجب ہُوا۔ اس کے بعد میرے لئے اللہ تعالیٰ کی تدلی اعظم ظاہر ہُوئی تو مَیں نے اُسے بے کنار اور غیر متناہی پایا۔ اور اُس وقت میں نے اپنے نفس کو بھی غیر متناہی پایا اور مَیں نے دیکھا کہ میں گویا ایک غیر متناہی ہوں، جو دوسرے غیر متناہی کے مقابل ہے۔ اور میں اُس غیر متناہی کو اپنے اندر نگل گیا ہُوں۔ اور میں نے اس غیر متناہی میں سے کچھ باقی نہیں چھوڑا۔ اسکے بعد جو میں نے اپنے نفس کی طرف رجوع کیا تو کچھ دیر تک میں اپنے نفس کی اس عظمت اور وسعت نے حیرت میں رہا لیکن پھر یہ حالت مجھ سے جاتی رہی تو مَیں نے دیکھا کہ مَیں نور سے بھرا ہُوا ہُوں اور میرے اوپر، میرے نیچے، میرے دائیں اور میرے بائیں الغرض ہر طرف سے مجھ پر نور کی بارش ہو رہی ہے بلکہ میں نے تو یہاں تک دیکھا کہ میرے دل سے، میری آنکھوں سے، میرے ہاتھ سے، میرے تمام اعضاء و جوارح سے نور چشمے کی طرح اُبل رہا ہے۔

چودھواں مشاہدہ

مَیں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثالی صورت میرے سامنے سے غائب ہوگئی۔ اور اُس کی بجائے آپؐ کی رُوح کی حقیقت اُن تمام لباسوں سے جو اُس نے پہن رکھے تھے، یہاں تک کہ نسمے کے بعض اجزاء سے بھی منزّہ اور مجرّد ہو کر میرے سامنے تجلّی پذیر ہوئی۔ اُس وقت مَیں نے آپؐ کی رُوح کو اُسی طرح پایا، جس طرح مَیں نے بعض اولیائے متقدمین کی ارواح کو دیکھا تھا۔ اور اِس کے بعد خود میری رُوح سے آپؐ کی رُوح سے ملتی جلتی ایک مجرّد صورت ظاہر ہوئی۔ اور اس وقت مَیں نے اس قدر جذب و شوق، اور رفعت و بلندی کا مشاہدہ کیا کہ زبان اس کو بیان نہیں کر سکتی ۔

پندرھواں مشاہدہ

مَیں نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس سے کسبِ فیض کیا، تو اس سے میرے نفس میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی۔ اور اس کی وجہ سے مَیں آپؐ کی وراثت کے ضمن میں تدلّی اعظم کے اُس مثالی مظہر سے جا ملا جو کہ آپؐ کے ساتھ عالمِ مثال سے عالمِ ناسوت میں منتقل ہُوا تھا۔ چنانچہ مَیں اس مظہر سے متصل ہُوا۔ اور اُس سے گھل مل گیا، اور اُس سے مَیں مخلوط ہوگیا۔ اُس وقت میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ تدلّی اعظم کے اس مثالی مظہر کے جو دو قالب ہیں، مَیں اُن میں سے ایک قالب ہُوں۔ اس مثالی مظہر کا ایک قالب زیادہ مکمل اور زیادہ عام ہے۔ اور یہ وجود خارجی سے زیادہ قریب ہے۔ اور اس قالب سے دوسرے قالب کی نسبت ایسی ہے جیسے کہ نقشہ کا

ایک صاحب مذہب (مثلاً امام ابو حنیفہؒ) ہو۔ اور دوسرا گو فقہ میں اُس صاحب مذہب کا تابع ہو، لیکن ... نئے نئے فقہی مسائل کا استنباط کر سکے۔ تدلّی اعظم کے اس مثالی مظہر کا یہ دوسرا قالب وجودِ علمی سے قریب ہوتا ہے +

اس موقعہ پر میرا نام "زکی" اور "نقاطِ علم کا آخری نقطہ" رکھا گیا۔ اور نیز اُس وقت مجھے معلوم ہُوا کہ جو شخص تدلّی اعظم کے اس مثالی مظہر سے متصل ہو جاتا ہے اور اُس سے اس طرح گھُل مِل جاتا ہے یعنی یہ مثالی مظہر اُس کے جوہرِ رُوح میں اس طرح داخل ہو جاتا ہے جیسے راہِ سلوک کے سلسلہ میں "یادداشت" کی نسبت سالک کے جوہرِ نفس میں داخل ہو جاتی ہے تاکہ اس طرح بیداری کا وہ نقطہ جس کو لے کر انسان پیدا ہوتا ہے، وہ اُس کے اندر بیدار ہو جائے۔ الغرض جو شخص تدلّی اعظم کے اس مثالی مظہر کو اس طرح اپنے اندر لے لیتا ہے، اُس کے مقامات میں سے مجدّدیت، وصایت، قطبیت اور طریقت کی امامت ہے۔ اور اُس شخص کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اُس کے بعد بھی اُس کا نام باقی رہتا ہے۔ یہ ایک عمیق راز ہے تمہیں چاہیے کہ اس میں خُوب غور کرو +

سولھواں مشاہدہ

مَیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں کھڑا ہُوا۔ اور مَیں نے آپؐ کو سلام عرض کیا۔ اور بڑی عاجزی سے میں نے آپؐ کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلائے۔ اور اپنی رُوح کو آپؐ کی رُوح اقدس سے متصل کر دیا۔ چنانچہ آپؐ کی رُوح اقدس سے ایک بجلی چمکی۔ اور میری رُوح نے لمحہ بھر میں یا اُس سے بھی کم مدّت میں اس بجلی کو اچھی طرح سے اپنے اندر جذب کر لیا۔ مجھے اس پر تعجب ہُوا کہ میری روح نے کتنی جلدی اِس بجلی کو جذب کر لیا ہے۔ اور یہ کس طرح اُس بجلی کی اصل، اُس کی فرع اور اُس کے تمام اطراف پر آنِ واحد میں بلکہ اُس سے بھی کم مدّت میں حاوی ہو گئی ہے۔ یہ بجلی گویا تجلّی تھی قدرت کے اُس سلسلۂ دراز کی، جس میں کہ یہ تمام کا تمام عالم بندھا

ہُوا ہے۔ مَیں نے دیکھا کہ یہ تجلّی آپؐ کی رُوح کے اصل جوہر میں داخل ہے۔ اور یہ سلسلۂ دراز عبارت ہے اُس تدبیرِ واحد سے جس کا کہ مبدائے اوّل سے فیضان ہوتا ہے۔ اور یہ سارے کا سارا عالم بس اُس کی تفصیل ہے۔ اور اس سلسلۂ دراز کی فروع وہ تفصیلی تدبیریں ہیں، جن پر یہ سارا عالم قائم ہے۔ اُس وقت میں یہ سمجھا کہ یہی سلسلۂ دراز اصل حقیقت ہے "حقیقت محمّدیہ" کی۔ اور جو بھی قطب، محدّث یا نبی ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اُس سے کلام کرتا ہے تو اُس کو اسی "حقیقت محمدیہ" سے حصہ ملتا ہے۔ باقی اِن امور کو اللہ بہتر جانتا ہے ؛

سترھواں مشاہدہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خود بہ نفس نفیس سلوک کے راستے پر چلایا۔ اور اپنے مبارک ہاتھوں سے میری تربیت فرمائی۔ چنانچہ میں آپؐ کا اویسی[1] اور براہِ راست آپؐ کا شاگرد ہوں۔ اور اس معاملے میں میرے اور آپؐ کے درمیان اور کوئی واسطہ نہیں۔ اور یہ اس طرح ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنی رُوحِ اقدس کے دیدار سے مشرف فرمایا۔ اور اُس سے

---

[1] حضرت اویس قرنی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ آپؒ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے لیکن آپؐ سے مل نہ سکے۔ اور اس کے باوجود آپؐ کے فیوض روحانی سے مستفید ہوتے۔ وہ لوگ جو کسی شیخ سے ملے بغیر اُس کی رُوح سے فیض حاصل کریں۔ وہ اویسی کہلاتے ہیں۔ (مترجم)

میرا تعارف کرایا۔ کیونکہ بات یہ ہے کہ فیض پانے سے پہلے خود فیض کرنے والے کی ذات کو جاننا ضروری ہے۔ اسی ضمن میں مجھے یہ معلوم ہُوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح تو محسوسات تک کو بھی خوب جانتی ہے۔ اس کے بعد میرے سلوک کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں سب سے پہلے آپؐ نے مجھ پر ذاتِ حق کی تجلّیات میں سے ایک تجلّی کا فیضان فرمایا۔ اور یہ وہی تجلّی تھی جو آپؐ کے وجودِ اقدس کے ساتھ ساتھ مثالی منظر میں ظہور پذیر ہوئی۔ چنانچہ مَیں نے اس تجلّی کو اپنی رُوح کے جوہر میں لے لیا۔ اور مَیں اس میں محو ہو گیا۔ اور مجھے اس کے اندر درجۂ فنا حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد مَیں اس تجلّی کے ساتھ پھر اپنے وجود میں آ گیا۔ اور اس طرح مَیں اُس تجلّی میں فنا ہونے کے بعد مقامِ بقا سے سرفراز ہُوا ۔

دوسری بار آپؐ نے مجھ پر ایک اَور تجلّی کا فیضان فرمایا۔ اور یہ تجلّی اصل تھی اوپر ذکر شدہ مثالی منظر کی۔ اور اسکی حقیقت گویا ایک نقطے کی سی ہے جو اس دُنیا میں ذاتِ حق کے تمام کاموں اور اُس کی تمام تدبیروں کی اصل ہے۔ میں نے اس تجلّی کو بھی پہلی تجلّی کی طرح اپنے اندر جذب کر لیا۔ اور میں اس میں فنا ہو گیا۔ اور اس میں فنا ہونے کے بعد مَیں نے پھر مقامِ بقا حاصل کر لیا ۔

آپؐ نے تیسری بار ایک اَور تجلّی کا مجھ پر فیضان فرمایا۔ اور

یہ تجلّی عبارت تھی نقطۂ ذات سے ۔جس کے ساتھ جبروت کا رنگ بھی ملا ہوُا تھا۔ مَیں نے اس تجلّی کو بھی جذب کر لیا۔ اور میں نے اس میں بھی فنا ہو کر بقا حاصل کر لی۔ پھر چوتھی بار مجھ پر ایک اَور فیضان ہوُا اور یہ فیضان ایک نقطے کا تھا جو روحانیات میں مستقر ہے۔ اور اسی سے "اندراج النہایہ فی البدایہ"[1]، حاصل ہوتا ہے۔ مَیں نے اُسے بھی قبول کر لیا۔ اور اُس میں بھی مَیں نے فنا اور بقا کا مقام حاصل کیا۔ پانچویں بار آپؒ نے مجھے نسمہ کے احوال دکوائف میں سے ایک ایسے نقطے سے متعارف کرایا جو اُس نقطہ کے مقابل ہے، جس کا کہ ذکر ابھی ہوُا ہے۔ اور نسمہ کا یہ نقطہ گویا اُس نقطۂ روحانیت کا بالکل عین ہے۔ اس ضمن میں مجھے معلوم ہوُا کہ جو شخص نسمے کے اس نقطہ کو حاصل کرلے، وہ اپنے شاگرد پر بڑی تاثیر ڈال سکتا ہے۔ اور یہ نقطہ عزم اور جرأت سے بہت مشابہ ہے۔ عزم اور جرأت سے میری مُراد کسی چیز کا عزم کرنے یا کسی کے خلاف جرأت کرنے سے نہیں ہے، بلکہ اس سے میرا مطلب فی نفسہٖ عزم و جرأت سے ہے۔ الغرض راہِ سلوک میں میرے لئے صعود اور ہبوط کی یعنی اوپر جانے اور نیچے اُترنے کی یہ مہم اس طرح تمام ہوئی۔ اور سلوک کا یہی وہ مختصر طریقہ ہے جو "جذب" سے بہت مناسب ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کے حال سے بھی بہت مشابہ ہے +

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے صفحہ ۶۰

اٹھارھواں مشاہدہ

اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے سلوک میں اپنے طریقے کا ایک قالب مجھے عطا فرمایا۔ چنانچہ میں نے اُن کا آپ کی روحِ اقدس سے براہ راست استفادہ کیا۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالےٰ نے جو چیز مجھے عطا فرمائی تھی، اُس نے اُس چیز کی حقیقت سے بھی مجھے مطلع کیا۔ اور میں نے اُس چیز کو جہاں تک کہ اُس کے سمجھنے کا حق تھا، سمجھ بھی لیا۔ اور اسی ضمن میں مَیں نے یہ بھی جان لیا کہ یہ جو کچھ مجھے عطا ہوا ہے، یہ اُس حقیقت کا صرف قالب ہے، یہ خود بنفسہٖ وہ حقیقت نہیں، الغرض اس سلسلہ میں جو کچھ میں نے جانا ہے، اُس میں سے چند باتیں تم سے کہتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ تعریف تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لئے ہے، جو کہ تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

طریقۂ سلوک کی حقیقت کا بیان ——— تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے جو مقرب بندے ہیں، اُن میں سے جس پر چاہتا ہے، وہ اپنا فضل و کرم کرتا ہے۔ یعنی اُس کو طریقۂ سلوک سے نوازتا ہے، چنانچہ کتنے ہی عارف ہیں جو اس نکتہ کو صحیح طور پر سمجھنے سے عاجز رہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اس عارف کو ایسے اذکار و افکار سے مطلع فرماتا ہے، جن کے ذریعے یہ عارف سلوک کی راہ طے کر کے فنا و بقا کے مقام پر پہنچ جاتا ہے، اُس وقت یہ عارف یوں کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے سلوک کے طریقے سے سرفراز فرمایا۔ اور بے شک اس میں وہ اپنے خیال کے مطابق سچا ہوتا ہے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ طریقۂ سلوک ان اذکار و افکار کا نام نہیں۔ بلکہ یہ عبارت ہے اُس حقیقت سے جو ملاءِ اعلیٰ میں مستقر ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر سلوک کے اس طریقے کے متعلق ایک فیصلہ فرماتا ہے اور یہ فیصلہ وہاں سے ملاءِ اعلیٰ میں نازل ہوتا ہے۔ اور وہاں پر یہ جاگزیں ہو جاتا ہے۔ پھر اس فیصلے کے مطابق عالمِ ناسوت میں حکم اُترتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ملاءِ اعلیٰ میں اللہ تعالیٰ کے ہر ارادہ اور اُس کی ہر خواہش کے لئے جب تک کہ وہ وہاں موجود رہے، اِس عالمِ ناسوت میں اُس کا کوئی نہ کوئی نمونہ یا اُس کا محل اور ظرف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اس عالم میں کسی سلوک کا طریقہ منسوخ ہو جاتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ ملاءِ اعلیٰ میں اللہ کا جو ارادہ اس سلسلہ

ہیں قائم و مستقر تھا، اور جس کا لازمی نتیجہ سلوک کا یہ طریقہ تھا، ارادہ بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد تم کو لوگوں میں کہیں بھی اس طریقۂ سلوک کا نمونہ، یا اُس کا محل اور ظرف نظر نہیں آئے گا۔ اب اگر تمام کے تمام اہلِ زمین جمع ہو جائیں اور وہ چاہیں کہ وہ طریقہ سلوک جس کے متعلق ارادۂ الٰہی ملاء اعلیٰ میں قائم ہے، اُس طریقے کا عالمِ ناسوت میں جو محافظ ہے، اور میری مُراد محافظ سے اُس ارادۂ الٰہی کے نمونے یا محل یا ظرف سے ہے، جس کا کہ ابھی ذکر ہوا ہے، اُس محافظ کو نابود کر دیں۔ اور اِس سلسلہ میں وہ اس طریقے کے اصحاب اور اُس کی حفاظت کرنے والوں کو بے دریغ قتل بھی کریں، لیکن جب تک اِس طریقے کی اصل بنیاد یعنی اُس کے متعلق ارادۂ الٰہی جو ملاء اعلیٰ میں قائم و مستقر ہے برقرار ہے، یہ سب کے سب لوگ خواہ وہ کتنی بھی کوشش کریں، اس طریقے کو عالمِ ناسوت سے فنا نہیں کر سکتے۔ اور اس طرح اگر تمام کے تمام اہلِ زمین جمع ہو کر اس امر میں کوشاں ہوں کہ جب ملاء اعلیٰ میں اس طریقۂ سلوک کا تقاضہ موجود نہیں رہا، وہ اس زمانے میں اس طریقے کی کسی کجی کو ٹھیک کر دیں۔ یا اُس میں جو مفاسد پیدا ہو گئے ہیں، اُنکی اصلاح کریں، تو وہ کبھی بھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک تالاب یا حوض ہے، جس میں ستاروں کا عکس پڑ رہا ہے، اب جب تک کہ تالاب یا حوض میں پانی ہے۔ اور آسمان پر ستارے، کسی بشر کی یہ طاقت نہیں کہ وہ پانی میں ان ستاروں

بکے عکس کو روک سکے +

الغرض سلوک کا یہ طریقہ درحقیقت وہ اذکار و افکار نہیں ہیں، جو اس عالمِ ناسوت میں موجود ہوتے ہیں۔ بلکہ اس طریقے کی اصل وہ ارادۂ الٰہی ہے، جو ملاء اعلیٰ میں قائم ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ خود کسی بندے کے حق میں فیصلہ فرماتا ہے تو پھر اُسے سلوک کا یہ طریقہ عطا ہوتا ہے، اب رہا اس طریقے کے متعلق ارادہ الٰہی جو ملاء اعلیٰ میں قائم ہے، اُس کی تشریح و توضیح اور اُس کے اجزاء اور ارکان کا بیان تو یہ سوائے اُس شخص کے جو بہت ہی ذہین ہو، کسی کے لئے ممکن نہیں، اور اس ضمن میں میرے رب نے جو کچھ مجھے بتایا ہے، وہ یہ ہے کہ پہلے آسمان سے ارادۂ الٰہی کے سلسلہ میں جو مدد نازل ہوتی ہے، وہ نقول، توسطات اور لباس کی صورت میں ہوتی ہے۔ اور دوسرے آسمان سے مدوّن و مرتب قواعد جو لکھے جاتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں، نازل ہوتے ہیں۔ اور پھر ایک بزرگ سے دوسرے بزرگ تک ان کی روایت ہوتی ہے اور ان قواعد کو انسانوں کے سینے اپنے اندر جگہ دیتے، اور کتابوں کے سفینے اُن سے اپنے صفحات بھرتے ہیں۔ تیسرے آسمان سے ایک طبیعی رنگ کا فیضان ہوتا ہے۔ اور یہ رنگ طبیعت بن جاتا ہے۔ چنانچہ لوگوں کے طبائع اس طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور اس طبیعی رنگ کے لئے اُن کے اندر جوش اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ اُس کی حمایت کرتے ہیں، اُس کی مدد کو پہنچتے ہیں، اور اُس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور اُس سے

ایسی محبّت کرتے ہیں، جیسے اپنے اموال سے ، اپنی اولاد سے ، اور اپنی جانوں سے +

چوتھے آسمان سے تجلیٔ قوت اور تسخیر کا نزول ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے بڑے اور چھوٹے ، علماء اور امراء سب کے سب اس سے مسخر ہو جاتے ہیں۔ پانچویں آسمان سے سختی اور شدت نازل ہوتی ہے ، چنانچہ اُس سے جو انکار کرتا ہے ، تم اُس کو مصیبتوں میں گرفتار ، بلاؤں میں مبتلا اور ملعون اور عذاب میں اسیر دیکھو گے۔ گویا غیب کی کوئی قوت ہے جو اُس کی مدد کر رہی ہے۔ چھٹے آسمان سے اس پر بڑی پُر عظمت ہدایت کا فیضان ہوتا ہے ، جس کی وجہ سے وہ شخص لوگوں کی ہدایت کے لئے ایک واسطہ بن جاتا ہے۔ اور ساتویں آسمان سے اُسے ایک مستقل شرف عطا ہوتا ہے جو پتھر کے اندر کی اُس لکیر کی طرح ہوتا ہے کہ جب تک پتھر کے جوڑ جوڑ الگ نہ کئے جائیں۔ اور اُس کے اجزا کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیا جائے ، یہ لکیر اُس پتھر سے زائل نہیں ہو سکتی" +

یہ سات ارکان ہیں ، جن کا ارادۂ الٰہی کے ضمن میں سات آسمانوں سے اس طرح فیضان ہوتا ہے۔ اور یہ سب کے سب ارکان ملاء اعلیٰ میں اس طرح مل جاتے ہیں کہ ان تمام کا وہاں ایک جسم بن جاتا ہے۔ اور پھر اس جسم میں تدلّی اعظم کی طرف سے "جذب" کی رُوح پھونکی جاتی ہے ، جو اس کے لئے وہی حیثیت رکھتی ہے جو ایک انسانی جسم میں روح کی ہوتی ہے۔ چنانچہ جو شخص اس طریقۂ سلوک کے اذکار و

افکار کا لباس پہن لیتا ہے۔ اور اُس کے حسن و جمال سے وہ آراستہ و پیراستہ ہو جاتا ہے، تو اِس کی وجہ سے اُس کو رحمتِ الٰہی ڈھانپ لیتی ہے۔ اور اُس پر اُس کے اوپر سے، اُس کے نیچے سے، اُس کے دائیں سے اور اُس کے بائیں سے، اور وہاں سے جہاں کا کہ اُسے سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ "جذب" کا نزول ہوتا ہے، اور پھر ملاءِ اعلےٰ کے اکابر راہ سلوک کے اس طفل کی تربیت کرتے ہیں، اور ملاءِ سافل والے اُس کی خدمت کرتے ہیں۔ اور اس طرح سلوک کے اس طفل کی حیثیت برابر مستقل ہوتی جاتی، اور اُس کی شان بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ساعت آتی ہے کہ اس کے متعلق اللہ کا حکم صادر ہو جاتا ہے۔ الغرض اس طرح سلوک کا طریقہ معرضِ وجود میں آتا ہے۔

سلوک کے طریقہ کی اس مثال پر تم اُن مذاہب کا بھی قیاس کر لو، جو دین کے اصول و فروع کے سلسلہ میں بنتے ہیں۔ اب ایک شخص ہے جو یہ دعوےٰ کرتا ہے کہ اللہ نے اُسے سلوک کا کوئی طریقہ یا فقہ کا کوئی مذہب عطا فرمایا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے، اگر اس طرح ملاءِ اعلےٰ کی طرف سے اُسے یہ طریقۂ سلوک اور مذہبِ فقہ نہیں دیا گیا تو یقیناً وہ اِس معاملے کی جو اصل حقیقت ہے، اُس کو سمجھنے سے عاجز رہا۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ ہر شخص کو خدا تعالیٰ کی طرف سے سلوک کا طریقہ یا فقہ کا مذہب یُوں ہی نہیں مل جایا کرتا۔ اللہ کے

ہاں اندھیرا نہیں، اور نہ اُس کے ہاں کسی چیز میں گڑبڑ ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ نعمت اُسی کو ملتی ہے، جو اپنی جبلت سے مبارک اور پاک ہو، اور اُس کو سات آسمانوں سے، ملاءِ اعلیٰ سے اور ملاءِ سافل سے مدد ملے۔ اور نیز وہ تدلّیِ اعظم کی مخصوص رحمت سے بہرہ یاب ہو۔ الغرض کتنے ہی عارف ہیں، جو بڑی معرفت والے اور مقامِ فنا میں بڑھے پہنچے ہُوئے اور مقامِ بقا کے کامل ہیں، لیکن چونکہ اُن کی جبلت مبارک اور پاک نہ تھی، اس لئے اُن کو یہ نعمت عطا نہ ہُوئی۔ اور پھر ہر شخص کا یہ منصب بھی نہیں ہوتا کہ وہ طریقۂ سلوک کی حفاظت کر سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر کام کے لئے ایک آدمی ہوتا ہے، جو اُس کام کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اُس میں اُس کام کو کرنے کی جبلّی استعداد ہوتی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ سلوک کے طریقے کے ظہور کی کیا صورت ہوتی ہے، تو اس کے متعلق واضح ہو کہ یہ عام متعارف مظاہر سے الگ کسی دوسرے مظہر کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اور اس کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے اشیاء اور افعال میں بڑی برکت پیدا ہو جاتی ہے۔

اُنیسواں مشاہدہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنفی مذہب کے ایک بڑے اچھے طریقے سے مجھے آگاہ فرمایا۔ اور حنفی مذہب کا یہ طریقہ اُن مشہور احادیث سے جو امام بخاری اور اُن کے اصحاب کے زمانے میں جمع کی گئیں، اور اُن کی اُس زمانے میں جانچ پڑتال بھی ہوئی، موافق تریں ہے۔ اور وہ طریقہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ امام ابویوسف اور امام محمد کے اقوال میں سے وہ قول لیا جائے جو مسئلہ زیر بحث میں مشہور احادیث سے سب سے زیادہ قریب ہو۔ اور پھر اُن فقہائے احناف کے فتاوے کی پیروی کی جائے، جو علمائے حدیث میں شمار ہوتے ہیں، چنانچہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ امام ابوحنیفہ اور اُن کے دونوں ساتھی جہاں تک کہ اُن چیزوں کے اصول کا تعلق تھا، وہ

اس معاملے میں خاموش رہے۔ اور اُنھوں نے اُن کے بارے میں ممانعت کا کوئی حکم نہیں دیا۔ لیکن ہمیں ایسی احادیث ملتی ہیں، جن میں ان چیزوں کا ذکر ہے۔ اس حالت میں ان چیزوں کا اثبات ظاہر ہے لازمی اور ضروری ہوتا ہے۔ اعمال اور احکام میں اس روش کو اختیار کرنا بھی مذہب حنفی میں داخل ہے۔

بیسواں مشاہدہ

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اور آپؐ کے منبر کے بیچ کا قطعۂ زمین جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے۔ جہاں تک اس واقعہ کی اصل حقیقت کا تعلق ہے، وہ یہ ہے کہ ہم نے سب انوار سے برتر و فائق نور اس مقام پر دیکھے ہیں۔ اور نیز ہم نے دیکھا ہے کہ جو شخص وہاں نماز پڑھتا ہے، وہ نور کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے، خواہ وہ اُس طرف ملتفت ہی کیوں نہ ہو۔ باقی رہا یہ سوال کہ یہ ہوتا کیسے ہے؟ سو اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے، یعنی اُس کے جوہر رُوح میں تدلّی اعظم کا مثالی مظہر اور وہ نقطۂ تدبیر جس کا کہ ذکر اوپر ہو چکا ہے، داخل ہو جائے، تو وہ شخص ذاتِ حق کا منظورِ نظر

اور ملاء اعلیٰ کا چاہیتا بن جاتا ہے - چنانچہ جب یہ شخص کسی جگہ اُترتا ہے ، تو اُس جگہ کے ساتھ ملاء اعلیٰ کی ہمتیں وابستہ ہو جاتی ہیں - اور اُس طرف فرشتے فوج در فوج اور انوار موج در موج ٹپکتے ہیں - اور خاص طور پر اگر اُس محبوب شخص کی ہمت اُس جگہ سے خصوصی تعلق رکھتی ہو تو پھر اُس مقام کی تاثیر کا کیا کہنا ۔

اور نیز بات یہ ہے کہ ایک عارف جو معرفت اور حال میں کامل ہوتا ہے ، اُس کی ہمت میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ذاتِ حق کی نظرِ عنایت کا مرکز بن جاتی ہے - چنانچہ اُس کی اِس ہمت کا اثر اُس عارف کے اہل و عیال پر ، اُس کے مال پر ، اُس کے مکان پر ، اُس کی نسل پر ، اُس کے نسب پر ، اور اُس کے قرابت داروں اور ساتھیوں پر پڑتا ہے - اور اس ہمت کے ضمن میں مال اور جاہ کی قبیل کی چیزیں بھی آجاتی ہیں - چنانچہ وہ کامل اِن کی بھی اصلاح کرتا ہے - اور یہی وجہ ہے کہ کاملوں کے آثار کمالات دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں ۔

اکیسواں مشاہدہ

علمائے حرمین نے بعض صوفیاء پر اعتراضات کئے تھے، مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان اعتراضات کا جواب لکھنے کی اجازت چاہی۔ لیکن آپؐ نے اِس کی اجازت نہ دی۔ اِس سے مَیں سمجھ گیا کہ یہ علماء جو صوفیاء پر معترض ہیں، اُن کا جتنا بھی مبلغ علم ہے، وہ اُسی کے مطابق مصروفِ عمل ہیں۔ اور وہ اپنی بساط کے مطابق کسی نہ کسی حیثیت سے لوگوں کے دلوں کے تصفیہ میں لگے ہوئے ہیں۔ اور علم اور دین کی اشاعت میں سرگرم کار ہیں۔ اس لئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے زیادہ قریب، اُنؐ کے ہاں زیادہ محترم اور اُنؐ کی نظروں میں زیادہ محبوب ہیں، بہ نسبت اُن صوفیاء کے جو ارباب "فنا و بقا" ہیں، اور "جاذب" جو نفس ناطقہ کی اصل سے

پھوٹتا ہے ، اور "توحید" اور اسی طرح کے تصوف کے جو اُور بلند مقامات ہیں ، اُن پر سرفراز ہیں +

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قربِ الٰہی کے دو طریقے ہیں ۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم میں آئے تو قربِ الٰہی کا یہ طریقہ بھی بندوں کی طرف منتقل ہو گیا ۔ قربِ الٰہی کے اس طریقے میں واسطوں کی ضرورت پڑتی ہے ۔ اور اس کے پیش نظر طاعات و عبادات کے ذریعہ اعضاء و جوارح کی ، اور ذکر و تزکیہ اور اللہ اور اُس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت کے ذریعہ قوائے نفس کی تہذیب و اصلاح ہوتی ہے ۔ چنانچہ عام لوگوں کی تہذیب و اصلاح کے لئے علوم کی نشر و اشاعت ، نیک کاموں کا حکم دینا ، بُرائیوں سے روکنا ، اور ایسے کاموں میں کوشاں ہونا جن سے سب انسانوں کو عام طور پر فائدہ پہنچے ، اور اسی قبیل کے دوسرے کام جو اوپر کے کاموں سے ملتے جُلتے ہوں ، یہ سب کے سب قربِ الٰہی کے اسی طریقے میں داخل ہیں +

قربِ الٰہی کا دوسرا طریقہ اللہ اور بندے کے براہِ راست اتّصال کا ہے ۔ اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک بندہ کہیں بھی پیدا ہو ، وہ اس طریقہ کو پالیتا ہے ، اور جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ اُس پر فیضان کرے ، وہ اُس سے مستفید ہوتا ہے ۔ قربِ الٰہی کے اس طریقے میں واسطہ سرے سے ہوتا ہی نہیں ۔ چنانچہ جو شخص اس طریقہ پر چلتا ہے ، اُس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے " انا " کی حقیقت کو بیدار کرتا

ہے۔ اور اپنے "انا" ہی کی بیداری کے ضمن میں اسکو ذاتِ حق کا تنبہ اور شعور حاصل ہوتا ہے اور اس سلسلہ کے یہ "فنا و بقا" اور "جذب" اور "توحید" وغیرہ مقاماتِ تصوف ہیں۔

قربِ الٰہی کے اس دوسرے طریقے کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ طریقہ نہ تو عالی منزلت تھا اور نہ آپؐ کو یہ مرغوب ہی تھا۔ آپؐ کی ذاتِ اقدس تو قربِ الٰہی کے پہلے طریقے کا عنوان تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپکو اپنی اس عنایت کا مرکز بنایا تھا کہ آپ کے ذریعہ قربِ الٰہی کے پہلے طریقے کا فیض عام طور پر پھیلے۔ اور آپؐ اس کے ظہور کا باعث بنیں +

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دونو طریقوں میں تفوق و برتری کس کو حاصل ہے؟ بات دراصل یہ ہے اگر ہم دو چیزوں کو ایک اعتبار سے دیکھیں تو اُن میں تفوق ہوگا، اور انہی چیزوں کو اگر کسی دوسرے اعتبار سے دیکھا جائے، تو اُن میں تفوق نہیں ہوگا۔ اب اگر تم چیزوں کو اس اعتبار سے دیکھو کہ وہ کس طرح وجود کے اندر ہیں۔ اور اس وجود کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے تمام چیزوں کا ہر جہت سے احاطہ کر لیا ہے، الغرض اگر تم چیزوں کو اس اعتبار سے دیکھو گے۔ تو بے شک تمہیں ان میں ایک دوسرے پر فائق ہونے کے اسباب اور وجوہ مل جائیں گے۔ اور اس بنا پر تم ایک چیز کو دوسری پر فوقیت بھی دے سکتے ہو۔ اور اس حالت میں ان میں آپس میں ایک دوسرے سے تفوق کے معاملہ میں مقابلہ بھی رہیگا لیکن اگر تم اِن چیزوں کو اس اعتبار سے دیکھو کہ یہ سب ایک ہی سبب سے متعلق ہیں۔ تو پھر ایک اعتبار سے تو اُن میں کوئی وجہ تفوق نہیں ہوگی

البتہ دوسرے اعتبار سے اِن میں یہ تفوق ممکن ہوگا۔ اور اس طرح ایک چیز فائق اور افضل ہوگی، اور دوسری بالکل عدیم الفضل +

الغرض جب یہ نُورِ عالمِ ناسُوت کی طرف منتقل ہُوا تو سالکوں نے قربِ الٰہی کے اِن دونو طریقوں سے استفادہ کیا۔ جو اہلِ "جذب" تھے، اُن کو تو اِس نُور سے ایک مجمل سی باطنی بیداری حاصل ہوگئی، اور اسی سے اُن پر معارف کا انکشاف ہُوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ تم عارفوں کو دیکھتے ہو کہ اُن کے لئے کتاب و سنّت سے معارف کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ اور جو اہلِ سلوک ہیں اُن پر اِس نُور کی طرف پورے سوز و گداز سے رجوع کرنے اُس کے اندر گم ہونے اور پھر اُس نُور میں بقا حاصل کرنے کے ذریعہ یہ معارف منکشف ہوتے ہیں۔ بس اب تم اس میں غور و فکر کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ بڑا دقیق ہے +

بائیسواں مشاہدہ

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کس اعتبار سے افضل ہیں، باوجود اس کے کہ حضرت علیؓ اس اُمت کے پہلے صوفی، پہلے مجذوب اور پہلے عارف ہیں۔ اور یہ کمالات سوائے آپ کی ذات میں اور کسی میں نہیں ہیں۔ اور اگر تھوڑے سے کسی میں ہیں بھی تو وہ محض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیلی کی حیثیت سے۔ مَیں نے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے یہ سوال پیش کیا تو مجھے بتایا گیا کہ آپؐ کے نزدیک فضیلت کلّی کا مدار اُمورِ نبوّت پر ہے۔ جیسے کہ عِلم کی اشاعت، لوگوں کو دین کا مطیع و فرمانبردار بنانا، اور اسی طرح کے اور اُمور جو نبوّت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور وہ فضیلت جس کا مرجع ولایت یعنی "جذب" اور "فنا" ہے، یہ تو ایک جزئی فضیلت ہے۔ اور ایک اعتبار

سے یہ فضیلت کم درجہ کی بھی ہے ۔

اس ضمن میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا تو یہ حال تھا کہ وہ سرتا پا اُمورِ نبوّت کے لئے وقف ہو گئے تھے۔ اور میں نے ان دونو کو اپنے مشاہدۂ باطنی میں یوں دیکھا کہ فوّارہ کی طرح اُن سے پانی اُبل رہا ہے۔ الغرض خُدا تعالےٰ کی عنایت جس کا مرکز و موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی، وہ بعینہٖ اِن دونوں بزرگوں کے وجودِ گرامی میں صورت پذیر ہوئی، اور یہ دونو کے دونو اپنے اس کمال کی وجہ سے بمنزلہ اُس عرض کے ہیں کہ جس کا جوہر کے بغیر قیام ممکن نہیں ہوتا۔ اور جوہر کے لئے اُس کا ہونا وجہ تکمیل ہوتا ہے، اور گو حضرت علیؓ نسب کے اعتبار سے اور نیز اپنی جبلّت اور محبوب فطرت کے لحاظ سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے زیادہ آپؐ سے قریب تھے۔ اور "جذب" میں بھی قوی تر اور "معرفت" میں بھی بلند تر تھے، لیکن اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے منصب نبوت کے کمال کے پیش نظر حضرت علیؓ سے زیادہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرف مائل تھے۔ اور اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ علماء جو معارف نبوت کے حامل ہیں، وہ شروع سے حضرت علیؓ پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو فضیلت دیتے چلے آئے ہیں۔ اور جو علماء معارفِ ولایت کے حامل ہیں، وہ حضرت علیؓ کو افضل مانتے رہے ہیں۔ اور اسی وجہ سے یہ دونو بزرگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار میں مدفون ہیں ۔

بات دراصل یہ ہے کہ بہت سے روزمرّہ کے واقعات بظاہر معمولی ہوتے ہیں، لیکن اُن واقعات کا ایک معنوی اساس ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس دفن ہونے کا واقعہ ہے۔ اور اسی طرح آپکی قبر کے اردگرد حجرے کے ہونے کا واقعہ ہے کہ اس کی وجہ سے لوگ آپؐ کی قبر تک نہیں جا سکتے۔ چنانچہ حجرے کا آپؐ کی قبر کے گرد ہونا سبب بن گیا ہے آپؐ کے اس قول کی صداقت کا کہ "اے اللہ! میری قبر کو صنم نہ بنانا، تاکہ کہیں لوگ تجھے چھوڑ کر میری قبر کو نہ پُوجنے لگیں"۔

تئیسواں مشاہدہ

مَیں نے دیکھا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف اللہ تعالیٰ کی ایک خاص نظر ہے۔ اور گویا یہی نظر ہے جو حاصل مقصود ہے آپؐ کے حق میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کا، کہ "اگر تُو نہ ہوتا تو مَیں افلاک کو پیدا ہی نہ کرتا۔" یہ معلوم کر کے میرے دل میں اس نظر کے لئے بڑا اشتیاق پیدا ہُوا۔ اور مجھے اس نظر سے محبت ہو گئی۔ چنانچہ اس سے یہ ہُوا کہ مَیں آپؐ کی ذاتِ اقدس سے متصل ہُوا۔ اور آپؐ کا اس طرح سے طفیلی بن گیا جیسے جوہر کا عرض طفیلی ہوتا ہے۔ غرضیکہ میں اس نظر کی طرف متوجہ ہُوا۔ اور مَیں نے اس کی حقیقت معلوم کرنی چاہی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مَیں خود اِس نظر کا محلِ توجہ اور مرکز بن گیا۔ اِس کے بعد میں نے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نظرِ خاص اس کے ارادہ

ظہور سے عبارت ہے۔ اور اس سلسلہ میں ہوتا یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ جب کسی "شان"[1] کو ظاہر کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اُس "شان" کو پسند کرتا اور اُس پر اپنی نظر ڈالتا ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "شان" ایک فردِ واحد کی "شان" نہیں۔ بلکہ آپؐ کی "شان" عبارت ہے ایک عام مبداء ظہور سے جو تمام بنی نوع انسان کے قوالب پر پھیلا ہوا ہے۔ اور اسی طرح بنی نوع انسان کی حیثیت ایک اور مبداء ظہور کی ہے جو تمام موجودات پر حاوی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کل موجودات کی غایت الغایات اور ظہورِ وجود کے نقاط کا آخری نقطہ ہیں۔ چنانچہ سمندر کی ہر موج کی حرکت اسی لئے ہے کہ آپؐ تک پہنچے۔ اور ہر سیلاب کو یہی شوق سمایا ہوا ہے کہ آپؐ تک اُس کی رسائی ہو۔ تمہیں چاہئے کہ اس مسئلہ میں خوب غور و تدبر کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ بڑا ہی دقیق ہے۔

[1] سورہ "الرحمٰن" میں ہے۔ کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَاۡنٍ "یہاں "شان" کا اشارہ اسی طرف ہے۔ (مترجم)

چوبیسواں مشاہدہ

مَیں نے معلوم کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور اُن سے توسّل علمائے حدیث، اور جو لوگ کہ ان کے زمرے میں ہیں، اُن کے لئے ہے۔ اور نیز یہ کہ علم حدیث اور اُس کی حفاظت لوگوں کے لئے ایک مضبوط سہارا اور لمبی رسّی ہے، جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتی۔ تمہیں چاہئے کہ محدّث بنو۔ اور اگر محدّث نہیں بن سکتے تو کسی محدّث کے طفیلی ہی بن جاؤ۔ میرے نزدیک اِن دو کے سوا کسی چیز میں خیر نہیں۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے ۔

پچیسواں مشاہدہ

عارف جب کمال کو پہنچتا ہے تو اُس کی رُوح ملاء اعلیٰ سے جا ملتی ہے۔ ملاء اعلیٰ میں ایک بلند اور عالی مرتبہ بارگاہ ہے جہاں کامل عارفوں کی ہمتیں تو پہنچ جاتی ہیں، لیکن اُس تک اُن کے بدن نہیں پہنچ پاتے۔ اِس ضمن میں ان کاملوں کی تمام کی تمام ہمتیں ایک آدمی کی ہمت کی طرح صرف ایک ہی تدبیر پر منحصر ہوتی ہیں۔ گو تفصیلات میں ان میں آپس میں اختلافات ہوتے ہیں۔ الغرض ملاء اعلیٰ کی اس بلند اور عالی مرتبہ بارگاہ میں جب ان کاملوں کی ہمتیں پہنچتی ہیں تو اُس مقام پر اللہ تعالیٰ کی تدلّی ہوتی ہے۔ اور یہ تدلّی اپنے انوار سے کاملوں کی اِن ہمتوں کو پوری طرح سے ڈھانک لیتی ہے، چنانچہ اُن کی ہمتیں ان انوار کی روشنی میں چھُپ جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ نہ تو

اُن ہمتوں اور انوار میں وہاں فرق کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اور نہ ان ہمتوں میں باہم ایک دوسرے میں تمیز کی جا سکتی ہے۔

اب اگر میں ان کاملوں کی اس حالت کو واضح کرنے کے لئے کوئی مثال دوں تو یہ نہ ہو کہ تم مجھے اس مثال کی تفصیلات میں ہر نشیب و فراز میں کھینچے کھینچے لئے پھرو۔ آخر مثالیں تو چیزوں کی کسی ایک ہی اعتبار سے وضاحت کرتی ہیں۔ الغرض ان کاملوں کی ہمتوں کو اس "ہیولیٰ" کی طرح سمجھئے جو ہر شئے میں پوشیدہ ہے۔ اور جس کا ادراک ہم صرف ان احکام و آثار ہی سے کر سکتے ہیں، جو شئے موجود سے "ہیولیٰ" کے مسامات کے ذریعہ جو حقیقت میں اصل بنیاد ہے اُس شئے کی استعدادوں اور قابلیتوں کی، ظاہر ہوتے ہیں، اور تدلی الٰہی کا وہ نور جو ان ہمتوں کو اس طرح ڈھانپ لیتا ہے کہ اُس کے اندر یہ ہمتیں بے نشان ہو جاتی ہیں۔ اس نور کی مثال "ہیولیٰ" کے مقابلے میں "صورت" کی سمجھئے، کہ جب ہم کسی چیز کا ادراک کرتے ہیں تو سب سے پہلی چیز جو ہمارے ادراک میں آتی ہے وہ یہی "صورت" ہوتی ہے۔ اور جس طرح ایک شئے کی استعدادوں اور قابلیتوں کی اصل "ہیولیٰ" ہے، اسی طرح یہ "صورت" اُس شئے کی فعلیات کی اصل ہے۔

الغرض ملاء اعلیٰ کا یہ مقام بلند جہاں کہ کاملوں کی ہمتوں کو تدلی الٰہی کا نور ڈھانپ لیتا، اور اُن کو اپنے اندر گم کر لیتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں سے ملاء اعلیٰ کے علوم میں سے احکام و آثار کا نزول ہوتا ہے۔

اور جہاں اُن کی تفصیلی ہمتیں اُن کے لئے لطیف ہو جاتی ہیں۔ اور انکی رجلا اُدھر ترقی کر جاتی ہے۔ اور پھر اُن کی ہمتوں کے مسامات سے حظیرۃ القدس میں ایک کیفیت ظاہر ہوتی ہے، جس پر نور پرورش کرتا ہے۔ اور یہ اُس کیفیت کو اُس حالت میں نہیں رہنے دیتا، جس میں کہ [illegible] پہلے تھی۔ بلکہ وہ اُس کو اپنے جوہر سے قریب کر دیتا ہے۔ اور اس طرح بارگاہِ مقدسہ کے حالات میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ چنانچہ کبھی وہاں رضا کی حالت ہوتی ہے اور کبھی غضب کی، اور کبھی ہنسی اور بشاشت کی۔ اور کبھی قبض و اعراض کی۔ اور بعض اوقات کسی چیز کے ممکن ہونے کی حالت ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات اُس کے محال ہونے کی۔ اور کبھی کسی چیز کو واجب کیا جاتا ہے۔ اور کبھی کوئی چیز حرام قرار پاتی ہے۔ اور کبھی پہلے کے حکم کو منسوخ قرار دیا جاتا ہے۔ الغرض یہ اور اسی قبیل کے بعض اور حالات بارگاہ مقدسہ میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اب جو شخص اس بارگاہ مقدسہ اور اس کے حالات و کوائف، اُس کے انشراح و بسط، اس کی عزیمت اور ہر روز اس کی نئی "شان" کا مشاہدہ کرے تو اُس کے لئے قرآن مجید کی آیاتِ متشابہات محکمات بن جاتی ہیں۔

ولم یبق بالاشکال اشکال سریۃ

"یعنی اس کے لئے اُن شکلوں میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا"

اور جو شخص اس بارگاہ مقدسہ کے مشاہدہ سے محروم رہا تو اُس کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ ان سب امور کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔

اور اجمالی طور پر وہ ان سب پر ایمان لے آئے۔ جب کہ تم نے یہ سب کچھ جان لیا، اب تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ بارگاہِ مقدسہ قبلہ ہے ملاءِ اعلیٰ کی ہمتوں کا اور مرکز ہے اُن کی توجّہ کا۔ اور مسجود ہے اُنکی پیشانیوں کا۔ پس جو شخص اس مبلغ کمال تک پہنچ گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اپنے علم میں اُس کے لئے یہ مقدر کر رکھا تھا کہ اُسے وہاں مقام فنا و بقا حاصل ہو۔ تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ شخص اس مقام میں گم ہو جاتا ہے۔ اور یہاں اُس کی رُوح اُس کے جسم کی منتظم نہیں رہتی۔ بلکہ یہی بارگاہ مقدسہ اُس کی منتظم بن جاتی ہے۔ اور یہی اُس کی مُرشد اور اس کو الہام کرنے والی ہوتی ہے ÷

میں نے اِس موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑا۔ گویا کہ میں اُن کا طفیلی بن گیا۔ چنانچہ مجھے ایک چھلکتا ہُوا پیالہ عطا ہُوا۔ میں تمہیں اس پیالے کی کیفیت کیا بتاؤں۔ وہ جو کچھ تھا، تھا۔ میں اس نعمت پر اللہ تعالےٰ کی تعریف کرتا ہوں ÷

اس بارگاہ کے برابر میں ایک اور مقام بھی ہے جو اس سے کم مرتبہ ہے اور یہ ملاءِ سافل کی ترقی کا منتہا، اُن کے امور کا مرکز، اُن کے الہام کا موضع، اُن کے فیصلوں کی عدالت، اور اُن کی توجہ کا نصب العین ہے۔ یہ مقام اُس بارگاہِ مقدسہ سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ اور اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی تدلّی ہوتی ہے۔ اور اس تدلّی ہی کی وجہ سے ذات حق کی طرف ان امور کی نسبت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے،

اور بعض معاملات میں اپنے بندوں کی رضامندی پر چلتا ہے ، وغیرہ وغیرہ ۔

الغرض بارگاہ مقدسہ اور یہ مقام جو ملاء سافل کا مقصود و منتہا ہے یہ دونوں کے دونوں ایسی حقیقتیں ہیں کہ ان کی معرفت اس قدر دقیق اور بلند ہے کہ عام عقول ان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں ۔ باقی اللہ تعالےٰ تو توفیق دینے والا ہے ہی ۔

چھبّیسواں مشاہدہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے مجھ پر معرفتِ الٰہی کے احوالِ کاملہ میں سے جن بہت سے علوم کا انکشاف ہوا، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ عارف دوسروں سے اس معاملہ میں ممتاز ہوتا ہے کہ اُس میں اجزائے فلکی کا ظہور بڑا قوی اور اُن کا حکم بڑا موثر ہوتا ہے۔ اور بات یہ ہے کہ یہی فلکی اجزاء ہیں جو ذریعہ بنتے ہیں اِس عالم میں الٰہی تقاضوں کے قیام پذیر ہونے کا۔ اور پھر یہی الٰہی تقاضے ان فلکی اجزاء کے مقاصد و معانی کو بارگاہِ حق کے لئے مناسب بنا دیتے ہیں +

ان علوم میں سے جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے حاصل ہوئے، ایک علم یہ ہے کہ عارف جو معرفت الٰہی میں کامل ہوتا ہے۔ اُس کے لئے ضروری ہے کہ دُنیاوی، جسمانی اور روحانی

علائق اُس سے پوری طرح دُور ہوں - اور وہ اپنی کیفیات اور جذبات میں تروتازہ ہو اور اس غور و فکر نے کہ وجودِ باری موجودات میں کس طرح جاری و ساری ہے ، اور مبدائے اوّل اپنے ارادۂ حیات میں عالم کے مظاہر حیات میں کیسے متوجہ ہوتا ہے ، اس شخص کو اس غور و فکر نے فرسودہ نہ کر دیا ہو۔ اس ضمن میں مجھ پر یہ امر بھی آشکارا ہُوا کہ یہ حقیقت جزوی معانی میں سے ہے جو فلک زحل کے مقابل ہے ۔ چنانچہ جب اس شخص پر الٰہی رنگ کا فیضان ہوتا ہے تو اس کا دُنیوی ، اُخروی ، جسمانی اور روحانی علائق سے منقطع ہونا "محبّت ذاتی" کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ اور "محبّت ذاتی" سے مُراد وہ محبّت ہے جو اللہ تعالیٰ کے نقطۂ ذات کی طرف سرتاپا متوجہ ہوتی ہے۔ اب اگر ایک عارف ہے کہ دُنیاوی ، اُخروی ، جسمانی اور رُوحانی علائق سے اُس کی کنارہ کشی اور ہر چیز سے اُس کے پوری طرح منقطع ہونے میں پوری طرح سدِّ راہ ہیں مقامِ بقا اور موجودات میں تصرّف حق اور مبدائے اوّل سے اُس کے ارادۂ حُبّ کا ظہور ، جو مبدائے اوّل کے تشخّص پذیری کے روزن سے ہوتا ہے ، تو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ عارف ، عارف کامل نہیں ۔ بلکہ عارف کامل وہ ہے کہ وہ ان سب علائق سے کلیتہً کنارہ کشی کو اپنے باطن میں اس طرح جگہ دیتا ہے کہ اس عالم کے مظاہر میں سے کسی مظہر کی محبّت بھی خواہ وہ مظہر اس طرح ذاتِ حق کے ساتھ قائم ہو کہ وہ عنوان ہو "محبّت ذاتی" کا اور بدن ہو "محبّت ذاتی کی رُوح کا۔ اور قالب ہو اُس کی حقیقت کا ۔ اس عارف کی کل علائق سے کنارہ کشی اور انقطاعِ کامل

کو کسی طرح ملوث نہیں کرتی۔ چنانچہ یہ عارف ان مظاہر سے اپنی ذات کے لئے محبت نہیں کرتا بلکہ اُس کی ان مظاہر سے محبت ذاتِ حق کے لئے اور نیز خلق کے خیال سے ہوتی ہے۔ اور پھر اُسے ان مظاہر سے بحیثیت مظاہر کے محبت نہیں ہوتی۔ بلکہ اُس کی محبت محض ذاتِ حق کے لئے ہوتی ہے۔ اور یہ مظاہر اُس کیں محض ایک واسطہ ہوتے ہیں +

مزید براں اِن علوم میں سے جو تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت کی طفیل حاصل ہوئے، ایک علم یہ بھی ہے کہ ہر وہ عارف جو معرفت حق میں کامل ہوتا ہے، وہ جو کچھ بھی اخذ کرتا ہے صرف اپنے ہی نفس سے اخذ کرتا ہے۔ اب رہے وہ ذرائع اور اسباب جو اُس کے اخذِ علم کا باعث بنتے ہیں، تو اُن کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس عارف کے اندر پہلے سے ایک چیز موجود تھی، اور بعد میں اُسے اس کے بارے میں بتایا گیا۔ اور اس طرح اُس چیز کی حقیقت اُس عارف پر منکشف ہو گئی۔ یعنی یہ چیز اُس کے ہاں پہلے سے موجود تو تھی، لیکن وہ اُس پر ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ اب وہ اس پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی عارف اخذِ علم کے اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقے سے کسی اور سے علم اخذ کرتا ہے، تو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ کامل معرفتِ الٰہی میں کامل نہیں +

اور ان علوم میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر وہ عارف جو معرفتِ الٰہی میں کامل ہے، وہ اللہ تبارک وتعالےٰ، اور اُس کے اسماء اور اُسکی تجلیات کے ماسوا جو کچھ بھی ہے، ان سب کو مسخر کر لیتا ہے۔ اور یہ عمل

تسخیر یا تو جبر و قہر سے ہوتا ہے۔ اور یہ چیز اُس عارف کامل کے لئے اُس کی اپنی کیفیت ظہور کی ایک ادنیٰ حالت اور ناقص قوت ہے۔ اور عارف کامل کی یہ کیفیتِ ظہور اُس کی جامعیت کو اپنے لباس میں لئے ہُوئے ہوتی ہے۔ اور یہ اُس کے معانی کے لئے حجاب بن جاتی ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اُس عارف کی بہیمی قوت اور مُلکی قوت میں آپس میں اختلاط ہوتا ہے۔ اور اس ضمن میں یا تو اُس عارف کی بہیمی قوت بھی قوی ہوتی ہے اور اُس کی مُلکی قوت بھی قوی۔ یا دونو ضعیف ہوتی ہیں۔ یا ان میں سے ایک ضعیف ہوتی ہے اور ایک قوی۔ چنانچہ جب اُس عارف کی اِس نوعیت کی بہیمی قوت اور اُس کی اس طرح کی مُلکی قوت میں اختلاط عمل میں آتا ہے تو ظاہر ہے اُس سے مختلف قسم کے احکام و آثار ظاہر ہوں گے۔ اور اس کی وجہ سے عوام جو عام طور پر لباس کو دیکھتے ہیں، اور لباس کے اندر جو جامع شخصیت ہوتی ہے، اُس پر ان کی نگاہ نہیں پڑتی اور وہ ظاہری صورتوں کو دیکھتے ہیں، لیکن صورتوں کے پیچھے جو معانی ہوتے ہیں، اُن تک اِن کی رسائی نہیں ہوتی، اس طرح کے عارفوں سے اِن عوام میں انکار سا پیدا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالےٰ، اُس کے اسماء اور اس کی تدلیات کے علاوہ جو چیزیں ہیں، اُن کی تسخیر کا دُوسرا طریقہ جبر و قہر کی بجائے تناسب اور ہم آہنگی کا ہے۔ اور یہ طریقہ عارف کا اس کی کیفیت ظہور کی اُس شق سے جسے "لباسی" اور "جمالی" کہنا چاہئے، قوی تر اور موثر تر پہلو ہے۔ اس صورت

میں ہوتا یہ ہے کہ تناسب اور ہم آہنگی کی حقیقت خود عارف کے ایک جزو سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ جزو قائم مقام بن جاتا ہے اُس چیز کا جس کو مسخر کرنا مقصود ہوتا ہے، چنانچہ اِس عارف اور اُس کے اِس جزو کے درمیان جو تسخیر طلب چیز کا قائم مقام بن جاتا ہے، رگوں اور خاص طور پر "ماساریقا" رگ کا جال بچھا ہوا ہے تو وہ اُن پوشیدہ رگوں کے ذریعہ سے جو اُس جزو میں اور جس چیز کو کہ مسخر کرنا ہوتا ہے، پھیلی ہوئی ہیں، اُس چیز میں حرکت پیدا کر دیتا ہے[1]۔

یہ دو طریقے تو اللہ تعالیٰ، اُس کے اسماء اور اس کی تدلیات کے ماسوا جو اور چیزیں ہیں، اُن کو مسخر کرنے کے ہوئے۔ لیکن جہاں تک اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اُس کی تدلیات کا تعلق ہے، وہ نورِ ربوبیت کی روشنی سے مسخر نہیں ہو سکتیں۔ ہاں اِس ضمن میں ایک مقام "حُب" ہے، جو کہ محبوبیت کے مقابل ہے۔ چنانچہ جب محبوبیت میں حرکت ہوتی ہے تو اس سے مقامِ حُب بھی متحرک ہو جاتا ہے۔ اور اس مقامِ حُب کی حرکت سے اسم اور تدلّی دونو کو حرکت ہوتی ہے۔ اور یہ دونو مقامِ حُب سے مناسبت رکھتے ہیں۔ اب اگر کوئی عارف ہے، جو اس وسیع الاثر تسخیر کی قوت کو نہیں جانتا۔ اور نہ وہ اُسے خود اپنے اندر پاتا ہے تو وہ عارف معرفتِ الٰہی میں کامل نہیں۔ اور

---

[1] یہ یونانی زبان کا لفظ ہے۔ ماساریقا رگیں جگر سے معدہ اور آنتوں تک گئی ہیں۔ ان کا کام قدمائے یونان کے خیال کے مطابق یہ ہے کہ معدہ اور آنتوں سے کیلوس کو جگر تک پہنچائیں کہ جگر اُسے خون اور اخلاط بنا دے۔ (مترجم)

اسی سلسلہ میں میں یہ بھی سمجھا ہوں کہ یہ وسیع الاثر تسخیر کی قوت عارف کامل کے اس تجرد کے حقائق میں سے ایک حقیقت ہے، جو مقابل ہوتی ہے سورج کے جبکہ وہ الہٰی رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اور اس طرح تسخیر کی یہ قوت جو پہلے سے اُس عارف کے اندر موجود ہوتی ہے اپنا اثر دکھاتی ہے ✦

ان علوم میں سے جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے حاصل ہوئے، ایک علم یہ ہے کہ عارف کامل کی روح اُس کے طریقۂ تصوّف، اُس کے مذہب، اُس کے سلسلہ، اُس کی نسبت، اُس کی قرابت، اور پھر وہ چیز جو اُس کے قریب ہے، یا اُس کی طرف منسوب ہے، ان میں سے ہر ایک کے ہر ہر پہلو پر نظر رکھتی ہے۔ اور اُس پر برابر متوجّہ رہتی ہے۔ اور عارف کامل کی روح کی اس توجّہ کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی توجّہ بھی ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب عارف کامل کا نفس جسم کی کدورتوں سے منزہ ہو کر ملاء اعلیٰ سے متصل ہو جاتا ہے تو وہاں اُس پر اللہ تعالےٰ اپنی تجلّی فرماتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی یہ تجلّی اُس عارف کے نفس میں جتنی استعداد ہوتی ہے، اُسی کے مطابق نزول فرماتی ہے۔ ہم اس سلسلہ میں اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے پہلے کہیں "ہیولیٰ" اور "صورت"[1] کی مثال بھی دے چکے ہیں۔ غرضیکہ جب اللہ تعالےٰ کی یہ تجلّی عارف کامل

---

[1] دیکھئے صفحہ ۱۴۲

کے نفس پر نازل ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے عارف کامل اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اور اُسکے نفس کے اللہ تعالیٰ کے رنگ میں اس طرح رنگے جانے، اور اس کے ساتھ امتزاج اور اختلاط کی وجہ سے یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے لئے اُس کی تدلیات میں سے ایک تدلّی بن جاتا ہے چنانچہ اس حالت میں جب عارف کامل کا نفس اُن چیزوں کی طرف جن کا کہ ابھی ذکر ہوا ہے، توجہ کرتا ہے۔ تو اُن کی یہ توجہ خود اُس عارف کی طرف بارگاہِ قدس کی توجہ اور التفات کا باعث بن جاتی ہے۔ اور پھر جب یہ بہتر اُس عارف کے نفس کے اطراف و اکناف میں اُس کے تمام اجزاء میں، اور اس کی رگوں اور اُس کے پٹھوں میں، اور اُس کے تمام پہلوؤں میں متمکن ہو جاتا ہے تو بعینہٖ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی توجہ بھی اس عارف کے نفس کے ہر ہر جزو سے اختلاط پیدا کر لیتی ہے۔ اور اس طرح یہ عارفِ کامل اکسیر بن جاتا ہے، اور لوگ اس سے شفا حاصل کرتے ہیں۔ میں نے جو اوپر نفس کے حصے، اُس کی رگیں اور اُس کے پٹھے گنائے ہیں، تو اس سے میری مراد نفس کا اپنی تمام ہمت کو مرکوز کئے بغیر بطور عادت کے یا بلحاظ ایک غیر مستقل ملکہ کے متوجہ ہونا ہے۔

الغرض اس بستر کے اعتبار سے عارفِ کامل کی ذات کے بہت سے آثار و احکام ہوتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں میں یہ بھی سمجھا ہوں کہ عارفِ کامل کے اُس جزو کے معانی میں سے جو جزو کہ زحل کے مقابل ہے، اور اُس کے ساتھ مشتری بھی ملا ہوا ہے۔ اور نیز جب کہ اُس میں الٰہی رنگ سرایت

کر جاتا ہے ، ایک معنی یہ ہیں +

اور ان علوم میں سے جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے ملے ، ایک علم یہ ہے کہ عارفِ کامل کو اُن تمام کی تمام نعمتوں سے سرفراز کیا گیا ہے ، جو نعمتیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو، زمینوں کو، جمادات نباتات، حیوانات اور انسانوں کو اور اُن میں سے جو فرشتے ، انبیاء، اولیاء اور بادشاہ وغیرہ ہیں ، اُن سب کو عطا فرمائیں ۔ اور عارف کی یہ خصوصیت اس وجہ سے ہے کہ اُس کا وجود عبارت ہے ایسے اجزاء سے جن میں سے ہر جزو ان موجودات میں سے کسی نہ کسی چیز کے مقابل ہے ۔ چنانچہ اس طرح عارفِ کامل ان تمام موجودات کا اجمالی اور جامع نسخہ بن جاتا ہے ۔ اب اگر ہم اس عارفِ کامل کے ایک ایک جزو کی تفصیل کرنے لگیں تو وجودِ عمومی کے سب مظاہر سامنے آئیں گے ۔ الغرض جب اللہ تعالےٰ کی کوئی نعمت عارفِ کامل کو ملتی ہے تو دراصل اُس نعمت کا محل اُس کے ان اجزاء میں سے ایک جزو ہوتا ہے اس ضمن میں عارفِ کامل کا فرض ہے کہ وہ ان تمام نعمتوں کا شکر ادا کرے +

یہ جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ، اس میں کسی رُو رعایت یا رواداری سے کام نہیں لیا گیا ۔ بلکہ یہ ایک حقیقت نفس الامری ہے جو ہم نے پیش کی ۔ اس میں شک نہیں کہ جب کوئی عارف سب سے مجرد اور منزہ ہو کر اُس وجودِ کلّی کا جو تمام موجودات میں جاری وساری ہے ، ہو جاتا ہے تو یہ راز اُس پر ظاہر ہو جاتا ہے ۔ لیکن جب وہ وجودِ کلّی کے بجائے وجود کے جزوی مظاہر کی پستیوں میں گر جاتا ہے تو پھر اُس سے یہ راز بھی روپوش ہو جاتا ہے +

ستائیسواں مشاہدہ

میں اس امر کے انتظار میں تھا کہ وہ حدیث جس میں یہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ہمارا ربّ مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھا۔ اور آپؐ نے اُس کے جواب میں فرمایا تھا کہ وہ "عماء" میں تھا۔ اُس حدیث کے معنی معلوم کروں کہ مجھ پر اس راز کا فیضان ہُوا۔ میں نے دیکھا کہ "بُعد ہیولانی" کی بلندیوں پر ایک عظیم الشان نُور جلوہ فگن ہے۔ اور اس نُور نے اپنی شعاعوں کے ذریعہ جو تمام اطراف میں خطوں کی طرح پھیلتی چلی گئی ہیں، اس بُعد کا پُورا طرح بلحاظ اپنی تدبیر کے احاطہ کر لیا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں "اللہ عماء میں تھا" اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے چنانچہ یہ "بُعد ہیولانی" "عماء" ہے اور نُور

کی شعاعوں کے ذریعہ اس بُعد کا احاطہ کر لینا اللہ تعالےٰ کے اس قول کا مصداق ہے کہ "ھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ" جب مجھ پر یہ راز منکشف ہُوا تو اس کی وجہ سے میرا دل طمانیت کی ٹھنڈک سے بھر گیا۔ اور میں نے یُوں محسوس کیا کہ نہ تو اب میرے اندر کوئی شبہ باقی رہا اور نہ اس ضمن میں کوئی ایسا سوال رہ گیا ہے، جو میں پوچھوں۔

اس کے بعد جب میں "مقام تفکر" میں آیا تو میں نے اس سِر کو اس طرح سمجھا کہ ذاتِ حق خود اس امر کی متقاضی تھی کہ وہ استعدادیں جو اُس کے اندر مضمر ہیں، اُن کا ظہور عمل میں آئے۔ چنانچہ سب سے پہلے ذاتِ حق کا جو مرتبہ وجوب ہے، اُس مرتبے میں ذاتِ حق کی ان استعدادوں کا عقلی ظہور ہوا۔ اور اس ظہور سے وہاں اشیائے ممکنات کے "اعیان" اور ذاتِ واجب کے ظہور کی ہر صورت اور اس کی تدلی کے ہر مظہر کے "شیون" متمثل ہوئے۔ مرتبۂ وجوب میں ذاتِ حق کا تقاضہ یہ ہُوا کہ وہ ان ظہورات کو عدم، مادہ اور خارج سے متصف کرے۔ چنانچہ اس ضمن میں اُس نے جو کچھ کہ اعیان اور اسماء کی پہنائیوں میں مضمر تھا، اُسے ظاہر کر دیا۔ اور اس سلسلہ میں سب سے پہلے جو چیز ظہور پذیر ہوئی، وہ اللہ تعالےٰ کا نُور تھا۔ اس نور نے عدم اور مادہ کا پوری طرح سے احاطہ کر لیا، اور اس پر یہ مسلط ہو گیا۔ اور یہ نُور قائم مقام بن گیا ذاتِ حق کا۔ اور یہ نور قدیم الزمان ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے نزدیک زمان، مکان اور مادہ ایک ہی چیز ہے۔ اور یہی وہ استعداد ہے جس کو ہم نے عدم اور خارج کا نام دیا ہے۔

اللہ تعالےٰ کے وہ ارادے جو ہر زمانے میں بدلتے ہیں۔ وہ اسی مقام و موطن سے مخصوص ہیں۔ اور یہی وہ پہلی چیز ہے جس کے متعلق شریعتوں کی زبانوں نے گفتگو کی ہے۔

اوپر کی حدیث میں اللہ تعالےٰ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سوال کیا تھا اس میں آپؐ سے صرف یہی پوچھا گیا تھا کہ اللہ مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھا۔ ظاہر ہے اس "کہاں" کا جواب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ اس وقت جو چیز خارج میں موجود تھی وہ بتا دی جاتی۔ چنانچہ آپؐ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ اللہ "عما" میں تھا۔

اٹھائیسواں مشاہدہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ مقدس سے مجھے اس کیفیت کے علم کا فیضان ہوا کہ بندہ اپنے مقام سے ترقی کر کے کس طرح مقام قدس تک پہنچ جاتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اس وقت ہر چیز بندے کے سامنے اس طرح متجلی ہو جاتی ہے جس طرح کہ خواب کے دوران میں معراج کے قصے میں چیزوں کو دیکھنے کی خبر دی گئی ہے۔ پھر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بندہ چیزوں کو اس طرح متجلی دیکھنے کے بعد اس ضمن میں جو واقعات اس پر گزرتے ہیں وہ ان پر نظر واپسیں ڈالتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے جو واقعات الہام الٰہی کا نتیجہ ہوتے ہیں وہ ان کو جان لیتا ہے۔ اور جو کم و بیش اس کی اپنی طبیعت کا تقاضہ یا شیطان کے وسوسے ہوتے ہیں، ان کو بھی معلوم کر لیتا ہے۔ اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بندہ

اس مقامِ قدس میں پہنچ کر اُن امور کو جو ملاءِ اعلیٰ میں زیرِ بحث ہوتے ہیں، واضح ترین صورت میں دیکھ لیتا ہے۔ ملاءِ اعلیٰ کے یہ امور یا تو قوانینِ الٰہی کے بارے میں جو علوم ہیں، اُن کے متعلق ہوتے ہیں، یا جو واقعات کہ دُنیا میں ہونے والے ہوتے ہیں، اُن کے بارے میں لوگوں کو ڈرانے اور آگاہ کرنے کا سوال ہوتا ہے۔ یا کسی امرِ حق کے سلسلہ میں لوگوں میں جو بحث مباحثہ ہونا ہوتا ہے، اُس کا علم ان لوگوں کے ادراکات میں نازل کرنے کا معاملہ ملاءِ اعلیٰ میں درپیش ہوتا ہے۔ یا ایک خاص زمانے میں جو علوم موزوں ہوتے ہیں، اُن کے متعلق جو عقدے ہوں۔ اُن کو کھولنے کی تدبیر زیرِ غور ہوتی ہے۔ یا ملاءِ اعلیٰ کی ہیئتیں اور صورتیں یا اُن کے مقامات، یا ان امور سے ملتی جُلتی جو اور چیزیں ہیں، وہ ہوتی ہیں۔ الغرض یہ بندہ مقامِ قدس میں پہنچ کر ان امور کو جو ملاءِ اعلیٰ میں زیرِ بحث ہوتے ہیں، واضح ترین صورت میں دیکھ لیتا ہے۔ اور ملاءِ اعلیٰ کے یہی امور قرآن مجید کے علوم کا موضوع ہیں۔

مَیں نے جب اپنے آپ سے طبیعت کا لباس اُتار دیا۔ اور اپنے مالوفات، عادات اور محسوسات سے مَیں نے تجرد اختیار کر لیا۔ اور اس مقامِ قدس کے رنگ میں مَیں رنگا گیا۔ تو اس کے بعد مَیں نے ایک عظیم الشان حقیقت کا مشاہدہ کیا۔ اس موقعہ پر مجھ سے کہا گیا کہ یہ مقام "مقامِ رویت و مشاہدہ" ہے۔ یہ کلام کا مقام نہیں۔ ہاں البتہ جب ارادہ حق کا یہ تقاضہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی طرف تدلّی کرے۔ اور یہ

تدلّی کتاب کی صورت میں ہو ، جو کہ اُن پر نازل کی جاتی ہے۔ تو وہ اس "مقام رؤیت ومشاہدہ" والے کو ایک نورانی اور رقیق لباس پہنا دیتا ہے۔ چنانچہ اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ "مقام رؤیت ومشاہدہ" اُس شخص کے لئے مقام کلام میں تبدیل ہو جاتا ہے ۔

بعد ازاں میں نے بندے کی وہ کیفیت بھی ملاحظہ کی جو اُس کی مقام قدس سے طبیعت اور عادت کا جو مقام اسفل ہے ، اُس کی طرف گرنے کی ہوتی ہے ۔ میں نے دیکھا کہ اُس وقت بندے کی طبیعت کی آنکھ کھل جاتی ہے ۔ اور ملاء اعلیٰ کی آنکھ اُس کی طرف سے بند ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ جو واقعات اُس پر مقام قدس میں گزرے ہوتے ہیں ، وہ اُن کے متعلق محسوس کرتا ہے کہ ایک خیال تھا جو اس کے دماغ میں آیا تھا ۔ یا وہ اُن کو اس طرح یاد کرتا ہے جیسے کوئی بھولی بسری چیز کو یاد کرے ۔ اور اس سلسلہ میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ لذائذ اور اسباب کی تلاش میں کسی ایسی چیز کو پا لیتا ہے ، جس سے وہ محروم تھا ۔ یا اُس کے لئے وہ چیز ناقابل دسترس تھی ۔

بندے کا مقام قدس کی طرف ترقی کرنا اور پھر وہاں سے اپنی طبیعت کے مقام اسفل کی طرف رجوع کرنا ۔ یہ جو دو مقامات ہیں ، اُن کے درمیان بندے کو بہت سے حالات سے گزرنا پڑتا ہے ۔ میں نے ان سب حالات کو اپنے اس مشاہدہ میں دیکھا ۔ چنانچہ ان میں سے بعض حالات ملاء اعلیٰ سے قریب تر ہوتے ہیں اور بعض ملاء اسفل سے ، اور ان حالات سے یہ واقعات

ظہور پذیر ہوتے ہیں، جو میں اب بیان کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک تو ہاتف کی آواز ہے۔ اور اسی طرح دل میں کسی خیال کا آجانا، اور خواب میں کسی چیز کو دیکھنا ہے۔ اور جہاں تک خواب کا معاملہ ہے، سچ پوچھیے تو خواب دل کی باتیں ہیں کہ جب انسان کی قوت ذرا کہ نیند کی حالت میں سب طرف سے کٹ کر دل کی ان باتوں کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتی ہے، تو یہ باتیں خیالات کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اور انسان انہی خیالات کو خواب میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور اپنے کانوں سے سنتا ہے۔ اور ان خیالات میں سے ایک خیال خیالِ حق بھی ہے۔ جس سے کہ دماغ بھر جاتا ہے۔ اور اسی سلسلہ میں سچی فراست اور اسی قبیل کی اور چیزیں بھی ہیں، جو ان حالات میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور یہ سب چیزیں اس مقام حجاب سے متعلق ہیں جو درمیان ہے اُس بارگاہ کے جہاں کوئی حجاب نہیں۔ اور اس مقام کے جہاں ہر اعتبار سے حجاب مضبوط ہے۔ میں نے اپنے اس مشاہدہ میں ان میں سے ہر ہر چیز کو دیکھا۔ اور نیز میں نے ان میں سے ایک ایک چیز کا اس کا اپنا اپنا مقام اور محل دیکھا، جہاں کہ یہ چیز پائی جاتی ہے۔ لیکن اس مشاہدے میں مجھے اتنی مہلت نہ ملی کہ میں ان سب چیزوں کے اندازوں اور ان کے محل وقوع کا پوری طرح احاطہ کر لیتا۔ چنانچہ اس ضمن میں میں نے صرف ان چیزوں کے اصولوں ہی کے مشاہدہ پر اکتفا کیا۔ اُمید ہے اللہ تعالیٰ ضرور اس امر کی توفیق دے گا کہ ہم پھر دوسری بار ان سب چیزوں کا پوری طرح احاطہ کر سکیں +

اُنتیسواں مشاہدہ

عارف جب اُس مقام میں ہوتا ہے جو اس کی طبیعت کے قریب ہے تو اس حالت میں وہ فعل حق کا اس طرح مشاہدہ نہیں کر سکتا جیسے کہ اُسے کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ایسے موقعہ پر اکثر عارف کو الہامات میں اور دل کے وسوسوں میں، اور الٰہی کیفیت میں اور طبیعت کے اقتضا میں اشتباہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور نیز اس ضمن میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک معاملہ ہے اور اس کے متعلق عارف نہیں جانتا کہ اس کے بارے میں اللہ کا کیا حکم ہے۔ چنانچہ اس میں متردد ہوتا ہے۔ اور کچھ دیر تک وہ اسی تردد کی حالت میں رہتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ مقام حق کی طرف کھنچ جاتا ہے اور وہ اللہ کا ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں اُس کے سامنے ہر ایک چیز متجلّی ہو جاتی ہے۔ اب وہ امور جن کے متعلق پہلے اُسے شبہ تھا۔ وہ اُن امور

پر، اور نیز اپنے شکوک پر دوسری بار نظر ڈالتا ہے، تو ان کے متعلق اللہ کا جو ارادہ اور فیصلہ ہوتا ہے منکشف ہو جاتا ہے۔ اور اس حالت میں وہ گویا اللہ کے ارادے اور فیصلے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ اب اگر وہ عارف "مکلّم" ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ اُس سے کلام کرتا ہے، تو اس حالت میں اُس سے کلام کی جاتی ہے۔ اور اگر وہ مفہم اور "ملقن" ہو تو اس کو افہام و تفہیم اور تلقین کے ذریعے اللہ تعالےٰ کے ارادے اور فیصلے کی اطلاع ہوتی ہے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے تمہارے لئے سورۂ "انفال" میں ایک بصیرت ہے۔ اس سورت کی شانِ نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے "انفال" یعنی مالِ غنیمت کے متعلق پوچھا گیا۔ آپؐ نے اس بارے میں اللہ کا جو فیصلہ تھا، نہ تو اس کی کوئی صراحت فرمائی۔ اور نہ یہ بتایا کہ مالِ غنیمت کیسے تقسیم ہو۔ اس دوران میں معرکۂ بدر پیش آ جاتا ہے۔ اور اس معرکہ کی تفصیل یہ ہے کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام سے واپس مکے آ رہا تھا کہ اُس کے بارے میں اُن کو یہ خبر ملتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ اس قافلے کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے قریش کی ایک فوج مکے سے نکل پڑتی ہے۔ ادھر اللہ تعالےٰ کی مصلحت کا یہ تقاضہ تھا کہ قریش کی اس فوج سے مسلمانوں کی مٹھ بھیڑ ہو جائے۔ تاکہ قریش کو شکست ہو اور اس طرح کفر کو زک پہنچے۔ اس اثنا میں اہلِ مکہ کا تجارتی قافلہ اور قریش کی فوج دونوں کی دونوں مسلمانوں کے قریب آ جاتے ہیں۔ چنانچہ اب مسلمانوں میں آپس میں اختلافِ رائے ہو جاتا ہے

جہاں تک الہامِ حق کا تعلق تھا، اُس کا میلان قریش کی فوج سے دو دو ہاتھ ہونے کی طرف تھا۔ لیکن مسلمانوں کے عام طبائع کا رجحان یہ تھا کہ فوج سے لڑنے کے بجائے قریش کے تجارتی قافلے پر پیش قدمی کی جائے۔ اب یہاں خدا تعالےٰ کی طرف سے مسلمانوں کو راہِ ہدایت کی طرف لے جانے کا سامان پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ بدر کے میدان میں جا اُترتے ہیں۔ اور وہاں جب وہ ذرا ستاتے ہیں تو اُن کو اُونگھ آجاتی ہے، جس کی وجہ سے اُنہیں سکون مل جاتا ہے۔ اور پھر اس موقعہ پر بارش بھی ہو جاتی ہے جس سے اُنہیں اَور اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ اب اُن کے دلوں میں قریش کے مقابلے کے لئے جوش پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ کفار کے خلاف رزم آراء ہوتے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا بظاہر اس کے متعلق یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالےٰ کا یہ منشا و مقصد تھا کہ اسی طرح ہو۔ یا پھر قدرتی طور پر حالات و معاملات کا یہی تقاضہ تھا۔ بہرحال معرکہ بدر ہو چکا۔ لیکن مالِ غنیمت کے متعلق جو سوال تھا وہ ابھی باقی تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ حق کی طرف منجذب ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں اللہ تعالےٰ مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں آپؐ سے کلام کرتا ہے۔

اب اگر تم مجھ سے پوچھو کہ آخر یہ کون سا مقام ہے، جسے تم مقامِ حق کہتے ہو۔ تو اس کے جواب میں میں کہوں گا کہ ملاءِ اعلےٰ اور جلیل القدر مومنوں کی ہمتیں اور اُن کے نصب العین اللہ تعالےٰ کی تجلیات میں سے کسی ایک تجلی میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اور اس تجلی ہی کا نام حظیرۃ القدس ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث

میں آیا ہے کہ حضرت آدمؑ نے حضرت موسیٰ سے باتیں کی تھیں۔ اور یہی حظیرۃ القدس قرآن مجید کی اس آیت۔ " قَدَمَ صِدْقٍ عِندَ رَبِّهِمْ " کا یعنی نیکو کاروں کے لئے اللہ تعالےٰ کے پاس مستقل ٹھکانا ہے، مصداق ہے۔ اب جو شخص حظیرۃ القدس کو پالیتا ہے وہ قرآن مجید کی اس بشارت کا جس کا " علیٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ " اور " يَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ " کی آیات میں ذکر ہے اہل بن جاتا ہے۔ غرضیکہ اس شخص کے نفس میں اس بارگاہ کی طرف سے ایک رنگ آکر گھل مل جاتا ہے اور یہی چیز مومن کے دل میں تقاضۂ حق کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ اس مسئلہ میں خوب غور و فکر کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ بڑا نازک ہے +

تیسواں مشاہدہ

میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی طرف متوجہ تھا کہ ایک نور جو بلندیوں کی طرف پرواز کر رہا تھا، طلوع ہوا۔ اِس نور سے میرا خیال سرتا پا پُر ہوگیا۔ اور اس کی تابانی اور چمک دیکھ کر میں حیرت میں پڑ گیا۔ اسی اثنا میں خود مجھے اپنے اندر سے فراست اور فطری توجہ کے ذریعہ بتایا گیا کہ یہ نور، نورِ عرش ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میں اِس نور کا بڑا دخل ہے۔ چنانچہ جب تک اس نور کی معرفت حاصل نہ ہو، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کی حقیقت کا علم مکمل طور پر میسّر نہیں آتا۔

اس مقام سے اُتر کر جب میں تفکر اور غور و تعمق کے مقام میں آیا تو مجھے حزقیل نبی کا وہ قصہ یاد آگیا جو "الدُرالمنثور" میں مذکور

ہے۔ اور جس میں بتایا گیا ہے کہ حزقیل نبی نے نُورِ عرش کو دیکھا۔ اور اِسی نُور کی زبان ہی کے ذریعہ اُن کی رسالت معرضِ وجود میں آئی۔

اکتیسواں مشاہدہ

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک رُوحانی سوال پُوچھا جیسے کہ کئی بار آپؐ سے اس قسم کے سوال میں پُوچھ چکا ہُوں۔ میں نے آپؐ سے پوچھا کہ دُنیا کی معاملات میں اسباب کو وسیلہ بنانے یا اسباب کو سرے سے ترک کر دینے میں کون سی چیز میرے لئے بہتر ہے۔ میں جب یہ سوال کر چکا تو میری طرف خوشبو کی ایک لپٹ آئی جس کی وجہ سے میرا دل اسباب اولاد اور گھر وغیرہ کی قسم کی چیزوں سے بالکل سرد ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد مجھے جو کشف ہُوا تو میں نے اپنی طبیعت کو اسباب کی طرف مائل پایا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ میری طبیعت کو اسباب سے لذت ملتی ہے۔ اور وہ اسباب کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ لیکن میری طبیعت کے خلاف میری روح کا رجحان توکل کی طرف ہے۔ اور میری روح اسباب

کی بجائے توکل سے لذت حاصل کرتی ہے۔ اور اُسی کی طالب ہے۔
اور نیز میں نے معلوم کرلیا کہ میری طبیعت اور میری رُوح میں باہم کشمکش ہے۔ اور اس سلسلہ میں مَیں نے یہ بھی جان لیا کہ اس مسئلہ میں میرے لئے پسندیدہ روش یہ ہے کہ مَیں اپنی رُوح کے کہنے پر چلوں۔ بے شک اللہ تعالےٰ کا لطف وکرم پہلے سے پردۂ خفا میں ہوتا ہے۔ اور پھر وہ خود بخود ظاہر ہوتا جاتا ہے +

اس کے بعد خوشبو کی ایک اور لپٹ آئی۔ اور اس کے ضمن میں مجھ پر یہ ظاہر کیا گیا کہ تمہارے متعلق اللہ تعالےٰ کا ارادہ یہ ہے کہ وُہ تمہارے ذریعہ سے اُمّت مرحومہ کے منتشر اجزاء کو جمع کردے۔ اسلئے یہ جو کہا گیا ہے کہ "صدّیق اُس وقت تک صدّیق نہیں بن سکتا، جب تک کہ ایک ہزار صدّیق اُسے زندیق نہ کہیں" تمہیں چاہیئے کہ اس چیز سے بچو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تمہارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ فروعات میں اپنی قوم کی ہرگز مخالفت نہ کرو۔ کیونکہ ایسا کرنا ارادۂ الٰہی کے خلاف ہے۔ بعد ازاں اس سلسلہ میں مجھ پر ایک ایسا مثالی طریقہ منکشف ہوا۔ جس سے مجھے سُنّت اور فقۂ حنفی میں تطبیق دینے کی کیفیت معلوم ہوئی اور وہ اس طرح کہ امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمدؒ میں سے جس کا قول سنّت سے قریب ہو، میں اُس قول کو اختیار کر دوں۔ اور جن امور کو اُنہوں نے عام رہنے دیا ہے، میں اُن کی تخصیص کر دوں۔ اور مسائل فقہ کو مرتّب کرنے میں جو مقاصد ان بزرگوں کے پیش نظر تھے،

اُن سے واقف ہوں۔ اور سنّت سے جو عام مفہوم متبادر ہوتا ہے۔
مَیں اُس پر اپنا انحصار رکھوں۔ اور اس معاملہ میں نہ تو دُور از قیاس
تاویل سے کام لیا جائے۔ اور نہ یہ ہو کہ ایک حدیث کو دوسری حدیث
سے بھڑایا جائے۔ اور نہ اُمّت کے کسی فرد کے قول کے خیال سے نبی
صلی اللہ علیہ وسلّم کی صحیح حدیث کو ترک کیا جائے۔ سنّت اور فقۂ حنفی
میں باہم مطابقت دینے کا یہ طریقہ ایسا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس طریقے
کو مکمل کر دے تو یہ دین کے حق میں کبریت احمر اور اکسیر اعظم ثابت ہو +

اس کے بعد خوشبو کی ایک اور لپیٹ آئی۔ اور اسی کے ذیل میں
مجھے اپنے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی یہ وصیت ملی کہ مَیں
انبیاء کے طریقے کو اختیار کروں، اور اُن کے بارہائے گراں کو اُٹھاؤں۔
اور اُن کی خلافت کے لئے کوشاں ہوں۔ اور میں لوگوں کو تعلیم و ارشاد
دوں تو نرمی و شفقت سے دُوں۔ اور اُن کی بہبودی کے لئے دعا کروں۔
اور خُدا سے وہ چیز طلب کروں، جس میں لوگوں کی ظاہری اور باطنی دونو
لحاظ سے بھلائی ہو +

خدا تعالٰی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی
سنّت کو اخذ کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے +

بتیسواں مشاہدہ

میں نے ائمہ اہل بیت رضوان اللہ علیہم کی قبور کی طرف توجہ کی، تو میں نے اُن کا ایک خاص طریقہ دیکھا۔ اور اُن کا یہی طریقہ اولیاء کے طریقوں کی اصل بنیاد ہے۔ اب میں تمہارے لئے اُن کا یہ طریقہ بیان کرتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتا ہوں کہ اس طریقے کے ساتھ اور کون سی چیز منضم ہوئی۔ جس کی وجہ سے بعد میں یہ اولیاء کا طریقہ بن گیا۔

ائمہ اہل بیت کا طریقہ عبارت ہے نسبت "یادداشت" کی طرف التفات سے اور نسبت "یادداشت" سے میری مُراد نفس کی وہ اجمالی بیداری ہے جو مبدائے اول کے لئے ہو، خواہ نفس کی اس بیداری پر حجابات ہی پڑے ہوئے ہوں۔ لیکن اس اجمالی بیداری میں یہ ضروری

ہے کہ کم ازکم اُس وقت تک تو ذہن سے حجابات کا یہ خیال مٹ جائے۔ اور نیز اُس وقت یہ خیال بھی نہ ہونا چاہیئے کہ نفس کی یہ بیداری خود نفس کے جوہر سے پیدا ہوئی ہے ، یا یہ کہ یہ حاصل شدہ علم کا نتیجہ ہے الغرض نفس میں مبدائے اوّل کے لئے ایک بسیط بیداری پیدا ہو۔ اور وہ نفس کسی نہ کسی طرح اس بیداری کی طرف ملتفت بھی ہو ، یہ ہے اولیاء کا طریقہ۔ الغرض جب اولیاء کے نفوس کا جوہر اس نقطے میں فنا ہو گیا۔ تو اس سے اولیاء کے اندر نسبت یادداشت کی طرف التفات کے علاوہ ایک اور ہلیت پیدا ہو گئی۔ اور اسی ضمن میں اُن کو ایک ایسے راستے کا الہام ہُوا ، جس پر چل کر وہ "منزل فنا" تک پہنچ گئے۔ چنانچہ یہ باعث بنا ولایتوں کا اپنے طول و عرض کے ساتھ ظاہر ہونے کا +

تینتیسواں مشاہدہ

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے یہ حقیقت معلوم کی ہے کہ وہ شخص جس سے غیر اللہ سے تعلقاتِ محبت کو بالکل منقطع کرنے، صرف اللہ سبحانہٗ و تعالےٰ ہی سے محبت رکھنے، غیر اللہ سے عداوت کرنے جس طرح کہ سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کی تھی، جب کہ اُنھوں نے اپنے خاندان اور اپنے وطن کو چھوڑتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ سب کے سب سوائے ایک ربّ العالمین کے میرے دشمن ہیں۔" اور نیز اللہ کے ساتھ محض علم و معرفت کے اعتبار سے نہیں بلکہ عملاً اور واقعتہً عشق و محبت رکھنے میں کوتاہی ہو، بے شک وہ شخص فریب زدہ ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اُس شخص کی ان معاملات میں کوتاہی نتیجہ ہو اُس شخص کے اپنے طبعی حالات کا، یا اس کا سبب یہ ہو کہ وہ کائنات

کی اس کثرت میں ایک ہی وجود کو جاری و ساری دیکھنے میں منہمک ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ اس کائنات کی ہر چیز سے محبّت کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک وہی ایک وجود جو کہ اُس کا محبوب ہے، اس ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ الغرض غیراللہ سے بالکل قطع نظر کرنے اور اللہ تعالےٰ سے پوری طرح محبت کرنے میں اوپر کی یہ دو چیزیں مانع ہوں، یا ان کے علاوہ اس کے کوئی اور اسباب ہوں، بہرحال ایسا شخص جو اس کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہے، وہ واقعہ یہ ہے کہ فریب زدہ ہے ؛

مَیں نے آپؐ کی بارگاہ سے بعض ایسے اُمور کا بھی استفادہ کیا جو بالکل خلاف تھے میری اُن باتوں کے جو پہلے سے مجھ میں موجود تھیں۔ اور میری طبیعت کا ان باتوں کی طرف بہت زیادہ رجحان بھی تھا۔ اس ذیل میں یہ تین امور آتے ہیں۔ اور چونکہ مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے ان کا استفادہ کیا ہے، اسی لئے یہ تینوں کے تینوں اب میرے لئے اللہ تعالےٰ کی طرف سے حجت بن گئے ہیں ؛

ان امور میں سے ایک تو یہ ہے کہ مجھے اسباب کی طرف التفات کو ترک کرنے کے لئے کہا گیا۔ لیکن اسباب کے معاملے میں میری اپنی حالت یہ تھی کہ جب کبھی مَیں خود اپنی طبیعت کی طرف مائل ہوتا تھا تو مجھ پر عقلِ معاشی غالب آجاتی تھی۔ اور میں اسباب سے محبت کرنے لگتا تھا۔ اور مجھے یہ فکر ہوتی تھی کہ مَیں اپنے لئے وہ اسباب مہیّا کروں، جن سے

اولاد اور اموال کا حصول ہو سکے۔ لیکن جب کبھی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ملاء اعلیٰ سے ملحق ہوتا تھا، تو یہ سارے کے سارے رذائل مجھ سے چھوٹ جاتے تھے۔ اس ضمن میں مجھ سے جو یہ عہد و پیمان لیا گیا تھا کہ میں اسباب کو وسیلہ بنانا چھوڑ دوں۔ تو اس سے یہ ہوا کہ ایک طرف تو میری طبیعت کا فطری رجحان اسباب کی طرف تھا، اور دوسری طرف مجھ سے ترکِ اسباب کا عہد لیا گیا تھا۔ اب میرے اندر یہ دو چیزیں پیدا ہو گئیں۔ اور یہ ظاہر و محسوس طور پر ایک دوسرے سے متناقض تھیں، جیسے کہ ظلمت اور نور میں اور ٹھنڈی ہوا اور لو میں تناقض ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر بیشتر چیزیں ایسی ہیں، جن میں کوئی تناقض نہیں۔ اور خدا کے فضل سے یہ سب کی سب چیزیں ٹھیک بھی ہیں۔ اور نیز میری طبیعت الہام قبول کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ لیکن فکرِ اسباب اور ترکِ اسباب کا یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اس کے بارے میں مجھ میں یہ تناقض باقی رہا۔ اور یہ بلاوجہ نہیں، بلکہ اس میں کوئی عجیب بھید ہے۔

اور ان امور میں سے دوسرا امر جس کے لئے مجھے کہا گیا، وہ یہ ہے کہ میں فقہ کے یہ جو چار مذاہب ہیں، ان کا پابند رہوں۔ اور ان کے دائرہ سے باہر نہ نکلوں۔ اور جہاں تک ممکن ہو، ان سے موافقت پیدا کروں۔ لیکن اس معاملے میں خود میری اپنی طبیعت کا یہ حال تھا کہ وہ تقلید سے ابا کرتی تھی، اور اسے سرے سے تقلید سے انکار تھا۔ لیکن چونکہ یہ چیز خود میری اپنی طبیعت کے خلاف اطاعت و عبادت کی طرح مجھ سے

طلب کی گئی تھی، اس لئے مجھے اس سے جائے عذر تھی۔ بہرحال اس میں بھی ایک نکتہ ہے، جس کا میں اس وقت ذکر نہیں کرتا۔ لیکن اللہ کے فضل سے میں اس بات کو پا گیا ہوں کہ میری طبیعت کو کیوں مذاہب فقہ کی تقلید سے انکار ہے۔ اور اس کے باوجود مجھے کس لئے مذاہب فقہ کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے ⁂

ان امور میں سے جن کا میں نے بارگاہ نبوی سے استفادہ کیا، آخری امر یہ ہے کہ مجھے حضرت علیؓ پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو فضیلت دینے کا حکم دیا گیا۔ گو اس معاملے میں اگر میری طبیعت اور میرے رجحان کو آزاد چھوڑا جاتا، تو وہ دونوں حضرت علی کو فضیلات دیتے۔ اور آپؓ سے زیادہ محبت کا اظہار کرتے۔ لیکن یہ ایک چیز تھی جو میری طبیعت کی خواہش کے خلاف عبادت کی طرح مجھ پر عائد کی گئی تھی اور مجھ پر اس کی تعمیل لازمی تھی۔ غرضیکہ میرے اندر ان تین متناقض چیزوں کا ہونا ایک عجیب بات ہے۔ کاش ایسا نہ ہوتا لیکن میری ذات میں جامعیت کی جو شدت ہے اسی نے مجھے ان متناقضات میں ڈالا ہے ⁂

چونتیسواں مشاہدہ

مَیں خانۂ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ مَیں نے خود اپنا نُور دیکھا، جو بڑا عظیم الشان تھا۔ اور جس نے کہ تمام اقلیموں کو ڈھانپ لیا۔ اور اُن اقلیموں میں رہنے والوں پر اُس کی روشنی غالب آگئی۔ اور اس سے مَیں یہ سمجھا کہ یہ قطبیت جو مجھے دی گئی ہے، نُور ہے۔ اور قطبیت سے میری مُراد ارشادیت سے ہے۔ اور یہ قطبیت ہی کا نُور ہے کہ جس کی روشنی سب پر غالب آگئی، اور اُس پر کسی کی روشنی غالب نہیں آتی۔ اور اُس کا نُور سب کو زیر کرتا ہے، لیکن وہ خود کسی سے زیر نہیں ہوتا۔ اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جس کو یہ نور اپنے اثر میں نہ لا سکے لیکن خود اس کی حالت یہ ہے کہ وہ کسی کے اثر میں نہیں آتا۔ تمہیں چاہیئے کہ اس مسئلے میں خوب غور و تدبّر کرو۔

پینتیسواں مشاہدہ

مَیں نے خُدا کے اس قدیم گھر اور اس عالی منزلت عمارت یعنی خانہ کعبہ کو دیکھا کہ ملاءِ اعلےٰ اور ملاءِ سافل کی ہمتیں اُس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور اُس کے ساتھ یہ اسی طرح متعلق ہیں جیسے بدن سے رُوح کا تعلق ہوتا ہے۔ اور نیز مَیں نے خانہ کعبہ کو ملاءِ اعلےٰ اور ملاءِ سافل کی ہمتوں اور اُن کی رُوحوں سے اس طرح گھرا ہُوا پایا جیسے گلاب کے پھُول کے اندر عرق اور روئی کے اندر ہوا سرایت کئے ہُوئے ہوتی ہے۔ اور مَیں نے یہ بھی دیکھا کہ اس مقدس گھر کی طرف لوگوں کے دلوں میں جو توجہ اور التفات پایا جاتا ہے، اُس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ہمتوں کا تعلق اُس بارگاہ سے ہوتا ہے، جو مشتمل ہے ملاءِ اعلےٰ اور ملاءِ سافل پر۔ اور چونکہ خانہ کعبہ میں ملاءِ اعلیٰ اور ملاءِ سافل کی

ہمتیں اور اُن کی ارواح بھری ہُوئی ہیں۔ اس لئے لوگوں کے دلوں میں خانۂ کعبہ کے لئے محبت جوش مارتی ہے ٭

چھتّیسواں مشاہدہ

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے مجھے مطلع فرمایا کہ وہ میرے ساتھ کیا کیا نوازشیں کرنے والا ہے۔ اور اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں میں سے وہ کون کون سی نعمت مجھے عطا فرمانے والا ہے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیا اور آخرت دونوں کے مواخذے سے مامون فرما دیا چنانچہ اب اس زندگی میں مجھے جن مصائب سے سابقہ پڑتا ہے: اُن کو خود میری طبیعت کا تقاضہ سمجھیے نہ کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مواخذہ۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ احسان فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ یہ جو کچھ مجھے عطا کیا گیا ہے، یہ ایسی نعمت ہے کہ اولیاء میں سے کم ہی کو یہ میسر ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے مجھے اطمینان بخش زندگی سے بھی نوازا۔ اور اُس نے ہر سعادت سے مجھے قابلِ ذکر حصّہ عطا فرمایا۔ اور نیز اُس نے

مجھے خلافتِ باطنی کی خلعت بخشی۔ چنانچہ پہلی دفعہ جب یہ راز یکبارگی مجھ پر ظاہر ہُوا تو میری عقل چکرا گئی۔ لیکن اس کے بعد یہ راز واضح شکل میں میرے سامنے آیا، تو پھر مَیں اس معاملے کی حقیقت کو سمجھا۔

اس مشاہدہ میں یہ تحقیق بھی شامل ہے ——— کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے عارف کو جو جو نعمتیں ملنے والی ہوتی ہیں، اُن کا اُس پر انکشاف ہو جاتا ہے۔ اس انکشاف کے ضمن میں اہلِ اللہ کے دو طبقے ہیں۔ ایک طبقہ تو کشفِ الٰہی والوں کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اُن واقعات کو جو مستقبل میں ہونے والے ہوتے ہیں "آئینۂ حق" میں دیکھ لیتے ہیں۔ اور اس "آئینۂ حق" سے میری مُراد یہ ہے کہ اہلِ اللہ کا گروہ یہ دیکھ لیتا ہے کہ اب اس بندے پر اللہ کی نظرِ عنایت ہو رہی ہے۔ اور وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ ملاءِ اعلیٰ میں کس کس چیز کو وجود میں لانے اور کس چیز کو دوسری چیز سے قریب کرنے کا ارادہ ہو رہا ہے۔ البتہ خاص اُس واقعہ کی طرف جو ہونے والا ہوتا ہے، اُنکی نظریں نہیں جاتیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ہونے والے واقعہ کی تفصیلات نہیں بتا سکتے جس طرح کہ وہ گروہ جن کو "کشفِ کونی" ہوتا ہے، وہ بتا دیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملاءِ اعلیٰ کے جن خزانوں

اور سرچشموں سے فیوض نازل ہوتے ہیں کشف الٰہی والوں پر یہ خزانے اور سرچشمے منکشف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی بارے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے "ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں۔ اور ہم ان سے مقررہ اندازوں کے مطابق چیزوں کو نازل کرتے ہیں"۔[1] الغرض جب کسی شخص پر ملاء اعلےٰ کے ان خزانوں اور سرچشموں سے انوار کی شعاعیں پڑتی ہیں۔ تو ان شعاعوں سے اُس شخص کے ظاہری اور باطنی حواس۔ جو بعض اوقات اُس شخص کی قوتِ بہیمی ہی کے اجزاء ہوتے ہیں، مغلوب ہو جاتے ہیں۔ اور وہ نہیں جان سکتا کہ کس مقدار میں کوئی چیز ملاء اعلےٰ کے ان خزانوں سے نازل ہونے والی ہے۔ ملاء اعلےٰ کی یہ عجیب بارگاہ ہے اور اس کے معاملہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس بارگاہ میں سوچ۔ بچار، تفکر اور دل کے وسوسوں کو ملاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ تاکہ ان کی وجہ سے کہیں یہ نہ ہو کہ صاحبِ کشف چھوٹی چیز کو بڑا دیکھے اور بڑی چیز کو وہ چھوٹا دیکھے۔ مثال کے طور پر ملاء اعلےٰ کے خزانوں سے کوئی چیز کم مقدار میں نازل ہونے والی تھی۔ لیکن اُس شخص نے اُس چیز کو بڑی مقدار میں دیکھا۔ اور لوگوں کو اس کی خبر دے دی۔ اور بعد میں جب وہ چیز اُس مقدار میں نازل نہ ہوئی تو وہ جھوٹا ٹھہرا

---

[1] "وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۔ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ" (سورہ الحجر: ۲)

چنانچہ قرآن مجید کی اس آیت کے "ہم[1] نے تم سے پہلے جو بھی رسول یا نبی بھیجے، ان میں سے ہر ایک کے ساتھ یہ ہوا کہ جب اس نے کوئی آرزو کی، تو شیطان نے اس کی اس آرزو میں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ ڈال دیا" ایک معنی یہ ہیں +

یہ تو "کشفِ الٰہی" والوں کا بیان ہوا۔ اہل اللہ کا دوسرا گروہ "کشفِ کونی" والوں کا ہے۔ یہ ہونے والے واقعہ کو خواب یا ہاتف کی طرح جان لیتے ہیں۔ اور اس ضمن میں اُن کو ملاءِ اعلےٰ کے خزانوں اور سرچشموں کا علم نہیں ہوتا۔ اُن میں سے بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو کچھ وہ دیکھتے ہیں، اُس کی تعبیر کی اُن کو ضرورت نہیں پڑتی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو واقعہ اِس عالم میں رُونما ہونے والا ہوتا ہے، اُس کی عالمِ مثال میں جو مثالی حقیقت ہوتی ہے۔ اُس کے بارے میں ان لوگوں کے خیال کی تصویر اُس مثالی حقیقت کی جو طبیعتِ کلّی ہے، اُس کی تصویر کے بالکل مطابق ہوتی ہے۔ اِس لئے یہ لوگ جو کچھ دیکھتے ہیں، بجنسہٖ بغیر کسی فرق کے وہ واقعہ ویسا ہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ لیکن "کشفِ کونی" والوں میں سے جو ایسے نہیں ہیں، اُن پر ہونے والے واقعات کے ضمن میں جو کچھ بھی منکشف ہوتا ہے، انہیں اُس میں تعبیر کی ضرورت پڑتی ہے اس لئے ان کا ہونے والے واقعہ کی اصل حقیقت تک پہنچنا "قتادِ جیسے خاردار درخت کو

---

[1] وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ۔ (سورۃ الحج ۵۱)

رندنے سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے +

تحقیق مزید ———— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اُمّتِ مرحومہ کے لئے اُسوۂ حسنہ یعنی بہت اچھا نمونہ ہے - اب اُمّت میں سے جو اصحابِ خلافتِ ظاہرہ ہیں، یعنی وہ لوگ جن کا کام شریعت کی حدود کو قائم کرنا، جہاد کے لئے ساز و سامان فراہم کرنا، سلطنت کی سرحدوں کی حفاظت کرنا، وفود بھیجنا، صدقات اور خراج جمع کرنا اور مستحقین پر اُن کو تقسیم کرنا، مقدموں کا فیصلہ کرنا، یتیموں، مسلمانوں کے اوقاف، گزرگاہوں، مسجدوں اور اسی طرح کے جو اور اُمور ہیں، اُن کی خبر گیری کرنا، ان لوگوں کے لئے تو رسول اللہ کا اُسوۂ حسنہ آپ کے وہ احکام و اوامر ہیں، جو مذکورہ بالا اُمور کے متعلق کتب احادیث میں بڑی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ جس شخص پر ان امور کی ذمہ داری ہوتی ہے، ہم اُس کو خلیفہ ظاہر کرتے ہیں +

اصحاب خلافتِ ظاہرہ کے علاوہ اُمّت میں ایک گروہ اصحابِ خلافت باطنہ کا ہے۔ یہ لوگ قرآن، سنّت اور شریعت کی تعلیم دیتے، نیک کاموں کا حکم کرتے اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں۔ ان کی باتیں دین کے لئے مدد کا باعث بنتی ہیں، خواہ یہ مدد مناظرے اور مجادلے کی شکل میں ہو۔ جیسے کہ متکلمین کا گروہ دین کی مدد کرتا ہے۔ یا یہ مدد وعظ و ارشاد کے ذریعے

ہو جیسے کہ خطیب اور واعظ کرتے ہیں۔ یا ان لوگوں کی صحبت سے دین کو تقویت ملے، جیسے کہ مشائخ صوفیاء ہوتے ہیں۔ اور نیز وہ لوگ جو نمازیں پڑھتے اور حج ادا کرتے ہیں۔ اور وہ جو "احسان" کی طرف دوسروں کی رہنمائی کرتے اور عبادت و زہد کی انہیں ترغیب دیتے ہیں، یہ سب کے سب لوگ جو ان امور کو سرانجام دیتے ہیں، ہم یہاں اُن کو خلفائے باطنی کا نام دیتے ہیں۔ اِن خلفائے باطنی کے لئے بھی خلفائے ظاہری کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ حسنہ کتب احادیث میں اُن قواعد و آداب کی شکل میں بڑی تفصیل سے موجود ہے، جو آپ نے مذکورہ بالا اُمور کے متعلق مقرر فرمائے ہیں۔

یہ بات جو ہم نے یہاں بطور ایک مقدمہ کے بیان کی ہے، اس پر کلیتہً سب کا اتفاق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تم فقہاء کو دیکھتے ہو کہ وہ فقہی مسائل کے ضمن میں جو احکام استنباط کرتے ہیں، اُن میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہی کو مدار مانتے ہیں۔ اور اُسی کے مشابہ وہ اور اُمور تجویز کرتے ہیں۔ اور ان سب میں وہ سنّت ہی کی سند لیتے ہیں۔ الغرض جب ہم نے اس اصل کو تسلیم کیا کہ خلافت ظاہرہ اور خلافت باطنہ ہر دو کے لئے رسول اللہ صلی اللہ کی ذات اقدس میں اُسوۂ حسنہ ہے، تو اب ہم اِس اصل سے ذیلی اور فرعی مسائل کا استنباط کرتے ہیں۔ ان مسائل میں سے ایک بیعت کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو ہم تفصیل سے اپنی کتاب "القول الجمیل فی بیان سواء السبیل" میں

ذکر کر چکے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا مسئلہ خلیفۂ باطن کا اپنے داعی اور سفیر بھیجنے کا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اطرافِ مُلک میں اور مختلف قبائل کی طرف اپنے نائب بھیجا کرتے تھے، جو لوگوں کو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لانے کی دعوت دیتے اور اُن کو شریعت کے احکام و اوامر کی تلقین کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپؐ نے حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کو اشعریوں کی طرف، حضرت ابوذرؓ غفاری کو قبیلہ غفار و اسلم کی طرف، حضرت عمروؓ بن مرہ کو قبیلہ جہینہ کی طرف، حضرت عامرؓ حضرمی کو بنی عبدالقیس کی طرف اور حضرت مصعبؓ بن عمیر کو اہلِ مدینہ کی طرف، اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ اور اس ضمن میں جہاں تک ظاہری خلافت کے معاملات کا تعلق تھا آپؐ نے کوئی معاملہ بھی اُن کے سپرد نہ فرمایا تھا۔ الغرض یہ لوگ آپؐ کی خلافتِ باطنی کے داعی اور سفیر تھے۔ اور ان کے ذمّے آپؐ نے صرف یہ کام کیا تھا کہ وہ لوگوں کو اسلام کی طرف بُلائیں۔ اور اُن کو قرآن اور سنّت کی تعلیم دیں +

خلیفۂ ظاہر اور خلیفۂ باطن میں فرق یہ ہے کہ اگر ایک سے زیادہ بھی خلیفۂ باطن ہوں تو اُن میں باہم نزاع کی نوبت نہیں آتی۔ لیکن خلیفۂ ظاہر کا معاملہ اس سے برعکس ہوتا ہے۔ اور خلیفۂ باطن اور اس کے داعی اور سفیر میں فرق یہ ہے کہ خلیفۂ باطن کے لئے ضروری ہے کہ وہ عالم ہو اور اس کے علم کا دائرہ وسیع ہو۔ اور اسی طرح وہ وسیع الکلام بھی ہو۔ اور جہاں تک داعی کا تعلق ہے، اُس کے پاس تو خلیفۂ باطن کی طرف سے

ایک لکھا ہُوا دستور العمل ہونا چاہیئے، جس پر کہ وہ عمل کرے۔ اور اُس سے وہ تجاوز نہ کرے۔ اور اگر دعوت کے سلسلہ میں اُس کو کوئی مشکل پیش آجائے تو اُس کے بارے میں وہ خلیفۂ باطن کی طرف رجوع کرے۔ خلافتِ باطنی میں جو داعی اور سفیر بھیجے جاتے ہیں اور اُن کے متعلق جو قواعد و احکام ہیں، اُن میں سے بیشتر قواعد و احکام کا ماخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ طریقؐ کار ہے، جو ہجرت سے قبل مختلف قبائل کی طرف آپؐ کا اپنے داعی اور سفیر بھیجنے کا تھا۔ تم اس چیز کو اچھی طرح سے سمجھ لو۔ اور اس میں خوب تدبّر کرو۔

لہ مورخین عموماً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنی عہد سے اسلامی ریاست کی ابتدا مانتے ہیں۔ اُن کے نزدیک مکے میں مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی کوئی باقاعدہ سیاسی حیثیت نہ تھی۔ شاہ ولی اللہ کی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت مکہ ہی میں تشکیل پا چکی تھی۔ لیکن یہ حکومت تم تستّر کے اصول پر مبنی تھی۔ یہ خلافت باطنی ہے آج کی اصطلاحی زبان میں ہم اسے پارٹی کہیں گے۔ مترجم

سینتیسواں مشاہدہ

مجھ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوئی اور اس حالت میں میں نے اپنی رُوح کو دیکھا کہ وہ دوچند ہو گئی ہے اور بہت بڑھ گئی ہے۔ اور اُس میں وسعت اور فراخی پیدا ہو گئی ہے۔ جب میں نے اپنی اس وجدانی کیفیت میں غور کیا تو میں سمجھ گیا کہ یہ وہ حالت ہے، جو عارفوں کو پیش آیا کرتی ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ الٰہی بارگاہوں کے وہ اسرار جو ملاءِ اعلےٰ میں انعقاد پذیر ہوتے ہیں، وہ عارف کی رُوح میں حلول کرتے ہیں۔ اور نیز وہ اسمائے الٰہیہ جو پہلے تو مدارکِ اجمالی میں واقعہ ہوتے ہیں۔ اور پھر وہاں سے تلاوت کی جانے والی آیات کی صورت میں کسی منتخب رسول کے دل میں نزول کرتے ہیں۔ یا وہ مشہور اسماء کہ چونکہ آثارِ حق کو ان اسماء سے تعبیر کرنا لوگوں میں ایک دستور بن جاتا ہے۔

اور یہ چیز ان کے ہاں طبیعت اور جبلّت کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے
غرضیکہ ان اسمائے الٰہیہ اور ان اسمائے مشہور کی برکتیں اُس عارف کی
روح پر نازل ہوتی ہیں۔ چنانچہ اُس کی رُوح میں ان الٰہی بارگاہوں کے
اسرار کے حصول اور ان اسماء کی برکتوں کے نزول سے وسعت اور قوت
پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس عارف
کو نظر بھر کے دیکھ لے تو وہ اُس سے اتنا مرعوب ہو جاتا ہے کہ اُس کا
دل اس عارف کی تعظیم کے جذبے سے بھر جاتا ہے۔ اور نیز اس عارف
کے چہرے کے انوار سے اُس کی بزرگی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور اُس میں جو
فراست اور ہمّت ہوتی ہے۔ اُس سے برکتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ الغرض
مَیں نے اپنی رُوح کو جو اس قدر وسیع، اور فراخ پایا تو یہ راز ہے اُس
کا۔ اور یہ اُس کی حقیقت ہے۔

اڑتیسواں مشاہدہ

مَیں نے ایک بارگاہ دیکھی، جس کی طبیعت کلیہ سے ایسی ہی نسبت ہے، جیسے کہ افرادِ انسانی میں سے ایک فرد کی طبیعت کی اُس کے اندر جو ارادہ اور عزم کی قوت ہے، اُس کے ساتھ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر پہلے انسان اپنے خیال میں کسی نفع کے حصول اور کسی مضرت کو دفع کرنے کی لذت کو متمثل کرتا ہے، پھر اُس کا یہ خیال اُس نفع یا لذت کی جو صورت ذہن میں بنتی ہے، اُس کا خلاصہ اس شخص میں جو ارادہ و عزم کی قوت ہوتی ہے، اُس کے سپرد کرتا ہے۔ چنانچہ اس سے اس شخص کی قوت ارادہ میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ عزم ہے۔ اور پھر جس چیز کے لئے عزم ہو، اُس کو حاصل کرنے کے لئے بدن کے اعضاء متحرک ہوتے ہیں۔ بعینہٖ یہی کیفیت ایک قوی نفس کی جب کہ

وہ سب چیزوں سے تجرد اختیار کر لیتا ہے، ہوتی ہے۔ مثلاً عالم ناسوت میں جو واقعہ رونما ہونے والا ہوتا ہے، سب سے پہلے اُس واقعہ کی ہمت اس نفس میں متمثل ہوتی ہے۔ یہ نفس اس ہمت کی جو صورت کہ اُس کے اندر بنتی ہے، اُس کا خلاصہ نکال کر اُس کو اس بارگاہ تک جس کا ذکر ہم نے شروع میں کیا ہے، پہنچاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس نفس کو اپنے رب کی معرفت بھی حاصل ہوتی ہے۔ الغرض ہونے والے واقعہ کی ہمت کی اس صورت کا خلاصہ جب اُس بارگاہ میں پہنچتا ہے تو اس سے طبیعت کلیہ میں قضا روبہ حرکت ہوتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہونے والے واقعہ کی صورت عالم مثال میں ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد جب وہ وقت آتا ہے کہ یہ واقعہ عالم ناسوت میں ظاہر ہو تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے عالم مثال میں اس کی مثالی صورت بنائی تھی۔ اسی طرح وہ عالم اجسام میں اس کی جسمانی صورت پیدا کر دیتا ہے۔ اس ضمن میں میں نے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ نفس کی ہمت کی اس طرح کی تاثیر جس کا ذکر ابھی ہوا ہے، انسانیت کا کمال ہے۔ اور یہی وہ کمال ہے کہ مرنے کے بعد جب یہ نفس عالم برزخ میں پہنچتا ہے تو یہ جو روح الٰہی ہیں سے ایک جارحہ بن جاتا ہے۔

اس مشاہدہ میں یہ تحقیق بھی ——— بعض دفعہ ہمارا

پر منکشف ہوتا ہے کہ قضا کا یہ حتمی فیصلہ ہے کہ فلاں واقعہ اسی طرح ہو۔
اور یہ کہ ایسا ہونا قضائے مبرم سے مقدر ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے بعد
عارف اپنی پوری ہمت سے دعا کرتا ہے۔ اور اس دعا میں وہ بہت عجز و
الحاح سے کام لیتا ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ قضا کسی دیگری
صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور اس واقعہ کی بجائے کوئی دوسرا واقعہ
ظہور پذیر ہو جاتا ہے، جو اس عارف کی ہمت کے مطابق ہوتا ہے۔ اسکی
مثال حماد دباس کے ساتھیوں میں سے ایک تاجر کا وہ قصہ ہے۔ جو
سید عبد القادر جیلانی رضؓ سے مروی ہے۔ اور نیز مرزا ہدایت اللہ کے معاملہ
میں وہ واقعہ جو میرے والد بزرگوار کو پیش آیا۔ اسی سلسلہ میں اس طرح
کے اور بھی واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

اس معاملے میں یہاں ایک بڑا اشکال ہے، جو کسی سے مخفی
نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اس طرح جو کچھ
ہوتا ہے، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ
بعض اسباب عالیہ کا یہ تاکیدی اقتضا ہوتا ہے کہ یہ امر اس طرح ہو۔ اور
جب کسی امر کے متعلق یہ اقتضا ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس امر
کے متعلق یہ فیصلہ مقدر ہو چکا ہے۔ اور اس کے خلاف کوئی اور احتمال نہیں
ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو اس اقتضا کے ضمن میں ہونے والے واقعہ
کی پوری صورت اس طرح مرتب ہو جاتی ہے کہ کسی سبب سے اس میں خلل
پڑنے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ اب عارف پر یہ اقتضائے تاکیدی معہ

ہونے والے واقعہ کی صورت اور ہیئت کے منکشف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس انعکاس کے روزن سے قضائے مبرم کو دیکھتا ہے۔ لیکن وہ اِسکو صاف طور پر پہچان نہیں سکتا۔ اور اُس کو یہ گمان ہوتا ہے کہ میں نے قضائے مبرم کو واضح طور پر دیکھ لیا۔ پھر اُس عارف کی ہمّت نزولِ قضا کے اسباب میں سے ایک سبب بن جاتی ہے۔ اور جب ان اسباب میں باہم تصادم ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت اِن اسباب میں سے کسی سبب کی قوتوں میں "قبض[۱]" پیدا کر دیتی ہے۔ اور کسی میں "بسط" اور اس طرح جو ہونے والا واقعہ ہوتا ہے، وہ ظاہر ہو کر رہتا ہے +

اس طرح کے واقعات کی دوسری صورت یہ ہے کہ ہوتا یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ عالمِ ناسوت میں ایک واقعہ کو جسمانی اجزاء میں مرکب کرنے سے پہلے وہ روحانی قوتوں کے اجزاء سے اُس واقعہ کو عالمِ مثال میں ترکیب دیتا ہے۔ اور پھر وہ اس مثالی صورت کو اِس دُنیا میں نازل فرماتا ہے۔ اور اس طرح اس واقعہ کی مثالی صورت اُس کی ناسوتی صورت سے

---

[۱] "قبض" کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز میں فطری استعداد ہے۔ لیکن کسی مصلحت الٰہی کی وجہ سے وہ فطری استعداد پوری طرح بروئے کار نہیں آتی۔ اور "بسط" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک چیز کی فطری استعداد میں خلاف معمول بہت زیادہ قوت اور اثر پیدا کر دیتا ہے۔

(مترجم)

متحد ہو جاتی ہے۔ اور یہی مراد ہے "انعام" "میزان" اور "حدید" کو نازل کرنے سے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اور نیز یہی مطلب ہے اس کا کہ آسمان سے بلائیں اُترتی ہیں۔ اور دعاؤں سے ان کا تدارک ہو جاتا ہے +

عالم مثال میں اللہ تعالےٰ کسی واقعہ کی جو مثالی صورت پیدا کرتا ہے، وہ کبھی کبھی مٹ بھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق اللہ تعالےٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ "اللہ جس کو چاہتا ہے، مٹا دیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے، باقی رکھتا ہے، اور اللہ کے پاس تو اُم الکتاب ہے"۔ کسی چیز کے اس طرح مٹانے کا نام "ردِّ قضا" ہے۔ اور اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ "دعا کے سوا قضاء کو کوئی چیز رد نہیں کر سکتی"۔ الغرض عارف پر ایک واقعہ کی صورت کا انکشاف ہوتا ہے اور وہ اس کو قضائے مبرم کا فیصلہ سمجھ لیتا ہے۔ پھر اُس عارف کی ہمت اس واقعہ میں مزاحم ہوتی ہے تو وہ اس کا

ل خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ۔ سورۃ الزمر

ے اللّٰهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ۔ سورۃ الشوریٰ۔
لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ سورۃ الحدید ۲۵

سے وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ۔ سورۃ الحدید ۲۵

رُخ اُس کی طبعی راہ سے دُوسری طرف پھیر دیتی ہے +

اس مشاہدہ میں یہ مزید تحقیق بھی ہے ——— کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالے کسی بندے سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے اور وہ بات وعدے کے مطابق نہیں ہوتی۔ باوجود اس کے کہ یہ وعدہ سچے الہام کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرح وعدے کا پورا نہ ہونا اکثر لوگوں کے لئے ایک اشکال بن گیا ہے اور مشائخ صوفیاء نے اس اشکال کو دُور کرنے کے لئے اس ضمن میں گفتگو بھی کی ہے۔ مثلاً اُن کا کہنا یہ ہے کہ بسا اوقات ایک بندے کے ساتھ اللہ تعالے نے ایک اچھی بات کا وعدہ کرتا ہے اور وہ اسی وعدہ کی بنا پر اس اچھی چیز کی رغبت کرنے لگتا ہے اور وہ اس کا انتظار کرتا ہے۔ لیکن بعد میں یہ وعدہ پورا نہیں ہوتا۔ مشائخ کا خیال ہے کہ اس وعدے کا پورا نہ ہونا اُس بندے کے حق میں اللہ تعالے کے مزید لطف وکرم کا باعث بنتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ یہ شخص اُس اچھی چیز کی محبت سے جس کا کہ اُس سے وعدہ کیا گیا تھا، ہمیشہ کی محبت کی طرف اور افعال الٰہی کی محبت سے اللہ تعالے کی ذات وصفات کی محبت کی طرف ترقی کرتا ہے۔ یعنی ان مشائخ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالے کا وعدے کا پورا نہ کرنا کوئی نقص نہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اللہ تعالے کی ذات کو اس طرح کی بات سے بھی منزہ کرنا ضروری

اور تابعداری ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ وعدہ پورا نہ کرنا بسا اوقات بخل فریب اور دھوکا ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے یہ ایک نقص ہے۔ اور خدا تعالیٰ کی ذات اس طرح کے نقائص سے بالکل پاک ہے۔

الغرض ان مشائخ کے نزدیک اللہ کا اپنے وعدہ کو پورا نہ کرنا اکثر اوقات بندے پر اللہ تعالےٰ کے مزید لطف وکرم کا باعث، اس کی ترقی کا سبب اور اس کے قرب کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یعنی وعدہ پورا نہ کرنا ان کی رائے میں اللہ تعالےٰ کی صفاتِ کمال میں سے ایک صفت ہوئی۔ چنانچہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے وہ نظیریں بھی پیش کرتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ان کی ایک نظیر یہ ہے کہ بعض دفعہ کلام میں رعایت فاصلہ کے خیال سے کلمہ کو مقدم یا موخر کر دیا جاتا ہے اور اس طرح جب کہ کسی حقیقت کی صحیح تعبیر کے لئے موزوں کلمہ نہ ملے تو اس حقیقت کو مجازی رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ مشائخ نے اس اسلوب کلام کو بھی اللہ تعالےٰ کے وعدہ پورا نہ کرنے کے جواز میں بطور نظیر کے پیش کیا ہے۔ اور اس ضمن میں اس طرح کی اور مثالیں بھی دیتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ اگر ہم کلام میں کلمہ کی تقدیم و تاخیر کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ اس کے لئے مجبور تھا۔ اور وہ اس کے برعکس کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ تو یہ ایک نقص ہوا۔ اور اگر کلمہ کی تقدیم و تاخیر کو اس طرح سمجھیں کہ چونکہ قرآن مجید قریش کی زبان میں نازل

ہُوا۔ اور ان کے ہاں رعایت فاصلہ یا ترکیب کی موزونیت اور اُس کی عمدگی کے خیال سے کلام میں کسی کلمے کو اپنی جگہ سے مقدم اور موخر کر دیا کرتے تھے۔ اس لئے کلامِ الٰہی میں کلمہ کو مقدم اور موخر کیا گیا۔ اور یہ تقدیم و تاخیر کسی اضطراری وجہ سے نہیں تھی، بلکہ یہ تو قریش پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی کہ قرآن ان کی زبان میں جس کو وہ جانتے تھے، نازل ہُوا۔ تاکہ وہ اسے سمجھیں اور اس میں خوب غور و تدبّر کریں۔ الغرض اگر ہم کلمے کی تقدیم و تاخیر کو اس طرح لیں تو پھر تو واقعی کلمے کا مقدم و موخر ہونا صفاتِ کمال سے ہے۔ لیکن مشائخ نے اُسے اللہ تعالیٰ کے کسی وعدہ کو پورا نہ کرنے کے ثبوت میں بطور نظیر کے جو پیش کیا ہے، اب تم خود ہی دیکھ لو کہ یہ کہاں تک صحیح ہے۔ باقی ہم نے تو یہاں اس ضمن میں صرف اُن کا قول اور اُس کی توجیہہ عرض کی ہے +

اس سلسلہ میں ہمارا کہنا ہے کہ کسی وعدہ الٰہی کے متعلق مشائخ کا یہ وجدان جس کا کہ اُن پر انکشاف ہُوا، بے شک حق تھا۔ لیکن ہُوا یہ کہ اس انکشاف کے بعد جب ان مشائخ نے اپنے اس وجدان پر سوچ بچار کی تو ظاہر ہے وہ علوم جو پہلے سے اُن کے سینوں میں تھے۔ اس سوچ بچار کی حالت میں اُن کے ذہنوں میں آ موجود ہُوئے۔ چنانچہ انھوں نے ان علوم ہی کے پیرایہ بیان میں اپنے اس وجدان کی تاویل کی۔ اور اس تاویل سے اُن کے دل غیر شعوری طور پر مطمئن بھی ہو گئے۔ اور یہ بات قرینِ قیاس بھی ہے۔ اور ایسا اکثر ہوتا ہے اور یہی چیز اس مسئلے میں

جو اس وقت زیر بحث ہے، بطور نظیر کے پیش کی جا سکتی ہے۔ یعنی جس طرح اللہ اپنے بندے سے جو وعدہ کرتا ہے وہ حق ہوتا ہے۔ لیکن اس وعدہ میں جس چیز کا ذکر ہوتا ہے، وہ کبھی ظاہر ہوتی ہے اور کبھی نہیں، اسی طرح مشائخ کو جو وجدان ہوتا ہے، وہ تو حق ہے، لیکن اُس وجدان کی جو وہ تعبیر و تاویل کرتے ہیں، وہ اُن کی اپنی گھڑی ہوئی ہوتی ہے۔ اب تم اس میں خوب غور و تدبّر کرو +

الغرض اس مسئلے میں واضح اور صریح حقیقت یہ ہے کہ جب بندے اور صاف طور پر ظاہر ہونے والی تجلّی کی کیفیت کے درمیان حجاب حائل ہو اور بندے اور اس تجلّی کی درمیانی فضا اتنی تنگ ہو جائے کہ اُن دونو میں انگوٹھے اور اُس کے ساتھ کی اُنگلی کے بیچ میں جو جگہ ہے، اُس کے برابر گنجائش رہ جائے تو اُس وقت بندے کو جو الہام ہوتا ہے، تو وہ الہام جس حالت میں کہ بندہ ہوتا ہے، اُسی کے مطابق حقائق کی تجلّی کی ایک قسم ہوتی ہے۔ چنانچہ حقائق کی یہ تجلّی یا تو خطاب کی صورت اختیار کرتی ہے، یا الہام کی یا دل میں خود بخود کسی خیال کے پیدا ہونے کی، اور یا ہاتف کی۔ اور اس بات کا انحصار کہ حقائق کی یہ تجلّی کون سی صورت اختیار کرے، قوائے دراکہ کی مختلف استعدادوں پر اور نیز اس وقت کن اسباب کا غلبہ ہوتا ہے، اُن پر ہے۔ الغرض جیسے حالات ہوتے ہیں، اُسی کے مطابق حقائق کی تجلّی ظہور پذیر ہوتی ہے +

اب رہا یہ سوال کہ الہام کے ذریعہ بندہ سے جو وعدہ ہوتا ہے اُس کے پورا نہ ہونے کا کیا سبب ہے؟ سو اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ مثلاً ملاء اعلیٰ کے اکابر میں سے ایک بڑے فرد کا اقتضا ایک شخص پر منکشف ہوتا ہے۔ اب اگر اس اقتضا کی راہ میں کوئی چیز حائل نہ ہو، اور اُس کو پوری آزادی ہو تو حکمت الٰہی میں یہ طے تھا کہ اُس فرد کی دعا قبول ہوتی۔ اور جس چیز کا وہ متقاضی تھا وہ پوری ہو جاتی۔ لیکن ملاء اعلیٰ کے اس فرد کے علاوہ اور بھی اقتضا تھے، جو اس فرد کے اقتضا کی طرح کے یا اس سے زیادہ ضروری تھے اور حکمت الٰہی میں یہ طے ہے کہ جب دو اقتضا اُس قوت میں جو کہ طبیعت کلیہ میں بمنزلہ انسان کی قوتِ عزم و ارادہ کے ہے، اور یہی قوت انسان کے اعضاء کی حرکت کا باعث بنتی ہے، جمع ہوں۔ اور دونوں آپس میں کشمکش ہو تو جس جس چیز کا یہ دونوں اقتضا مطالبہ کرتے ہیں، ان کے علاوہ کسی تیسری چیز کے حق میں فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ اور عالم مثال میں کوئی دوسری صورت ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔

اب یہ شخص جس پر یہ واقعہ منکشف ہوتا ہے، وہ بیشتر اُس قوتِ عازمہ کی اصل تک جو طبیعت کلیہ کے قلب میں متمکن ہے، نہیں پہنچ پاتا۔ اس سلسلہ میں میرا خیال یہ ہے کہ طبیعت کلیہ کی یہ قوتِ عازمہ عرش میں ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے مرکزِ عرش تمام عناصر اور موالید یعنی جمادات، نباتات، اور انسانوں کا مرجع و ماویٰ بن گیا ہے۔ الغرض

جس شخص پر یہ واقعہ منکشف ہوا تھا، وہ طبیعت کلیہ کی قوت عازمہ کی اصل تک اس طرح نہ پہنچ سکا کہ وہ اُس قوت سے بلا واسطہ متصل ہو جاتا، اور اُس سے بالمشافہ علم حاصل کرتا۔ اس کے برعکس یہ ہُوا کہ وہ ملاء اعلٰی کے اُس فرد کا جو اقتضا تھا اُس کے خلاصے اور صرف اُس کی خالص ہمت تک یہ شخص پہنچا۔ اور اسی روزن سے اُس نے طبیعت کلیہ کی قوتِ عازمہ کو دیکھا۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اُس شخص کی نظر میں جو چیز کہ وہ دیکھ رہا تھا، اُس چیز کے ساتھ ساتھ حس شیشے میں وہ اُس چیز کو دیکھ رہا تھا، اُس کا رنگ بھی مخلوط ہو گیا۔ چنانچہ اس کی وجہ سے وہ شخص اسباب کے احاطے سے قاصر رہا۔ اور اصل حقیقت کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ اور اس ضمن میں اُس نے صرف ملاء اعلٰی کے اُس بڑے فرد کے اقتضا، اور بعض اُس کے حکم کو جانا +

بات دراصل یہ ہے کہ ملاء اعلیٰ کے اس بڑے فرد کی ہمت جو احکام کہ موافق ہوں انکو جمع کرنیوالی ہوتی ہے اور جو مخالف احکام ہوں اُن کو روکتی ہے۔ اور موافق احکام کو جمع کرنے اور مخالف احکام کو روکنے کی یہ کشمکش غیر شعوری طور پر اس شخص کے اندر بھی سرایت کر جاتی ہے، جس پر ملاء اعلٰی کے اس بڑے فرد کے اقتضا کا انکشاف ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اس شخص پر اس اقتضا کا انکشاف ہوتا ہے۔ تو اُن اسباب کی بنا پر جن میں سے بعض کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ اور بعض کا ذکر ہم نے نہیں کیا، اُس شخص کے لیے یہ انکشاف خطاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اس خطاب میں اس شخص

کو واقعہ کی بالمشافہ خبر نہیں دی جاتی کہ اُس خبر میں کسی قسم کا کوئی شک نہ رہے، اور وہ یقینی طور پر سچی خبر ہو۔ اس انکشاف کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ اُس شخص پر اجمالاً ایک بات کا انکشاف ہوتا ہے۔ اور یہ اجمالی انکشاف اُس کے لئے اجمالی الہام میں بدل جاتا ہے۔ چنانچہ اُس شخص کے اس الہام پر جو اُسے اجمالی انکشاف کے ضمن میں ہوتا ہے، وہ علوم جو پہلے سے اُس کے سینے میں جمع ہوتے ہیں، پرورش کرتے ہیں۔ اور غیر شعوری طور پر وہ اس شخص کے اس الہام کی اپنے رنگ میں شرح کرتے ہیں بالکل اُسی طرح جس طرح کہ جب کسی شخص کو خواب میں کوئی اجمالی انکشاف ہوتا ہے تو علوم جو اس خواب دیکھنے والے کے سینے میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں، وہ اُس کے اس انکشاف اجمالی کو رؤیا کی شکل دے دیتے ہیں، اور اُس کو اس رؤیا کی تعبیر کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی طرح اس شخص کو اپنے انکشاف اجمالی کے لئے بھی جو بعد میں الہام کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اور پھر اُس کے سینے میں پہلے سے جو علوم جمع ہوتے ہیں، وہ اُس الہام کو اپنے رنگ کی تاویل دے دیتے ہیں۔ الغرض اس انکشاف اجمالی کو بھی جو الہام اور اس طرح کی تاویل سے مخلوط ہوتا ہے، تعبیر کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ انکشاف اجمالی کے سلسلہ میں اُس شخص کو جو الہام ہوا تھا۔ اور اُس نے اس الہام کی جو شرح کی تھی اور یہ شرح جیسے کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، اُس شخص کے اندر پہلے سے جو علوم جمع تھے، اُن کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اب اگر یہ صحیح ہے

تو اُس شخص کو اس شرح سے طمانیت اور سکون کیوں حاصل ہُوا؟ بات یہ ہے اُس شخص کے اس سکون اور طمانیت کا اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ یہ تو دراصل اُسے اُس انکشاف اجمالی کی وجہ سے حاصل ہُوا تھا۔ جو اس شرح میں بطور اساس کے محفوظ تھی۔ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کو انکشاف اجمالی ہُوا پھر اُس شخص کے اپنے نفس کے وسوسے، اُس کی طبیعت کی جلد بازی اور شیطان کے بہلاوے اُس پر چل پڑے۔ اور اُنہوں نے اس شخص کے اندر ایسا اشتباہ پیدا کر دیا کہ اُس شخص کی نظر اصل واقعہ۔ اور بعد کی ملاوٹوں میں تمیز نہ کر سکی۔ چنانچہ اس کی وجہ سے اُس پر اصل حقیقت کا انکشاف نہ ہو سکا۔

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے واقعہ کو اس مخلوط صورت میں دیکھا۔ اُس نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فلاں چیز کا وعدہ کیا۔ لیکن وہ وعدہ پورا نہ ہُوا۔ اب ایک اور شخص ہے جس پر ایک واقعہ کا انکشاف ہُوا، اور اس نے اُس کی ایک ایک چیز کو الگ الگ صاف صاف دیکھ لیا۔ اور اس نے کہا کہ یہ وعدہ اجمالی ہے۔ چنانچہ یہ وعدہ پورا ہو گیا۔ اب یہ اَور بات ہے کہ یہ وعدہ کس رنگ میں اور کس لب میں پورا ہُوا ہو۔ باقی رہا وہ انکشافِ اجمالی کہ جس شخص کو یہ انکشافِ اجمالی ہُوا تھا، اُس کے سینے میں پہلے سے جو علوم محفوظ تھے، اُس نے ان علوم کی روشنی میں اس انکشافِ اجمالی کی شرح و تفسیر کی۔ تو واقعہ یہ ہے کہ اس انکشافِ اجمالی کی تعبیر کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ صحیح طرح نہیں ہو پاتی

یا اس سلسلہ میں سچ کے ساتھ جھوٹ بھی مل جاتا ہے۔ اور یہ چیز خالص نہیں رہتی۔ لیکن یہ دونوں کی دونوں صورتیں تو اُن لوگوں کو پیش آتی ہیں، جو درجۂ متوسط کے عارف ہوتے ہیں۔ جہاں تک عارفین میں سے اہلِ کمال کا تعلق ہے، وہ تو ان خطروں سے بالکل مامون رہتے ہیں۔ البتہ اس سلسلہ میں اُن کو بھی بے شک تعبیر کی ضرورت پڑتی ہے لیکن چونکہ اُنہیں وجود کے ظہور کے جو احکام و قوانین ہیں، اُن پر پورا عبور ہوتا ہے۔ اس لئے اُن کو تعبیر میں اتنی دقت نہیں ہوتی۔ اور انکشاف اجمالی سے جو واقعہ مقصود ہوتا ہے، وہ اُن کے لئے مشتبہ نہیں رہتا۔ باقی اللہ اِن چیزوں کو بہتر جانتا ہے +

اس مشاہدہ میں یہ تحقیق و تمثیل بھی ہے ——— تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس عالم میں مخلوقات کے ظہور کی جو علتیں ہیں، اُن کا سلسلۂ ارتقاء آخر میں جا کر ارادۂ الٰہی پر ختم ہوتا ہے۔ لیکن خود اس ارادۂ الٰہی کی بھی اپنی ایک علت ہوتی ہے، جس سے کہ اس کا صدور ہوتا ہے، اور وہ علت ہے ذاتِ الٰہی کا خود اپنا اقتضا ارادہ کے لئے۔ اور ارادے کا لازم ہونا ذاتِ الٰہی کے لئے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ ارادہ بذاتِ خود وجود واجب نہیں ہے۔ البتہ ذاتِ واجب الوجود کے لئے ارادہ کا ہونا بمنزلہ ایک واجب شئے کے ہے لیکن

یہاں ایک بہت ہی مشکل سوال سامنے آتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کیا ارادے کا تعلق ذاتِ الٰہی کے سوا جو چیزیں ہیں، اُن کو چھوڑ کر محض اُس ذات کی اپنی خصوصیت کے اعتبار سے ہے۔ اور نیز اللہ تعالٰے کی صاحب ارادہ ذات کے لئے اِس ارادے کا واجب ہونا، اس بات کی طرف نہیں لے جاتا کہ یہ ارادہ خود ذات واجب الوجود کے لئے وجوب کا حکم رکھتا ہے۔ یا کیا ذات واجب الوجود کے لئے اس جہت سے ارادے کا واجب ہونا اُسے ذات واجب الوجود کی طرف نہیں لے جاتا۔ جس طرح کہ خود ذاتِ الٰہی کے لئے ارادے کا وجوب اُسے اُس ذات کی طرف لے جاتا ہے۔ الغرض یہ ایک ایسا راز ہے جو اکثر لوگوں کے لئے مخفی رہا ہے +

اس معاملے میں حق بات یہ ہے کہ جو خود اپنی اصل ذات میں اپنی ذات اور اپنے وجود کے واجب ہونے کے وصف سے خالی ہے، وہ ہر اُس کمال سے جو اُس کے واجب ہونے اور اُس کے وجود میں آنے کے بعد اُس سے ظاہر ہوتا ہے، وہ جہاں تک کہ خود اُس کی اپنی ذات کا تعلق ہے، وہ اِس اعتبار سے اُس کمال سے بھی خالی ہوگا۔ چنانچہ اُس کو اس کمال سے وہی آراستہ کرتا ہے جس ذات نے کہ خود اُس کو اپنی طرف سے وجوب کی خلعت بخشی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ذاتِ واجب الوجود سے ارادے کا تعلق ایسا ہی ہے جیسے کہ اُن تاثیر کرنے والی استعدادوں کے بسط و ظہور کا جنہیں "اسماء" کا نام دیا گیا ہے، اور نیز اُن تاثیر کرنے والی استعدادوں

کا جنہیں "اعیان" کہا جاتا ہے، ذاتِ واجب سے تعلق ہے یعنی جس طرح ان "اسماء" اور "اعیان" کے ظہور کے لئے ذاتِ واجب کا اقتضا ہوتا ہے۔ اور ذاتِ واجب کے لئے ان "اسماء" اور "اعیان" کا ہونا لزوم میں سے ہے اسی طرح ذاتِ واجب کے ساتھ ارادے کا تعلق ہے۔ یہ جو دو تاثیر کرنے والی استعدادیں ہیں اُن کے ظہور کی ایک حد مقرر ہے جو خود ذاتِ واجب کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے کہ اس میں نہ زیادتی ہوتی ہے اور نہ کمی۔ اب ہم اس مسئلے کی وضاحت کے لئے ایک مثال دیتے ہیں۔

ایک حساب کرنے والا جب حساب کرتا ہے تو اس کے حساب کرنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ حساب کرنے والے کا ارادہ ایک کے عدد سے متعلق ہوا تو اُس سے ایک کا عدد بنا۔ اور جب ایک کے عدد کو اُس کی نظر نے دو بار دیکھا تو دو کا عدد معرضِ وجود میں آیا۔ اور اسی طرح جب اُس نے ایک کے عدد کو تین بار دیکھا تو تین کا عدد بن گیا۔ غرضیکہ جب حساب کرنے والا کا ارادہ ایک سے دو، دو سے تین، اور اسی طرح تین سے جو اگلا عدد ہے اُس کو اِس سے، اور پھر اُس سے جو اگلا عدد ہے، اُس کو اس سے نکالتا چلا جائے گا تو جہاں تک کہ حساب کرنے والے کے علم کی حد ہوتی ہے اُس حد تک اس ایک عدد سے اکائیاں، دہائیاں، سینکڑے اور ہزار نکلتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ جہاں تک کہ حساب کرنے والے کی عقل فرض کر سکتی ہے۔ وہ ان اعداد کو ایک دوسرے کے ساتھ برابر جمع کرتا ہوا چلا جائے گا، یہاں تک کہ یہ اعداد اپنی اس شکل میں لا نہایت حد تک پہنچ جائیں۔ اب اگر ان تمام اعداد کو اُن کی اصل کی نسبت سے جو ایک کا عدد ہے، اور جس سے

کہ یہ سب اعداد نکلے ہیں، دیکھئے تو یہ سب اعداد ایک کے عدد میں محصور نظر آئیں گے، اور ان اعداد میں آپس میں جو فرقِ مراتب ہے تو وہ اُس ایک عدد کے اعتبار سے نہیں ہوگا، بلکہ جس طرح یہ اعداد درجہ بدرجہ اُس ایک کے عدد سے نکلے ہیں اُن میں فرقِ مراتب اُس لحاظ سے ہوگا۔
اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ اعداد کی ان بے شمار صورتوں کے ظہور کی علت صرف اتنی تھی کہ محاسب کے اندر حساب کرنے کا ایک کمال موجود تھا۔ چنانچہ محاسب نے اپنے اس کمال کو ظہور میں لانے کا ارادہ کیا۔ اور اس طرح یہ اعداد معرضِ وجود میں آتے چلے گئے۔ باقی رہا خود ان اعداد میں جو ترتیب انحصار اور انضباط ہے کہ اس میں نہ کوئی کمی ہو سکتی ہے اور نہ بیشی، تو یہ چیز تو محاسب کے ارادے کی فعلیت سے پہلے ہی ان اعداد کی خود اپنی طبیعت میں موجود تھی، اور محاسب کا ارادہ جب ان اعداد کو اس ترتیب و انضباط سے وجود میں لاتا ہے تو وہ گویا ان اعداد کی جو اپنی طبیعت ہوتی ہے اور انکے ظہور کے جو احکام ہوتے ہیں وہ صرف اُن کو پیش کر دیتا ہے۔

اب جو ہم چیزوں[1] کے بنانے اور ان کے ایجاد کرنے کو ان چیزوں کی "ماہیات" کی طرف منسوب کرتے ہیں تو "ماہیات" کی طرف ہمارا ان چیزوں

---

[1] کوئی شئے عدم سے وجود میں نہیں آتی۔ عدم سے تو عدم ہی برآمد ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اشیائے عالم کس طرح وجود میں آئیں۔ بات یہ ہے کہ ہر شئے قبلِ تخلیق حق تعالیٰ کے علم میں موجود تھی پھر اُس نے ان اشیاء کی خارج میں تخلیق کی۔ یعنی ہر شئے خارجاً مخلوق ہے۔ حق تعالےٰ اُسکے خالق ہیں۔ اور اشیاء کی ذوات قبلِ تخلیق علم الٰہی میں ثابت ہیں۔ وہ معلومات حق ہیں صورِ علمیہ حق ہیں۔ صوفیاء کی اصطلاح میں ان ذواتِ اشیاء کو "اعیانِ ثابتہ" کہتے ہیں۔ اور ان کے دوسرے نام ماہیاتِ اشیاء، اور حقائقِ اشیاء ہیں۔ (مترجم)

کو منسوب کرنا ایسا ہی ہے، جیسے ہم اوپر کی صورت میں اعداد کے عدم سے وجود میں آنے کو محاسب کی تاثیر کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ اور "ماہیات" سے ان چیزوں کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے، ان چیزوں کی ان "ماہیات" اور اُن کے لوازم کو اُس ذاتِ حق سے جس سے کہ ان "ماہیات" کا فیضان ہوتا ہے ایسی ہی نسبت ہے جیسی کہ ان اعداد کے ترتیب وار مدارج کو اُس ایک کے عدد سے ہے، جس سے کہ یہ اعداد نکلے ہیں، اور ایک عدد کا دوسرے عدد پر تقدم اور اُن میں جو فرق مراتب ہے، یہ چیز خود اُن اعداد کی اصل طبیعت میں داخل ہے۔ الغرض جب یہ بات واضح ہو گئی تو اس سے لوگ، جو یہ کہتے ہیں کہ "ماہیات" غیر مجعول ہیں، یعنی یہ بنائی (جعل) نہیں گئیں۔ بلکہ ان کے بنانے اور ایجاد کرنے کا مطلب صرف ان کا ظہور اور فیض مقدس ہے، تمہیں اس بات کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ اب رہا ان "ماہیات" کا ربط و تعلق اُس ذاتِ حق سے جو اُن کی فیضان کرنے والی ہے، تو وہ تعلق ایسا ہی ہے جیسے کہ ایک کے عدد سے بعد میں اُس ایک سے جو اعداد نکلتے ہیں، اُن کا ہوتا ہے۔ اور ان "ماہیات" کے اندر ان "ماہیات" کے جو خواص ہیں، اُن کے تعین کو یوں سمجھئے۔ جیسے کہ اعداد میں اُن کی درجہ بدرجہ مراتب کی خصوصیات ہیں کہ فعلاً وجود میں آنے سے پہلے اُن کا وجود مفروض ہوتا ہے۔ اور "ماہیات" کے ان خواص کا وجود مفروض سے وجودِ فعلی میں آنا عبارت ہوتا ہے اُن کے ظہور اور فیضِ اقدس سے۔

الغرض جس طرح اعداد کا سلسلہ ایک کے عدد سے لے کر لا انتہا ہی جو

تک علی الترتیب چلا گیا ہے۔ اور اعداد کا یہ سلسلے کا سارا لامتناہی سلسلہ اسی ایک کے اندر فرضاً اور تقدیراً موجود ہے نہ کہ فعلاً۔ اسی طرح طبیعت کلیہ کے اندر جو بھی اُس کے ارکان، اور نیز جو بھی جمادات، نباتات اور حیوانات ہیں، اُن سب کا ایک مرتب سلسلہ جس کے خواص اور مراتب معلوم ہیں، موجود ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں طبیعت کلیہ کے انہی حقائق کی زبان سے یہ کہلوایا ہے "وما منا الا لہ مقام معلوم"[1] یعنی ہم میں سے ہر ہر چیز کا ایک معلوم اور متعین مقام ہے۔ اس طبیعت کلیہ سے انواع کا ظہور ہوا اور انواع کا ظہور جیسا بایں تقسیم حصری[2] کا طریقہ ہے اُس کے مطابق ہوا، یعنی ان میں نہ مزید کوئی زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ کمی اور ابد تک کمی اور بیشی کا کوئی امکان نہیں۔ ان انواع سے پھر افراد ظاہر ہوئے اور افراد کے ظاہر ہونے کی صورت یہ ہے کہ فلکی[3] اور ارضی اتصالات انواع پر اثر انداز ہوئے اور اُن کی ایک وضع سبب اور باعث بنی دوسری وضع کے وجود میں آنے کی۔ اور اس طرح ان سے افراد کا سلسلہ غیر متناہی حد تک پھیلتا چلا گیا۔ قصہ مختصر "ماہیت الماہیات" اور "حقیقۃ الحقائق" سے انواع و افراد کا یہ جو سلسلہ لامتناہی حد تک پھیلتا چلا گیا ہے، یہ سب کا سب سلسلہ حقیقۃ الحقائق اور اشیاء کے اصل بسیط میں باعتبار فرض اور امکان کے نہ کہ بلحاظ تعین بالفعل کے موجود تھا،

---

[1] وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَعْلُومٌ وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّونَ

سورۃ الصافات ۱۶۴

[2] تقسیم حصری سے مراد ایسی تقسیم ہے، جس سے آگے کوئی اور تقسیم نہ ہو سکے۔ مترجم

[3] افلاک و کواکب کے اثرات کا عقیدہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ نفوس انسانی کی انفرادی خصوصیات کا سبب فلسفۂ قدیم میں ان اثرات کو مانا گیا ہے۔ مترجم

اس کے بعد حقیقت الحقائق کا خارج سے ربط قائم ہوا۔ چنانچہ خارج میں اس کی صورت آگئی۔ اس خارج کے ساتھ حقیقت الحقائق کا ربط ایسا ہے جیسے کہ ماہیات کی خصوصیات اور اُس کے لوازم کا اپنی ماہیات سے ہوتا ہے۔ اب حقیقۃ الحقائق نے خارج میں جو اپنے ارادے اور اختیار کی تجلی فرمائی تو اس سے طبیعت کلیہ کا صدور عمل میں آیا۔ اور یہ طبیعت کلیہ شخص واحد کی طرح ایک وجود ہے کہ اس سے خود اُس کے ذریعہ اُس کے ارکان و عناصر ظاہر ہوئے۔ اور پھر ارکان و عناصر کے امتزاج سے موالید یعنی جمادات نباتات اور حیوانات کا ظہور ہوا اس طبیعت کلیہ نے جو شخص واحد کی طرح ایک ہے، اپنے رب کا جو یکتا و بے نیاز ہے، خود اپنے خیال میں ادراک کیا۔ تو اُس کے اس طرح ادراک کرنے سے طبیعتِ کلیہ کے اندر اللہ تعالیٰ کی ایک علمی صورت پیدا ہو گئی۔ یہ علمی صورت ایک اعتبار سے محض ایک علمی کیفیت ہے اور ایک اعتبار سے یہ علمی صورت بذاتِ خود "شئے معلوم" ہے۔ اور ایک اعتبار سے یہ فقط علم ہے۔ طبیعت کلیہ کے اندر اس طرح علمی صورت کا قیام یہ اُس کی پہلی تجلی ہے۔ اس کے بعد طبیعت کلیہ کی یہ تجلی مقید و محدود مدارک میں نازل ہوئی۔ اور ان مقید و محدود مدارک نے اُن بارگاہوں کی صورت اختیار کی، جن میں سے ایک بارگاہ "حظیرۃ القدس" ہے۔

لہ حقیقت الحقائق وجود باطن ہے۔ جب اس وجود باطن کا ظہور ہوتا ہے تو وہ خارج ہے۔ (مترجم)

اُنتالیسواں مشاہدہ

انسان کے اخلاق میں سے ایک خُلق "سمتِ صالح" کے نام سے موسوم ہے۔ اور اس کی حقیقت عبارت ہے ایک شخص کے نفسِ ناطقہ میں اپنے اُن اعمال اور اخلاق کے متعلق بیداری سے، جو نفسِ ناطقہ اور اللہ کے یا اُس کے دوسرے لوگوں کے درمیان ہیں۔ اور نیز یہ خُلق عبارت ہے نفسِ ناطقہ کے نظامِ صالح کی طرف ہدایت پانے سے کہ اللہ تعالیٰ اُس کے اس طرح ہدایت پانے سے راضی ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کا بھلا چاہتا ہے تو وہ اس کو اُن اعمال اور اخلاق کی جو اُس بندے کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان ہوتے ہیں، صحیح معرفت عطا فرماتا ہے۔ اور اُسے نظامِ صالح کا راستہ دکھاتا ہے۔ اُس بندے پر اللہ تعالےٰ کی نظرت سے اِس معرفت اور ہدایت کا فیضان اُس بندے کی کسی کاوش اور تردد کا صلہ نہیں ہوتا

بلکہ بارگاہِ رحمت کے اِس فیضان کو ایک برکت سمجھئے جو خُلق سمت جائے کو عطا ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی مطلب ہے قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ کے اس ارشاد کا کہ "ہم نے اُن لوگوں کی طرف اچھے کام کرنے اور نماز قائم کرنے کی وحی کی" اور بندے کے اندر ایجادِ فعل کو جو اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، تو اُس کی یہی صورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد انسان کے اندر اِن اعمال و اخلاق اور صالح نظام کا علم ایجاد کیا جاتا ہے چنانچہ اللہ تعالےٰ کے بندوں میں سے کوئی بندہ بھی جب تک کہ اُس کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے اِن اعمال و اخلاق اور نظام صالح کی ہدایت نہ ملے، مکمل نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس ضمن میں اکثر لوگوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ بارگاہِ رحمت سے بالمشافہ طور پر بغیر کسی واسطے کے اِس ایجادِ فعل اور ایجادِ علم سے مستفید نہیں ہوتے۔ اس لئے اس سلسلہ میں بہتر یہی ہوتا ہے کہ یہ رحمت انسانوں میں سے کسی ایسے کامل کی طرف متوجہ ہو جو اپنی جبلت کے تقاضے سے اس امر کا مستحق ہو کہ ایک انسان پر طبیعت کے جو احکام عائد ہوتے ہیں، وہ ان سے بالاتر ہو جائے۔ اور پھر وہ کامل انسانوں کی جس جماعت میں ہو، اُس ...... کے مزاج سے اور اُس جماعت کے مناسب جو اعمال و اخلاق ہیں، اُن سے اور نیز اُسکی جماعت کے لوگ اپنی حیوانی طبیعتوں سے ترقی کر کے کس طرح قربتِ الٰہی کے اُس درجے تک جو اُن کے لئے مقدر ہو چکا ہے، پہنچ سکتے ہیں۔ اُس طریقے سے، اِس طرح ہم نوا ہو جاتے کہ اُس کامل کا انفرادی وجود

اُس کی جماعت کے اجتماعی وجود میں فنا ہو کر بقا حاصل کرلے۔ اور پھر اِس کامل میں فطرتاً یہ صلاحیت بھی ہو کہ وہ اپنی طبیعت کے مقام پست سے رُوح کے مقامِ قدس کی بلندیوں کی طرف جذب ہوسکے، تاکہ وہاں اُس کا نفس جن اعمال و اخلاق کا ذکر شروع میں ہوچکا ہے اُن کے اور نظامِ صالح کے رنگ میں رنگا جائے۔ اور وہ ان دونو چیزوں پر اُن کی خوب تحقیق کرنے اور اُن کو اچھی طرح جاننے کے بعد اچھی طرح سے حاوی بھی ہوجائے۔ الغرض وہ کامل جس کے اوصاف یہ ہوں، جب اللہ تعالےٰ کی رحمت اس کامل کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو وہ اُسے اپنے ساتھ منضم کرلیتی اور اُس کو اپنے دامن میں ڈھانپ لیتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سرِّ الٰہی جو مطلوب و مقصود ہوتا ہے، وہ اِس کامل کے اندر نقش ہوجاتا ہے۔ اور وہاں پر اِس سرِّ اجمالی کا یہ نقش جس جماعت میں کہ یہ کامل ہوتا ہے، اُس جماعت کے لئے احکام و قوانین کے قالب میں بدل جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کامل سے یہ سرِّ اجمالی تو الگ ہوجاتا ہے، لیکن اُس نے اِس سرِّ اجمالی کا علم اپنے ہاں محفوظ کرلیا ہوتا ہے۔ اب اِس مقام سے گزرنے کے بعد جب یہ کامل سوچ بچار اور غور و تفکر کے مقام میں وارد ہوتا ہے تو جو کچھ پہلے اُس کے علم میں محفوظ ہوچکا ہوتا ہے: وہ اب اس کامل کی زبان پر آجاتا ہے۔ چنانچہ انبیائے کرام پر وحی کے ذریعے جو شریعتیں نازل ہوتی ہیں۔ اور اولیاء پر کشف و الہام کے ذریعہ جن طرقِ تصوّف

کا نزول ہوتا ہے، اُن سب کی حقیقت دراصل یہ ہے ۔

الغرض وہ شخص جو بالمشافہ بارگاہِ رحمت سے مستفید نہیں ہو سکتا اور وہ اس سلسلہ میں واسطے کا محتاج ہوتا ہے، تو یہ کامل جن کے کہ اوصاف اُوپر گزر چکے ہیں، اس شخص کے لئے بارگاہِ رحمت سے استفادہ کرنے کا واسطہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہ شخص اُس کامل کی بات سُنتا ہے۔ اور اُس کے لئے اس کامل کے ارشادات دلیل راہ بنتے ہیں نظامِ صالح تک پہنچنے کے۔ اور اس ضمن میں یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کی فطرت اُس کامل کی طرف بڑھتی ہے۔ اور وہ جہاں تک کہ اُسے توفیقِ الٰہی میسّر ہوتی ہے۔ اور جس حد تک کہ اُس کی فطری استعداد اُس کی سازگاری کرتی ہے، وہ "سمت صالح" کے خُلق اور حکمت اور دانائی کے خُلق کو اخذ کر لیتا ہے۔ اور عوام کے اطوار و اعمال سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ اور اس سے اُس شخص میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ صالح نظام جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ اس نظام کو شخص مذکور اپنی آنکھوں کے سامنے متمثل پاتا ہے۔ اور یہ نظام اُس کے لئے بطور ایک کسوٹی کے بن جاتا ہے کہ وہ شخص اپنے تمام حالات کو اس پر پرکھتا ہے قصہ مختصر اور اس طرح وہ شخص یہ سعادت حاصل کر لیتا ہے۔ اور اُن لوگوں میں سے ہو جاتا ہے جن کو کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا کی گئی ۔

مثال کے طور پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ان کاملوں میں سے تھے۔ چنانچہ آپؓ کی عقل میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ اپنی ذاتی استعداد

کے مطابق جو کچھ بھی حاصل کر سکتی تھی، اُس کو حاصل کرنے کے بعد وہ اُمّت کے احوال اور معاملات کو بھی جانے اور پہچانے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے سیّدنا عمرؓ کی اسی عقلی صلاحیت کی طرف اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے۔ "تم سے پہلے جو اُمّتیں تھیں، اُن میں محدثین ہوتے تھے۔ اس اُمّت میں اگر کوئی محدّث ہے تو وہ عمرؓ ہیں"۔ اور اسی سلسلہ میں آپؐ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے"۔

اب واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے بھی اس علم کا ایک حصّہ عطا کیا۔ اور لوگوں کے لئے قُربِ الٰہی کے جو مشرب اور طریقے ہیں، اللہ تعالےٰ نے مجھے بھی اُن کی حقیقت سمجھائی۔ چنانچہ اس بارگاہ سے مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ انسان جب تک "نورِ طہارت" کو نہ پہچانے۔ اور وہ یہ نہ جان لے کہ آدمی سے یہ نُور کس طرح زائل ہو جاتا ہے۔ اور نیز جب تک اُسے اس بات کا علم نہ ہو، کہ اس نُور کے اور اُس شخص کی جو اپنی طبیعت ہے، اُس کے درمیان کون سے حجاب حائل ہوتے ہیں اور جب انسان پر اُس کی طبیعت کا غلبہ ہوتا ہے، تو اُس غلبے کی کیا صورت ہوتی ہے۔ اور طبیعت کے اِس غلبے کے تدارک کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یعنی جب تک، وہ ان سے باخبر نہ ہو۔ اور پھر جب تک وہ نفس کی اُن ہمتوں کو نہ معلوم کر لے جن کے ذریعے طہارت کے نور کو زائل ہونے کے بعد دوبارہ نفس میں پیدا کیا جا سکتا ہے۔ الغرض جب تک

وہ "نورِ طہارت" کے ضمن میں ان چیزوں سے واقف نہ ہو بلکہ اُس نے
اِن میں سے ایک ایک چیز کا خود تجربہ نہ کیا ہو۔ اور اس اعتبار سے
اُس نے اپنے آپ کا اور اپنے نفس کے اِن نشیب و فراز کا پورا علم حاصل
نہ کر لیا ہو۔ اور اس کے بعد جب تک وہ یہ نہ جانتا ہو کہ سجدے میں
مناجات کرنے سے کیا لذّت حاصل ہوتی ہے۔ اور جب تک اُسے
اس بات کا علم نہ ہو کہ اِس حالت میں روح میں کتنی رقّت اور
جلا پیدا ہو جاتی ہے کہ اِن کی وجہ سے اُس کی رُوح کے اور اللہ کے
درمیان جو حجاب ہوتے ہیں وہ اُٹھ جاتے ہیں۔ اور وہ مناجات میں اللہ
تعالٰے کے اس طرح روبرو ہو جاتا ہے جیسے کہ اُسے سامنے دیکھ رہا ہے۔
اور نیز جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ دل سے اس طرح پردے اُٹھنے
کے بعد پھر دوبارہ کیسے اُس پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اور خشوع و خضوع
کے وہ کون سے کلمات ہیں اور بدن اور نفس کی وہ کون سی ہیئتیں ہیں جنکی
مدد سے پھر اُن پردوں کو دل سے ہٹایا جا سکتا اور گئی ہوئی کیفیت حضوری
کو واپس لایا جا سکتا ہے۔ اور جب تک وہ "یقین" کی نعمت سے بہرہ یاب
نہ ہو جائے۔ اور "یقین" سے میری مراد اللہ کے متعلق پوری جمعیت خاطر
اور اُس پر اعتماد کے ہیں۔ اور نیز جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ "یقین"
کی اس نعمت سے ہی دُنیا اور آخرت کی بھلائی کے لئے بالعجز و الحاح
دُعا کرنا، اور اس حقیقت کی معرفت میں کہ خود اُس کے اپنے اعمال و
اخلاق، اور نیز زمانے کے حوادث و مصائب اُس کے ہاتھ میں نہیں بلکہ

یہ سب کی سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اور وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ یعنی اِس حقیقت کی معرفت میں اُس کے دل میں جو وسوسے پیدا ہوتے ہیں، اُن سے خُدا کی پناہ مانگنا، اور دُنیا اور آخرت کی بھلائی کے لئے جیسے کہ شروع میں ذکر کیا گیا ہے، بعجز و الحاح دُعا کرنا، یہ دونوں کی دونوں باتیں اسی "یقین" کی وجہ سے ہی ظہور میں آتی ہیں۔ یعنی جب تک وہ اس کو نہ جان لے کہ یہ "یقین" ہی ہے جو ہر کام میں جو اُسے پیش آتا ہے۔ اُس کو استخارہ کرنے کی راہ دکھاتا ہے اور گھبراہٹ میں دُعا کو پناہ کا وسیلہ بنانا سکھاتا ہے، اور یہ "یقین" ہی ہے جو علم و معرفت کی لغزشوں میں اضطراری طور پر اُس سے توبہ و استغفار کراتا ہے۔ اور پھر جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے لئے دُنیا اور آخرت میں جو جو نعمت تیار کر رکھی ہے۔ اور جس کا کہ مآل قربِ الٰہی اور جنت ہے، یہ جسم کی سب فانی اور عارضی لذتوں سے بہتر ہے۔ اور اس طرح جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ "طبیعت[1]" کا حجاب کیا ہوتا ہے اور وہ حجاب انسان پر کس طرح غالب آجاتا ہے۔ اور نور طہارت اور اُس سے دل میں جو طمانیت پیدا ہوتی ہے، "طبیعت" کا یہ حجاب اس میں

[1] عرفانِ نفس کو عرفانِ حق کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ ایک شخص کے لئے اس عرفانِ نفس کی راہ میں یہ تین حجاب حائل ہوتے ہیں۔ حجابِ طبیعت، حجابِ رسوم اور حجابِ سوءِ معرفت، طبیعت کے غلط اور فاسد تقاضے حجابِ طبیعت میں شمار ہوتے ہیں اور حجاب رسوم سے مُراد جماعت اور قوم کی بُری رسمیں ہیں۔ اور حجاب سوءِ معرفت علم کی لغزشیں ہیں۔ مترجم

کس طرح گڑبڑ پیدا کرتا ہے۔ اور پھر کس طرح طبیعت کو زیر کر کے اس حجاب کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ اور آخر میں جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ "رسوم" کا حجاب کیا ہے۔ اور "معرفت" کا حجاب کیا ہے۔ اور ان کو کس طرح دُور کرتے ہیں +

الغرض جو شخص اوپر کی اِن چیزوں کو بنفس خود جان لیتا ہے، خواہ اُس کا اِن چیزوں کو یہ جاننا اپنی ذاتی استعداد ہی کے مطابق ہو، وہ شخص اللہ تعالےٰ کا قُرب حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اور یہی وہ شخص ہے جس کے دل میں ایمان کی بشاشت سرایت کئے ہُوئے ہوتی ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ تم اپنے نفس کے خود ہی طبیب بنو۔ اس لئے تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم ان علوم کو جن کا ذکر اُوپر ہُوا ہے پسِ پشت ڈالنے میں احتراز کرو +

چالیسواں مشاہدہ

اللہ تعالیٰ نے مجھے رُوح کی حقیقت سے مطلع فرمایا۔ اور بے شک روح عبارت ہے اُس شے سے کہ جب وہ بدن سے جُدا ہوتی ہے تو انسان مرجاتا ہے۔ اور نیز روح ہی سے انسان میں احساس، حرکت، اور زندگی ہے۔ اب روح کے کئی طبقے اور کئی لطیفے ہیں۔ اور روح کے ان طبقوں اور لطیفوں میں جو چیز بدن شے سب سے زیادہ قریب ہے، وہ "جسم ہوائی" ہے۔ یہ "جسم ہوائی" قلب میں ترکیب پاتا ہے، اور وہاں سے یہ سارے بدن میں پھیل جاتا ہے۔ اور یہی "جسم ہوائی" انسان کی ادراکی اور طبعی قوتوں کا حامل ہے۔

"جسم ہوائی" کے بعد رُوح کا دوسرا طبقہ "حقیقتِ مثالی" ہے۔ اور اس سے مُراد روح کی وہ حقیقت ہے جو عالم ناسوت میں آنے سے پہلے

عالم مثال میں تشکل پذیر تھی - چنانچہ قرآن مجید میں ذریت آدم سے جو
عہد و پیمان لینے کا ذکر ہے .... تو یہ عہد و
پیمان بنی آدم کی ارواح کی ان مثالی حقیقتوں سے ہی لیا گیا تھا - اس
کے بعد روح کا تیسرا طبقہ "حقیقت روحیہ" ہے - اور یہ صورت انسانیہ
کا ایک حصہ ہے - اور قوائے افلاک و عناصر کے جو مشخص عوارض ہیں، وہ
اُس کو اپنے اندر لئے ہوئے ہیں - اور اس کے ..... اپنے خاص احکام
ہیں - اس کے بعد رُوح کا "صورتِ انسانیہ" کا طبقہ ہے - اور روح کا یہ
طبقہ افراد اور اشخاص سے جن میں کہ یہ "صورتِ انسانیہ" مشخص ہوتی
ہے، ایک الگ چیز ہے - اس کے بعد "صورتِ حیوانیہ"، پھر "صورتِ نامیہ"
اور اس کے بعد "صورتِ جسمیہ" ہے - اور پھر طبیعت کلیہ کا ایک حصہ پھر
باطن الوجود کا خارج کی لوح پر منبسط ہوتا ہے - اب جو شخص روح کے ان
طبقات اور لطائف کے پیش نظر یہ کہتا ہے کہ رُوح عبارت ہے ایک جسم
لطیف سے، جو بدن میں اس طرح حلول کئے ہوئے ہے جیسے کہ کوئلے
میں آگ ہوتی ہے - تو بے شک یہ شخص اپنے قول میں سچا ہے - اور اسی
طرح جو شخص اس کا قائل ہے کہ رُوح ایک مجرد حقیقت ہے، تو وہ بھی
سچا ہے - اور جو کہتا ہے کہ روح قدیم ہے تو وہ بھی سچا ہے - اور اسی
طرح جو شخص کہتا ہے کہ رُوح حادث ہے، تو وہ بھی سچا ہے - الغرض
ارشادِ خداوندی کے مطابق "لِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا" ہر گروہ
کی اپنی ایک سمت ہے، جس کی طرف وہ ..... رُخ کرتے ہیں -

لیکن اس ضمن میں یہ بات مخفی نہ رہے کہ ایک ہی تعبیر پر اختصار کرلینا قصورِ ہمت کی دلیل ہے۔

اس مشاہدہ میں یہ تحقیق بھی شامل ہے ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "ہر نبی کو ایک دعا ایسی مرحمت ہوتی ہے، جو ضرور مقبول ہوتی ہے"۔ چنانچہ آپؐ فرماتے ہیں کہ "ہر نبی نے اپنی اپنی دُعا مانگ لی۔ لیکن میں نے اپنی دُعا محفوظ رکھی ہے۔ اور وہ میں قیامت کے دن اپنی اُمت کی شفاعت کے لئے مانگوں گا"۔ اب اگر تم یہ کہو کہ ہر نبی کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایک سے زیادہ مقبول ہونے والی دعائیں عطا ہوئی تھیں۔ اور اسی طرح ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی بہت سی مقبول ہونے والی دعاؤں سے بہرہ یاب ہوئے تھے۔ مثلاً آپ نے بارش کے لئے دُعا کی اور وہ مقبول ہوئی۔ اور اسی طرح اور بہت سے مواقع پر آپؐ نے دُعائیں کیں، اور وہ مقبول ہوئیں۔ اب اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دعا کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور آپ کے اس ارشاد کے سیاق وسباق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی صرف ایک ہی دُعا ہر نبی کو مرحمت ہوتی ہے، یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی دُعا ہے۔ اس کے جواب میں میرا کہنا یہ ہے کہ یہ دعا جس کا ذکر اس حدیث میں آیا ہے، اُن دعاؤں میں سے نہیں جو عام اغراض میں

سے کسی خاص غرض سے خصوصی تعلق رکھنے کی بنا پر اُس کے لئے کی جاتی ہے بلکہ اس دعا کی نوعیت یہ ہے کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے لطف وکرم اور اُن کے ساتھ اپنی رحمت کے پیش نظر کسی رسول کو بھیجتا ہے، تو اس ضمن میں بندوں کی اِن دو حالتوں میں سے ایک حالت ضرور ہوتی ہے۔ یا تو وہ اُس نبی کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور یہ اطاعت اُن کے حق میں اللہ تعالےٰ کی برکتوں کے فیضان کا باعث بنتی ہے۔ اور یا وہ اُس نبی کی نافرمانی کرتے ہیں۔ اور اسی کی وجہ سے اللہ تعالےٰ کا اُن پر جو لطف وکرم ہوتا ہے، وہ ناراضگی اور غضب میں بدل جاتا ہے۔ الغرض بندے نبی کی اطاعت کریں یا اُس کی نافرمانی، بہرحال ان دو حالتوں میں سے کوئی بھی حالت ہو، نبی کو اس سلسلہ میں الہام ہوتا ہے۔ اور اس الہام کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اُس کے دل میں یہ بات ڈال دی جاتی ہے کہ وہ اُن بندوں کے لئے دُعا کرے یا اُن کے لئے بد دعا کرے، اور جس کی طرف حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اور یہ دُعا اللہ تعالےٰ کے اُس لطف وکرم کا نتیجہ ہوتی ہے جو باعث بنا تھا بندوں کی طرف اُس کے رسول بھیجنے کا۔

اب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ مَیں نے اپنی اس ایک دُعا کو قیامت کے لئے باقی رہنے دیا ہے۔ اور وہ مَیں اپنی اُمت کی شفاعت کے لئے مانگوں گا۔ اُس کی صورت یہ ہے کہ ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جان لیا تھا کہ آپ کی بعثت سے اللہ تعالےٰ کے پیش نظر صرف یہ نہیں کہ فقط اس دنیا ہی میں بندوں پر اللہ تعالےٰ

کا لطف و کرم عام ہو۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ آپؐ کی بعثت سے اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ بھی تھا کہ آپ حشر کے دن بندوں کے لئے اللہ تعالےٰ کی عام رحمت کا سبب بنیں۔ چنانچہ ہم اس سے پہلے اس کتاب میں ذکر کر آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں کے لئے قیامت کے دن شہید یعنی شہادت دینے والے ہوں گے۔ اور تمام انسانوں کے لئے اس طرح شہادت دینا آپؐ کی خصوصیات میں سے ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کے دل میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ بات ڈالی گئی کہ وہ دُعا جو ہر نبی کی طرح آپؐ کو بھی عطا ہوئی تھی۔ اور یہ دُعا جیسا کہ ہم ابھی بیان کر آئے ہیں، اللہ تعالےٰ کے اس لطف و کرم کا مظہر تھی، جس کا دُنیا میں نبوت کی شکل میں ظہور ہوتا ہے۔ آپ اس دُعا کو قیامت کے لئے رہنے دیں۔ الغرض یہ ایک راز ہے جس میں تمہیں خوب تدبر کرنا چاہیئے +

اکتالیسواں مشاہدہ

اس مشاہدہ میں یہ تحقیقات بھی شامل ہیں ـــــ میرے دل میں تخلیق و ایجاد کے علوم کا بالعموم اور عالم خیال میں جو تخلیق ہوتی ہے، اُس کے علوم کا بالخصوص فیضان ہُوا۔ اور نیز اِس علم کا فیضان ہوا کہ دو متناقض چیزوں اور دو ضدوں کا اجتماع فی نفس الامر ممکن ہے۔ اور اس اجتماع کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ان دو متناقض چیزوں میں سے ایک چیز ایک مقام میں ہو۔ اور وہاں اُس کے متعلق پورے جزم سے یہ بات طے ہو کہ یہ چیز ایسے ایسے ہے۔ اور اسی طرح دوسری چیز دوسرے مقام میں ہو، اور وہاں اس کے بارے میں پورے جزم سے یہ طے ہو کہ یہ چیز ایسی نہیں ہے۔ الغرض میرے دل پر ان علوم کا فیضان ہُوا۔ چنانچہ ان علوم میں سے جن کا بیان کرنا ممکن ہے، ہم یہاں تمہارے لئے اُن کو

بیان کرتے ہیں +

تخلیق عبارت ہے مختلف اجزاء کو جمع کرنے اور ان جمع شدہ اجزاء کے لئے جو صورت مناسب ہو، اُن پر اس صورت کے فیضان کرنے سے، تاکہ ان اجزاء کے ملنے اور اُن پر اس صورت کے واقعہ ہونے سے ایک چیز وجود میں آجائے۔ تخلیق کسی عناصر یعنی ہوا، پانی، آگ اور مٹی سے ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اِن عناصر کے اجزاء کا اجتماع ہوتا ہے۔ اور پھر اُن پر وہ صورت جو کیفیات، کمیات اور دوسرے اعراض کے اعتبار سے اُن جمع شدہ عناصر کی عنصری صورت کے مناسب ہوتی ہے، نازل ہوتی ہے۔ چنانچہ اس طرح تخلیق کا یہ عمل کبھی انسان کی صورت اختیار کرتا ہے اور کبھی گھوڑے کی اور کبھی کسی اور چیز کی، یہ تخلیق تو عناصر میں ہوئی۔ اور بعض دفعہ یہ تخلیق خیالی صورتوں میں بھی ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ دماغ میں اِدھر اُدھر کے جو پراگندہ خیالات تھے، وہ جمع ہو گئے۔ اور اس کے بعد جب خارج سے دماغ میں کچھ واقعی صورتیں آئیں تو اس ضمن میں یہ خیالات ایک مرکز پر مجتمع ہوئے۔ اور ان پر ایک صورت کا فیضان ہوا جو اِن خیالی صورتوں سے ایک اعتبار سے بلحاظ تجرّد کے، اور ایک اعتبار سے بلحاظ مادے کے ساتھ ملوّث ہونے کے، مناسب اور موزوں تھی +

اس سلسلے میں اس بات کا بھی خیال رہے کہ کسی محل میں کوئی تخلیق ہو، اس میں ایسا نہیں ہوتا کہ اس محل سے خارج کی کوئی چیز اس میں داخل ہو جائے۔ ایسا ہونا محالات میں سے ہے۔ اور عقل کبھی اس کو تسلیم نہیں کرتی۔

ہاں اس ضمن میں ایسا ضرور ہوتا ہے کہ سلسلۂ تخلیق میں نشو و ظہور کا ایک محل سبب بنتا ہے نشو و ظہور کے دوسرے محل کا۔ اور ایک محل ظہور میں ایک چیز جو موجود ہوتی ہے، وہ سبب بنتی ہے دوسرے محل میں اس چیز کے ظہور کا۔ اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ یہ دونوں کی دونوں چیزیں طبیعت کلیہ کے اندر ایک نظم سے موجود ہیں۔ اور نیز نشو و ظہور کے یہ جو تمام منازل اور مقامات ہیں، ان سب میں طبیعت کلیہ ایک ہی طرح جاری و ساری ہے۔ جب یہ بات واضح ہو گئی تو تمہیں چاہیئے کہ اپنی نظر کو ہر چیز سے ہٹا کر تخلیقِ خیالی کا جو عالم ہے، اُس کی طرف ملتفت کرو۔ کیونکہ تعمیر، تخریب، زندہ کرنا، مارنا، اور قُربت کے ذرائع فراہم کرنا یہ سب کی سب چیزیں اسی تخلیق خیالی کے عالم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور یہی وہ عالم ہے جہاں "اللہ[1] کی ہر روز ایک نئی شان ہوتی ہے"

اس ضمن میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ارادۂ الٰہی اس امر کا متقاضی ہُوا کہ وہ اس عالم خیال میں ایک شخص کو پیدا کرے۔ چنانچہ اس تخلیق کیلئے وجۂ تقریب بہم کی گئی۔ اور اس طرح اس شخص کے خیالی اجزاء جمع ہوئے۔ اور اس سلسلہ میں جو عجیب اسرار ہیں، اُن میں سے ایک بزرگیٔ نسب کو وجود میں لانا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ ایک آدمی میں بزرگیٔ نسب کی قبیل کی پہلے کوئی چیز نہ تھی۔ اور بعد میں وہ آدمی اصلاً شریف النسب ہو گیا لیکن

[1] اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَاْنٍ۔
سورۃ الرحمٰن ۲۹

اس حالت میں یہ شخص ایک ہی وقت میں شریف النسب بھی ہوگا، اور شریف النسب نہیں بھی۔ لیکن آخر یہ تضاد کیا؟ بات یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ آدمی اصل میں شریف نہ ہو۔ لیکن اتفاق سے وہ ایسے زمانے میں پیدا ہُوا کہ اُس وقت فلک کی جو حرکات تھیں، اور ستاروں کے آپس میں جو اتصالات تھے، اُن کا تقاضہ یہ تھا کہ اس شخص میں شرافتِ نسب ہو۔ اور میرے خیال میں یہ اُسی وقت ہوتا ہے جب زُحل کا آفتاب اور مشتری سے ایک لحاظ سے امتزاج ہو۔ اور اس امتزاج کی صورت یہ ہوتی ہے کہ زُحل کی حیثیت تو آئینے کی ہو۔ اور آفتاب اور مشتری کا نُور اُس میں منعکس ہو رہا ہو، چنانچہ ایسے وقت میں جو آدمی پیدا ہوتا ہے، وہ ان ستاروں کے اس امتزاج کی وجہ سے نسب کی بزرگی اور شرافت کا حامل بن جاتا ہے۔ باقی ان امور کو تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

غرضیکہ اس پیدا ہونے والے شخص میں زُحل، آفتاب اور مشتری کے اس طرح اتصال ہونے کا اثر ایک صورت کے طور پر اُس کے اندر آجاتا ہے بالکل اُسی طرح جس طرح بچے میں اُس کے والدین کے نقوش اور اُن کے خط و خال آجاتے ہیں۔ اب یہ جو مولود ہوتا ہے، اُس کو ورثے میں بزرگی نسب نہیں ملتی، بلکہ اس ضمن میں یہ ہوتا ہے کہ پہلے تو ملاءِ اعلےٰ میں یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس مولود کو شریف النسب بنایا جائے۔ اور اس کے بعد جیسے جیسے بچے کی تربیت ہوتی ہے، اُسی طرح اس مولود کے شریف النسب بننے کی حقیقت بھی ملاءِ اعلےٰ میں نشو و نما پاتی ہے۔ اور جب یہ حقیقت ملاءِ اعلےٰ

میں نشو و نما پا چکی ہے تو وہاں سے الہامات کے ذریعے یہ حقیقت ملاء سافل میں نازل ہوتی ہے۔ اور ملاء سافل وہ مقام ہے جہاں سے غیر کامل افراد میں جو قوی ہوتے ہیں، اُن کی ہمتیں صادر ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب یہ آدمی اپنی بھرپور جوانی کو پہنچتا ہے اور ستاروں کے اتصال کا وقت آتا ہے جو اس شخص کے لئے بزرگیٔ نسب کے ظہور اور اُس کی عزتِ شان کا متقاضی ہوا تھا تو اُسی وقت یہ سرّ جو ملاء اعلیٰ میں نشو و نما پا چکا تھا، ملاء سافل سے اِس دُنیا میں نازل ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے پاس جو کچھ محفوظ تھا، اُس میں سے یا کتابوں میں سے کوئی ایسی بات ظاہر ہو جاتی ہے جو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہ شخص شریف النسب ہے۔ خواہ یہ بات واقعہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس معاملہ میں دراصل ہوتا یہ ہے کہ اس شخص کے نسب کے متعلق کوئی ایسی بات مشہور ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ اُس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور اُن کا اس امر پر اجتماع ہو جاتا ہے کہ وہ اِس شخص کو شریف النسب مانیں اور اُس کی عزت و تعظیم کریں +

اب اگر یہ آدمی اہلِ صلاح و تقویٰ میں سے ہے تو بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ وہ خواب میں اپنے آپ کو شریف النسب دیکھتا ہے۔ اور اِس سے اُس کو اطمینان ہو جاتا ہے۔ اب اگر کوئی ایسا شخص ہے جو اس آدمی کے متعلق کوئی پہلے کی بات یاد رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ شریف النسب نہیں تو اُس شخص کی بات کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ اور ملاء سافل کی طرف سے بھی

اُس کا انکار ہوتا ہے۔ اور چنانچہ اس آدمی کو ایسا کہنے والے کی حالت یہ ہوتی ہے جیسے کہ کوئی شریف آدمی کو گالی دے اور کہے کہ یہ شریف نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بات کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ واقعہ دراصل یہ ہے کہ یہ جو تمام چیزیں ہیں۔ ان سب کی خارج میں قبیح اور تمثالی صورتیں ہوتی ہیں۔ اور اُنہیں سے اس آدمی کا نفس بزرگیٔ نسب کا رنگ اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح ہر بزرگیٔ نسب جو اس عالم میں ظاہر ہوتی ہے۔ اُس کی بھی اس عالم سے خارج میں ایک تمثالی صورت ہے۔

اور وہ بزرگی اسی صورت کو اپنی سند بناتی ہے۔ یہ صورت کبھی تو دین کے کسی امام اور ہادی کی طرف منسوب ہوتی ہے اور کبھی کسی دُنیاوی بادشاہ کی طرف۔ چنانچہ یہ انتساب جیسا وقت ہوتا ہے، اُسی کے مطابق ہوا کرتا ہے۔ اور اسی بنا پر یہ بات یُوں معلوم ہوتی ہے۔ جیسے کہ پہلے سے چلی آتی ہے، اور ابھی نہیں شروع کی گئی،

کسی آدمی میں بزرگیٔ نسب کو پیدا کرنے کا ذکر تو اوپر گزر چکا۔ اسی پر تم کسی آدمی سے بزرگیٔ نسب کو زائل کرنے کا قیاس کر سکتے ہو۔ اس سلسلہ میں ہوتا یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ ایک شخص کے لئے کچھ ایسے اسباب تقریب بہم کر دیتا ہے کہ اُن کی وجہ سے لوگ بھول جاتے ہیں کہ یہ شخص شریف النسب ہے۔ چنانچہ اس طرح اس شخص کے نفس سے بزرگیٔ نسب کا رنگ مٹ جاتا ہے، اور لوگوں کا اُس کے متعلق اتفاق ہو جاتا ہے کہ یہ شریف النسب نہیں،

اور یہ بات ملاءِ سافل میں بھی لکھ دی جاتی ہے۔ اس کے بعد جو کہے کہ یہ شخص شریف النسب ہے، اُس کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ اور اُس کی اس بات کا اس طرح انکار کر دیا جاتا ہے گویا کہ اُس نے کسی غیر شریف کو شریف کہہ دیا۔

ہم نے اوپر یہ جو کہا تھا کہ ایک ہی آدمی ایک لحاظ سے شریف النسب ہوتا ہے، اور دوسرے لحاظ سے غیر شریف النسب، تو ہمارا یہ کہنا اجتماعِ نقیضین کی قبیل سے نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شخص کا ایسا ہونا حقیقت میں وجۂ تناقض نہیں ہے۔ کیونکہ اس معاملے میں دو اعتبارات ہوتے ہیں، چنانچہ ایک اعتبار سے یہی شخص غیر شریف ہوتا ہے۔ اب اگر اس معاملہ کو جملہ اعتبارات سے دیکھا جائے تو اس شخص کے بارے میں یہ جو دو بیان ہیں، ان میں پوری مطابقت ہو گی اور تناقض باقی نہیں رہیگا۔ اس ضمن میں ایک ظالم خلیفہ کی خلافت کی مثال لیجیئے۔ اس کی خلافت کو ایک اعتبار سے دیکھیئے تو وہ صحیح ہو گی۔ اور دوسرے اعتبار سے دیکھیئے تو صحیح نہیں ہو گی۔ اور اسی سلسلہ میں قیامت کے قرب میں زمانے کی مدت کا مختصر ہونا بھی ہے، یعنی اُس وقت سال مہینے کے برابر ہو جائے گا اور مہینہ ہفتے کے برابر اور ہفتہ ایک دن کے برابر۔ اور وہ اس طرح کہ فنا و عدم کی صورت جو ملاءِ اعلیٰ میں انعقاد پذیر ہے، وہاں سے اُس کے ایک رنگ کا اِس عالمِ ناسوت میں فیضان ہو گا۔ اور اُس کی وجہ سے لوگوں کو یُوں خیال پڑے گا کہ زمانے میں وسعت ہے، حالانکہ وہاں وسعت

نہیں ہوگی۔ اور وقت کو جانچنے کے جو معیار ہونگے اُن میں خلل واقع ہوجائیگا چنانچہ حالت یہ ہوگی کہ انسان پہلے ایک دن میں جو کام کر سکتا تھا، وہ اب اُس کام کو ایک دن میں نہیں کر سکے گا۔ اور اس تبدیلی کا باعث فنا و عدم کی اُس صورت کی تاثیر ہوگی جو ملاء اعلیٰ میں قائم ہے۔ اور وہاں سے اُس کا فیضان عالمِ ناسوت میں ہوتا ہے۔ ملاء اعلیٰ کی اس صورت کی تاثیر کو یوں سمجھئے کہ دو دیواریں ہیں۔ اور اُن کے اوپر ایک تختہ رکھا ہوا ہے، اور ایک آدمی اُس پر سے گزرنا چاہتا ہے۔ اب اُس آدمی کی وہمی قوت اُس پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ چنانچہ اس تختے پر گزرتے ہوئے اُس کے پاؤں پھسل جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہی تختہ زمین پر پڑا ہوتا تو یہ آدمی بغیر کسی خیال کے اُس پر سے اطمینان کے ساتھ گزر جاتا۔ یعنی اُس آدمی کا یہ وہم کہ وہ ایک ایسے تختے پر سے گزر رہا ہے جو خلا میں ہے اور دو دیواروں پر پڑا ہوا ہے یہ وہم اُس پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ چنانچہ اُس کے پاؤں اس تختے سے پھسل جاتے ہیں۔ الغرض ملاء اعلےٰ میں فنا و عدم کی جو صورت ہے، عالمِ ناسوت میں اُس کے فیضان کی تاثیر انسان کی اِس قوت وہمی کی تاثیر کی طرح ہوتی ہے۔ اجتماع نقیضین کی اَور بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ لیکن اس وقت ہم اُن پر گفتگو نہیں کرتے۔ باقی اللہ تعالےٰ اِن اُمور کو بہتر جانتا ہے۔

بیالیسواں مشاہدہ

مجھ پر مبدائے حیات اور اُس کے معاد کے اسرار کھولے گئے۔ معاد کے اسرار میں سے ایک سرّ دوزخیوں کو گندھک کے کرُتے اور اہل جنّت کو ریشم و حریر اور دُوسرے لباس ہائے فاخرہ پہنانے کے متعلق تھا۔ اور اسی طرح کا ایک سرّ دوزخ والوں کے چہروں کے سیاہ ہونے اور اہلِ جنّت کے چہروں کی بشاشت و تازگی، اور اس سے ملتی جُلتی جو اور چیزیں ہیں، اُن کے بارے میں تھا۔ اس سرّ کی وضاحت موقوف ہے دو مقدموں پر۔ ان میں سے پہلا مقدمہ یہ ہے کہ انسان کے نفس اور اُس کے بدن کے درمیان ایک گہرا ربط ہوتا ہے۔ اور نفس سے یہاں مُراد وہ چیز ہے جو انسان میں احساس اور حرکت کا باعث بنتی ہے اور اُس کے خارج ہونے سے انسان مرجاتا ہے۔ نفس اور بدن کا یہ گہرا ربط

اُن افرادِ انسانی میں خاص طور پر نمایاں ہوتا ہے، جن کی عقل و فہم اس بات کو آسانی سے سمجھ جاتی ہے کہ روح بدن ہی کا ایک وصف ہے، اور زندگی عبارت ہے اس رُوح سے۔ اور یہ روح بدن میں اس طرح سرایت کئے ہوتی ہے جیسے کہ کوئلے میں آگ ہو۔ رُوح اور بدن کے آپس کے اس گہرے ربط کا نتیجہ ہے کہ انسان خواب میں اپنے نفس کے اوصاف کو جو غیر مادی ہوتے ہیں، مادی صورت میں متمثل دیکھتا ہے +

اس سلسلہ کا دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک معنوی حقیقت عالمِ ناسوت میں ایک چیز کی صورت میں متمثل ہو جاتی ہے اور اس معنوی حقیقت کا عالمِ ناسوت میں متمثل ہونا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کہ یہ عالمِ خیال میں صورت پذیر ہو جائے۔ اور اس کی مثال سیدنا داؤد علیہ السلام کا وہ واقعہ ہے کہ آپ نے ایک شخص کے ساتھ اُس کی بیوی کے معاملہ میں زیادتی کی۔ اس کے بعد یہ ہُوا کہ اس واقعہ کی معنوی حقیقت عالمِ ناسوت میں دو فرشتوں کی صورت میں متمثل ہوئی۔ اور دو بکریوں کا جھگڑا لے کر حضرت داؤد کے پاس آئے۔ اور اس سے حضرت داؤد کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا +

یہ دو مقدمے بطور تمہید کے بیان ہو چکے۔ اب ہم اصل بحث پر آتے ہیں، دوزخیوں کے جہنم میں گندھک کے کپڑے پہننے اور وہاں اُن کے چہروں کے سیاہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ دُنیا میں ان لوگوں نے کفر کیا۔ اور اس کُفر کا رنگ اُن کے چہروں پر چڑھ گیا۔ اور اسی کی وجہ سے

وہ اللہ تعالےٰ کی لعنت کے مستوجب ہُوئے۔ چنانچہ اُن کا دُنیا میں یہی کُفراُن کے لئے دوزخ میں گندھک کے کپڑوں اور چہروں کی سیاہی میں بدل جائے گا۔ اسی طرح جنت میں اہلِ جنّت کا ریشم و حریر کے لباسوں میں ملبوس ہونے اور اُن کے چہروں پر بشاشت و تازگی چھا جانے کا باعث یہ ہے کہ یہ لوگ دُنیا میں ایمان لائے اور اُن کے ایمان کا رنگ اُن کے نفوس پر چڑھ گیا۔ اور اس کی وجہ سے یا اللہ تعالیٰ کی عنایت کے اہل بنے چنانچہ مرنے کے بعد اُن کے ایمان کا یہی رنگ جنّت میں اُن کے لئے ریشم کے کپڑوں اور چہروں کی تر و تازگی اور بشاشت میں بدل جائے گا۔ یاد رہے کہ یہ جو کچھ مَیں یہاں بیان کر رہا ہوں، اِس کا مشاہدہ خود مَیں نے ایک رُوحانی خواب میں کیا ہے +

یہ تو موت کے بعد یعنی معاد کے اسرار کا ذکر ہُوا۔ اب ابتدا سے حیات یعنی مبدا کے اسرار کا بیان سُنیئے۔ مَیں نے اس پھیلے ہوئے وجود کو دو جہت سے ذاتِ حق میں گُم پایا۔ ذاتِ حق میں اِس کے گُم ہونے کی ایک جہت تو یہ ہے کہ یہ وجود چونکہ خود ذاتِ الٰہی سے برابر صادر ہو رہا ہے۔ اِس لئے مَیں نے اِسے ذاتِ حق میں گُم ہوتے ہُوئے پایا۔ اور ذاتِ حق میں اِس کے گُم ہونے کی دوسری جہت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تجلّی اس وجود میں ظاہر ہوئی۔ اور اُس نے ہر طرف سے اِس وجود کو اپنے اندر لے لیا۔ چنانچہ اس طرح یہ وجود ذاتِ حق میں مجھے گُم ہوتا ہُوا نظر آیا۔ اب جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ وجود منبسط خود ذاتِ حق ہے، ظاہر ہے

یہ اُس کی فریب زدگی ہے۔ لیکن جو شخص کہ باریک بین نظر رکھتا ہے، وہ تو یقینی طور پر اِس معاملہ میں اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ ذاتِ واجب سے[1] شیون الٰہی کا صدور ہوا جو کہ مبدائے اوّل بین تعین۔ اور اُن سے اس وجودِ منبسط کا ظہور ہوا۔ اور یہی وجودِ منبسط "فعلیت" اور "خارج" ہے۔ اِس کے بعد اسی "خارج" میں اللہ تعالیٰ کی ایک "شان" کے بعد دوسری "شان" ایک مقدر شدہ ترتیب کے مطابق جو مبدائے اوّل میں پہلے سے محفوظ ہو چکی تھی، ظاہر ہوتی گئی۔

---

[1] ذاتِ واجب کا کُنہہ پانا تو انسانی عقل کے بس کی چیز نہیں۔ لیکن چونکہ ذاتِ واجب لاتعداد اسماء وصفات کی مرکز ہے، اس لئے ہم ان کے متعلق اپنی عقلیں لڑا سکتے ہیں۔ یہ اسماء وصفات ذاتِ واجب کے اعتبارات ہیں۔ اور ان سب کا ایک ہی ذات سے صدور ہو رہا ہے۔ اور وہ ذات اپنی جگہ جُوں کی تُوں قائم ہے۔ ذاتِ واجب کے اسماء وصفات کا ایک نام "شیون" ہے، جس کی واحد "شان" ہے۔ (مترجم)

تینتالیسواں مشاہدہ

اولیاء اللہ سے کرامات کس طرح ظاہر ہوتی ہیں، اس بارے میں مجھ پر عجیب عجیب اسرار کا فیضان ہوا ہے۔ کرامات کے متعلق تمہیں جاننا چاہیے کہ یہ نتیجہ ہوتی ہیں انسان کی اس قوت کا جو نفسِ ناطقہ میں ہے۔ چنانچہ جب انسان کے نفسِ ناطقہ کا ملاءِ اعلےٰ سے اتصال ہوتا ہے۔ اور اس کی ہمت شخصِ اکبر کی قوتِ عزم سے ملحق ہو جاتی ہے تو اس کے نفسِ ناطقہ کی یہ ہمت شخصِ اکبر کی قوتِ عزم کے لئے بمنزلہ اس کی رضامندی اور پسندیدگی کے بن جاتی ہے۔ اور اس طرح جو بات ہونے والی ہوتی ہے، وہ اولیاء کے لئے ایک حتمی عزم کی صورت اختیار کر لیتی ہے +

اس معاملہ میں دو حدیں ہوتی ہیں۔ ایک حد شخصِ اکبر کی قوتِ

عزم کے ادنیٰ حصے استحسان اور خفیف سے القائے خیال سے متصل ہوتی ہے۔ اور دوسری حد وہ ہے جس میں نفس ناطقہ کی ہمت قوی خود نفس ناطقہ کی اصل جڑ سے اُبھرتی ہے۔ اور وہ نفس کے اوپر اس طرح حاوی ہوجاتی ہے کہ اکثر اوقات نفس کا اس ہمت سے برابر اتصال رہتا ہے۔ الغرض یہ دو حدیں ہیں اور ان کے درمیان بہت سے مدارج ہیں۔ اور نیز اس سلسلہ میں مختلف اوقات، احوال اور اسباب کی بھی اپنی اپنی خصوصیتیں ہوتی ہیں +

اس کے علاوہ خود اولیاء کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہ اولیاء ہیں کہ اُن کے نفس ناطقہ کی ہمت اُن کے سامنے متمثل ہوتی ہے۔ اور اُن سے جو بھی آثار و کرامات ظاہر ہوتے ہیں وہ ان کو خود اپنی اس ہمت سے صادر ہوتے دیکھتے ہیں۔ اور ان اولیاء کی دوسری قسم وہ ہے۔ جن کی ہمت اُن کے سامنے متمثل نہیں ہوتی بلکہ یہ خاطر میں یا خیال میں یا لفظ میں سما جاتی ہے۔ اور اس طرح اُن کے لئے اپنے نفس ناطقہ کی یہ ہمت قابلِ توجہ نہیں رہتی۔ اور اس وجہ سے اُن کو اتنی فرصت مل جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی اُس تدبیر کی طرف جو اس عالم میں بسر کار ہے، اور اس کی اُس رحمت کی جانب جس کا یہاں فیضان ہو رہا ہے متوجہ ہوسکیں۔ چنانچہ اُن کی اس توجہ سے آثار و کرامات کا ظہور ہوتا ہے
ان اولیا کی پہلی قسم یعنی جن کی کہ ہمت اُن کے سامنے متمثل ہوتی ہے وہ زیادہ تر ہندوستان، خراسان اور اُن کے پڑوسی ملکوں میں پائے جاتے

ہیں۔ اور دوسری قسم کے اولیاء یعنی جن کی ہمت اُن کے سامنے متمثّل نہیں ہوتی، وہ حجاز، یمن اور اُن کے قرب و جوار کے ملکوں میں ملتے ہیں۔

مزید برآں اولیاء کے اپنے اوقات ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض دفعہ اُن پر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ اُس وقت وہ جس مقصد کے حصول کے لئے خاص ارادہ کرلیں وہ پُورا ہو کر رہتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس ارادہ میں خود اُن کے اپنے دل کا یہ خیال مزاحم نہ ہو کہ یہ چیز بعید از قیاس ہے۔ یا یہ اللہ کی سنّت کے خلاف ہے۔ کیونکہ بات یہ ہے کہ جب دل میں یہ خیال آگیا کہ یہ چیز بعید از قیاس اور اللہ کی سنّت کے خلاف ہے تو لازمی طور پر اس سے ارادہ میں تذبذب پیدا ہو جائے گا، بالکل ایسے ہی جیسے کہ حیا اور ندامت کے وقت آدمی خود بخود کام سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابو رافعؓ صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بکری کے دو بازو پیش کئے۔ آپؐ نے اُن سے تیسری بار ایک اَور بازو طلب فرمایا۔ تو حضرت ابو رافعؓ کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! بکری کے تو دو ہی بازو ہوتے ہیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم خاموش رہتے، اور یہ بات نہ کہتے تو ہمیں ایک اَور بازو بھی مل جاتا، بلکہ جب تک تم خاموش رہتے، اور ہم تم سے بازو کا مطالبہ کرتے جاتے تو اسی بکری سے ایک بازو کے بعد دوسرا بازو برابر ملتا جاتا۔ اس حدیث میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

نیز اولیاء کے اوقات میں سے ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ اُس وقت وہ

جو ارادہ کرلیں۔ اور اگر اُس ارادے کی مخالفت ہو، یا اُسے دُور کی چیز سمجھا جائے یا لوگ اُس کا انکار کریں تو اس سے اُن کے اس ارادے میں ا[illegible] قوت پیدا ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ تم دیکھتے ہو کہ ایک دوسرے [illegible] بازی سے جلنے یا بہادروں میں نبرد آزمائی کرنے یا حریفوں میں مقابلے [illegible] موقعہ پر ارادے میں مزید قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں دلی رجحا[illegible] اور باطنی تقاضوں کے اعتبار سے بھی اولیاء کے دو طبقے ہیں۔ ان میں ایک طبقہ تو وہ ہے، جس کے دل میں جو ارادے اور رجحانات اُٹھتے ہیں وہ نتیجہ ہوتے ہیں اُس الہام کا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے دلو[ں] کیا جاتا ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دُنیا میں نظامِ خیر کو ق[ائم] کرنے کے متعلق اللہ تعالےٰ کا جو ارادہ ہوتا ہے، اس ضمن میں اس [illegible] کے اولیاء کی ہمتوں میں ولولے اور حوصلے پیدا کر دیئے جاتے ہیں۔ اب یہ بات کسی ایسے وقتی حادثے کے متعلق ہوتی ہے کہ اُس حادثے کے اسبا[ب] معین ہوتے ہیں۔ جیسے کہ قرآن مجید میں حضرت خضر کا قصہ ہے کہ انہ[وں] نے ایک کشتی میں سوراخ کر دیا۔ ایک گرنے والی دیوار کو نئے سرے سے [بنا] دیا، اور ایک لڑکے کو جان سے مار ڈالا۔ یا اللہ تعالےٰ کا یہ ارادہ کسی [ایسے] واقعہ کے متعلق ہوتا ہے جس کا کہ اثر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہتا ہے، [جیسے] کہ ایک گمراہ اور بے بصیرت قوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی [بعثت] کے ذریعہ راہِ راست پر لانے کا ارادہ تھا۔ اب چونکہ یہ ارادہ ایک استمرا[ری] حیثیت رکھتا تھا، اس لئے اِس ارادہ کا کوئی نہ کوئی سلسلہ برابر [illegible]

کے قلب مقدس سے متصل رہا۔ اس لئے یہ ارادہ ایک فوری حادثے کے ظہور کا سبب بن کر ختم نہیں ہو گیا، بلکہ جیسا جیسا وقت اور جیسا جیسا موقعہ ہُوا، اُسی کے مطابق خاص خاص کام اور جُزدی اور تفصیلی اطوار و اوضاع ظاہر ہوتے رہے۔ یہ خصوصیت اولیاء کے اعلیٰ طبقے کی ہے جو کمال مطلق کا حامل ہوتا ہے۔ ان اولیاء کے ہاں کرامات، اِشراف یعنی لوگوں کے دلی خیالات پر مطلع ہونا، دعا کی قبولیت، کھانے یا پانی کی مقدار کو زیادہ کر دینا یا جیسے جیسے کہ حالات اور اسباب ہوں، اُنہیں کے مطابق شکلیں اختیار کرتی ہیں +

الغرض لوگوں کو راہِ راست پر لانے کا ارادہ جس طرح استمراری طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب سے متصل ہے، اسی پر آپؐ کے سرچشمۂ علم کو بھی قیاس کر لو۔ بات دراصل یہ ہے کہ ملاءِ اعلیٰ میں اللہ تعالیٰ کے قانون اور نوامیس کا ایک نمونہ قائم ہے۔ جب اہلِ زمین کے لئے خیر و فلاح کے ارادے کو حرکت ہوئی تو ملاءِ اعلیٰ کے اِس نمونے سے علم کا سرچشمہ پھُوٹا۔ اور یہ مستقل طور پر آپؐ کے قلبِ مقدس سے متصل ہو گیا۔ لیکن جیسے جیسے اوقات، مواقع اور نفسی کیفیات ہوتی ہیں، اُنہیں کے مطابق یہ علم مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ کبھی تو اِس ضمن میں دل میں کوئی بات ڈال دی جاتی ہے۔ اور کبھی علم کا یہ فیضان فرشتے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور بعض دفعہ خواب میں برکت کا نزول ہوتا نظر آتا ہے اور کبھی اس کی حد محض خواب تک رہ جاتی ہے +

بیشک اولیا میں سے ایک طبقہ ایسا بھی ہے کہ اُن کی کرامات کا باعث ملاءِ اعلےٰ کا یہ فیضان نہیں ہوتا بلکہ ملاءِ سافل کی طرف سے اُن کو یہ چیز حاصل ہوتی ہے۔ بیشک یہ مقام کاملین کا نہیں، ہاں یہ اَور بات ہے کہ ایک کامل میں جامعیت ہو۔ اور اس کی وجہ سے ملاءِ اعلیٰ کے اس فیضان کے ساتھ ساتھ اُسکے اندر ملاءِ سافل کے تقاضوں کا بھی عمل دخل ہو۔ چنانچہ صوفیائے کے اس مشہور قول میں کہ "عارف کی اپنی کوئی ہمت نہیں ہوتی"۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ الغرض جب کوئی ولی اپنی قوتِ عزم میں اس منزل پر پہنچ جاتا ہے تو شخص اکبر کی طرف سے اُس کے سویدائے قلب کو خلعتِ قطبیت سے سرفراز کیا جاتا ہے اور یہ شخص لوگوں کے لئے ملجا و ماویٰ اور اُن کے بکھرے ہوؤں کو سمیٹنے والا بن جاتا ہے لیکن میرے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ ان اوصاف کا حامل ایک وقت میں صرف ایک فرد ہی ہو۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس منزل کمال تک دو تین یا اس سے زیادہ بھی پہنچ جائیں۔ لیکن ہر شخص جو اس بارگاہِ کمال تک پہنچتا ہے، وہ اس مقام پر اپنے رب کو یوں دیکھتا ہے جیسے کہ وہ یہاں اکیلا ہی ہے۔ اِس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ افرادِ انسانی میں سے ایک فرد ہوتا ہے۔ اور جہاں تک خود اُس کی اپنی ذات کا تعلق ہے، وہ اپنے آپ کو بلا مزاحمت غیرے اکیلا اور تن تنہا سمجھتا ہے۔ خواہ ہزاروں اُس جیسے اَور بھی موجود ہوں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اِس کمال کا جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے، صرف ایک ہی کامل حامل ہو سکتا

ہمارا موضوع بحث نہیں یا وہ اس تخصیص میں راہ راست سے ہٹ گیا ہو، اور اُس نے ہمارے اس بیان کو اس کے سوا کسی اور محمل پر حمل کر دیا ہو۔ الغرض میں اللہ تعالےٰ کے احسانات کا ثنا خواں ہوں کہ اُس نے مجھے ان سب مقامات کمال کی شراب معرفت کے جن کا میں اُوپر ذکر کر آیا ہوں، چھلکتے ہُوئے جام پلائے ٭

چوالیسواں مشاہدہ

مَیں نے خواب میں دیکھا کہ میں "قائم الزماں" ہوں۔ قائم الزماں سے میری مُراد یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جب اِس دُنیا میں نظامِ خیر کو قائم کرنے کا ارادہ فرمایا تو اُس نے اپنے اِس ارادے کی تکمیل کے لئے مجھے بطور ایک ذریعہ کار کے مقرر کیا۔ چنانچہ مَیں نے دیکھا کہ کُفار کا بادشاہ مسلمانوں کے شہر پر قابض ہو گیا اور اُس نے اُن کے مال و متاع لُوٹ لئے۔ اور اُن کی اولاد کو اپنا غلام بنا لیا۔ اور اجمیر کے شہر میں کفر کے شعائر اور رسوم کو سربلند کیا، اور خُدا کی پناہ، اُس نے وہاں سے اسلام کے شعائر و رسوم کو مٹا دیا۔ اس پر اللہ تعالےٰ کو زمین والوں پر غضب آیا۔ اور مَیں نے اللہ کے اس غضب کو ملاءِ اعلےٰ میں ایک مثالی صورت میں متمثل دیکھا۔ غضبِ الٰہی کی اس مثالی صُورت سے میرے اندر بھی غضب کا اثر مترشح ہو گیا۔ چنانچہ

مَیں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ غصّے سے بھرا ہُوا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا اُس وقت غصّے میں آنا نتیجہ تھا اُس تاثیر کا جو ملاءِ اعلیٰ کی مثالی صورت سے مجھ میں آئی تھی نہ کہ میرے اس غصّے کا باعث دُنیا کے اسباب میں سے کوئی سبب ہُوا۔ اِسی دوران میں مَیں نے دیکھا کہ میں لوگوں کی ایک بڑی بھیڑ میں ہوں، جس میں کہ رومی بھی ہیں، اُزبک بھی، اور عرب بھی، ان میں سے بعض تو اونٹوں پر سوار ہیں اور بعض گھوڑوں پر، اور بعض پیدل ہیں۔ اس بھیڑ کی مناسب ترین مثال اگر کوئی ہوسکتی ہے تو وہ حج کے موقعہ پر میدان عرفات میں حاجیوں کے جمع ہونے کی ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ سب کے سب میرے غضب ناک ہونے کی وجہ سے غصّے میں بھرے ہُوئے ہیں اور مجھ سے پُوچھ رہے ہیں کہ اس وقت اللہ کا کیا حکم ہے؟ مَیں نے اُن سے کہا کہ ہر نظام کو توڑنا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ کب تک؟ مَیں نے جواب دیا کہ جب تک تم یہ نہ دیکھ لو کہ میرا غصّہ فرو ہو گیا ہے۔ میرا یہ کہنا تھا کہ وہ آپس میں لڑنے لگے۔ اور اُنھوں نے اونٹوں کے موہنوں پر دار کرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ اُن میں سے بہُت سے تو وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اور اُن کے اونٹوں کے بھی سر ٹوٹے اور ہونٹ کٹے۔ پھر مَیں اُس شہر کی طرف بڑھا جو خراب کیا گیا تھا۔ اور اُس کے رہنے والوں کو قتل کیا گیا تھا۔ یہ لوگ بھی میرے پیچھے پیچھے چلے۔ اور ہم نے بھی اُسی طرح ایک شہر کے بعد دوسرے شہر کو تباہ کیا، جیسے کہ کفار نے کیا تھا ۔۔۔ یہاں تک کہ ہم ۔۔۔ پہنچے اور وہاں ہم نے کفار کو قتل کیا۔

اور ان سے اس شہر کو آزاد کرایا۔ اور کفّار کے بادشاہ کو قید کرلیا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی جمعیت میں کافروں کا بادشاہ، بادشاہِ اسلام کے ساتھ ساتھ جارہا ہے۔ اسی اثنا میں بادشاہِ اسلام نے کفّار کے بادشاہ کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ لوگوں نے اُسے پکڑا اور نیچے گرا کر اُسے چھری سے ذبح کردیا۔ جب مَیں نے اُس کی رگوں سے خون کو خوب زور سے بہتے دیکھا تو مَیں پکار اُٹھا کہ اب رحمت نازل ہوئی ہے مَیں نے اُس وقت دیکھا کہ رحمت اور سکینت نے اُن سب مسلمانوں کو جو اِس لڑائی میں شریک ہوئے، اپنے دامن میں لے لیا۔ اور اُن پر رحمت کا فیضان ہُوا ہے۔ اس کے بعد مَیں نے دیکھا کہ ایک شخص اُٹھا۔ اُس نے مجھ سے اُن مسلمانوں کے متعلق پوچھا جو باہم ایک دوسرے سے لڑتے تھے۔ مَیں نے اِس شخص کو جواب دینے میں توقف کیا۔ اور اس بارے میں کوئی واضح بات نہ کہی +

یہ خواب مَیں نے ذی قعدہ کی اکیسویں رات کو ۱۱۴۴ھ میں دیکھا۔

پینتالیسواں مشاہدہ

اس امر میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں کہ حقیقت الحقائق ایک وحدت ہے جس میں کہ کثرت کا گزر نہیں۔ اس وحدت کے لیے تنزّلات ضروری ہیں تاکہ یہ تنزّلات واسطہ بنیں اس وحدت سے کثرت کے ظہور کا۔ اور اس طرح وجود کے مراتب کے احکام اور اُن کی خصوصیات کا تعین ہو سکے۔ حقیقت الحقائق کی اپنی وحدتِ خالص سے تنزّلات کی طرف اور تنزّلات سے وجود کے مراتب کی طرف حرکت "تدریجی" ہوتی ہے۔ اور اس حرکت سے سوائے اس کے اور کچھ مقصود نہیں ہوتا کہ اُس وحدتِ خالص کا جو ذاتی کمال ہے، اُس کا ظہور ہو سکے۔ وحدت کی یہ حرکت جو وجود کی کثرت میں منتج ہوتی ہے، اس کا باعث پاک اور مقدس محبت ہے۔ اور یہ پاک اور مقدس محبت وحدت کے اُس "ارادۂ اختیاری" سے جس کو بعض

لوگ اس حرکت کا سبب قرار دیتے ہیں، اعلیٰ اور برتر چیز ہے۔ اور اسی طرح یہ پاک اور مقدس محبّت وحدت کی "ایجابِ طبعی" کی صفت سے بھی جو بعض دوسروں کے نزدیک وحدت کی اس حرکت کا باعث ہے، برتر و اعلیٰ ہے۔ "ایجابِ طبعی" سے مُراد یہ ہے کہ خود اس وحدت کی طبیعت میں بطور ایک امرِ واجب کے یہ بات داخل ہے کہ وہ کثرت میں ظاہر ہو +

یہ محبّت ابتدا میں بالکل بسیط ہوتی ہے۔ لیکن بعد میں جیسے جیسے کثرت کا ظہور ہوتا ہے، اس محبّت کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ مراتبِ وجود میں سے ہر ہر مرتبہ کی اپنی اپنی مخصوص محبّت ہوتی ہے۔ اور ہر مرتبے کی یہی مخصوص محبّت ہی سبب بنتی ہے اُس مرتبۂ وجود کے ظہور کا۔ یعنی یہ محبت ابتدا میں بسیط ہوتی ہے۔ اور پھر وجود کی کثرت کے ساتھ ساتھ اس سے بہت سی محبتیں ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں یاد رہے کہ گو یہ محبّت ابتدائے امر میں بسیط ہوتی ہے۔ اور بعد میں اس سے بہت سی محبتیں ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن یہ محبت اُس بسیط ہونے کی حالت میں بھی اُن تمام محبّتوں سے جو بعد میں اُس سے ظاہر ہوتی ہیں، خالی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ تمام محبتیں اُس بسیط محبّت میں جو ابتدائے امر میں تھی، داخل ہوتی ہیں۔ اور بعد میں مراتبِ وجود کے ساتھ ساتھ ان کا ظہور ہوتا ہے۔ وحدت سے مراتبِ وجود کا اس طرح صادر ہونا۔ اور پھر وجود کے ہر مرتبہ کی اپنی مخصوص محبّت اور ان مخصوص محبّتوں کا ایک بسیط محبّت

سے ظاہر ہوتا۔ یہ ایسے اصول ہیں کہ جس شخص کو ذرا سی بھی سمجھ ہو، وہ اِن میں شک نہیں کرے گا ؛

اِس ضمن میں ہمارا اَور بھی مشاہدہ ہے۔ ہم نے دیکھا کہ بسیط محبّت کے اندر اِن جزوی محبّتوں کے تمام مراتب کا مندرج ہونا ایک طرح پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اِن جزوی محبّتوں میں سے ایک خاص محبّت ظاہر و واضح اور موجود بالفعل کے درجہ کی ہوتی ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک جزوی محبّت اَور ہے، جو بسیط محبّت میں اس طرح موجود ہوتی ہے جیسے کوئی چیز کسی دوسری چیز میں بالقوۃ موجود ہو۔ خواہ اُس کا اُس چیز میں بالقوۃ ہونا قریبی ہو یا دُور کا معاملہ ہو۔ اس ظاہر و واضح محبّت میں سے ایک محبّت وُہ ہے جس کا تعلق اولاً تو مظہرِ کلّی کے ظہور سے ہے اور پھر ذات سے۔ وجودِ کلّی سے آگے چل کر جو افراد نکلتے ہیں یہاں اُن افراد کا ذکر نہیں۔ البتہ بعد میں جب وجودِ کلّی سے افراد کے ظاہر ہونے کا وقت آتا ہے تو پھر اِن افراد کے ظہور سے متعلق جو جزوی محبّتیں ہوتی ہیں، وہ بیشک ظاہر ہو جاتی ہیں ؛

الغرض ایک محبّت تو یہ ہوئی جس کا تعلق وجودِ کلّی کے ظہور سے ہے۔ اور دوسری محبّت وہ ہے جو وجودِ کلّی سے فرد کے ظہور سے متعلق ہوتی ہے، اب ایک فرد تو وہ ہے جس کی شبیہ عالمِ مثال میں قائم ہے۔ اور ایک فرد وہ ہے جو اس عالم میں پھیل جاتا ہے۔ چنانچہ عالمِ ناسوت کے بہت سے افراد پر اس فرد کا علیٰ سبیل البدل مصداق ہوتا ہے۔ اور وہ اس طرح

کہ ایک مرکز ہے جس میں کہ ایک شخص کا وجود قائم ہے۔ اب وہ شخص نہیں رہتا، تو اُس کی جگہ دوسرا شخص لے لیتا ہے۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔

یہ محبت جو اِن معنوں میں فرد کے ظہور سے متعلق ہوتی ہے، اُس کا مقصد اوّلاً یا تو اُس تدبیر الٰہی کا ظہور ہے، جس تدبیر کا تعلق کلّی وجود کے ظاہر ہونے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اس محبت کا تعلق کلّی وجود کے ظہور سے ہُوا تو پھر جس وقت اِس کلّی وجود سے افراد اور اشخاص ظاہر ہُوئے تو اُن کے ظہور کے ساتھ ساتھ ان افراد کے متعلق جو محبتیں تھیں، وہ بھی اُس محبت سے ظاہر ہوئیں۔ یا اُس محبت کا مقصد جو ان معنوں میں فرد کے ظہور سے متعلق ہوتی ہے محض تدبیر الٰہی کا ظہور ہے۔ یا اس سے مقصود صرف اُس نوع کے کمال کا اثبات ہے۔ الغرض ہم نے اِن امور کا خود مشاہدہ کیا ہے۔ اور نیز اِس ضمن میں ہمیں اس کا بھی مشاہدہ ہوا ہے کہ انسانیت کے ظہور کا جو اساس اصلی ہے وہ محض حیوانیت کے تابع نہیں بلکہ حیوانیت سے زائد انسانیت میں وہ محبت بھی ہے جو ذاتِ واحد سے ابتدا میں ظاہر ہوئی تھی۔ اور اسی طرح حیوانیت کے ظہور کا جو اساس ہے، وہ بھی تمام تر نامویت یعنی نباتیت کے تابع نہیں ہے۔

ہم نے اس امر کا بھی مشاہدہ کیا ہے کہ وہ محبت جو فرد کے ظہور سے متعلق ہوتی ہے، جب اس محبت کے پیش نظر ایسا فرد ہوتا ہے جو کہ جامع ہو الٰہیات اور کونیات کے دونوں عالموں کا، اور نیز اگر اس فرد

سے مقصود کل عوالم کے ظہور کی تدبیر ہو، تو ایسا فرد نبی ہوتا ہے۔ اس فردِ نبی سے مُراد "حقیقت نبوت" ہے جو کہ عالمِ مثال میں اپنی مثالی صورت کے ساتھ قائم ہے۔ یہی فرد جس کا کہ اوپر ذکر ہُوا، اصالتہً نبی ہوتا ہے۔ عالمِ مثال میں اس فردِ نبی کے اس طرح ظہور پذیر ہونے کے بعد یہ ہُوا کہ اُس کی اس مثالی صورت سے عالمِ ناسوت میں بھی ایک نمونہ وجود میں آیا۔ پھر ایک اور نمونہ ظاہر ہُوا۔ اور یہ سلسلہ برابر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم میں آئے۔ اور اُن کی ذاتِ اقدس سے مرتبۂ نبوت کے احکام مکمل ہو گئے۔ بہرحال اوپر کی یہ کیفیت اُس وقت ہوتی ہے، جب اس فرد سے کل عوالم کے ظہور کی تدبیر ہو، لیکن اگر یہ نہ ہو تو ایسا فردِ نبی نہیں ہوتا۔

اب اگر محبّت وہ ہے جو وجودِ کلی کے ظہور سے متعلق ہے۔ اور اس ضمن میں وجودِ کلی سے افراد کے ظہور کا وقت آتا ہے تو یہ محبّت دوسری بار فرد کے ظہور سے متعلق ہو جاتی ہے۔ اب اگر اس فرد کے ظہور سے مقصود وجودِ کلی کے ظہور کی تدبیر ہے تو یہ فرد انبیاء میں سے ایک نبی تو ہوگا، لیکن وہ فردِ جامع نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اُس فرد کے ظہور سے مقصود صرف ایسے کمالات کا اثبات ہے کہ اُن کی وجہ سے الٰہی قوتیں کو بہائی قوتوں پر غالب آجائیں تو یہ فرد ولی ہوگا۔ ایسا ولی جو "فنا و بقا" کے مقامات کا حامل ہو۔ بسا اوقات نہ تو شروع میں اور نہ جب کہ نشاۃ کلیہ یا وجودِ کلی سے افرادِ ظاہر ہوتے ہیں، فرد کے ظہور سے محبّت متعلق ہوتی ہے۔ بلکہ

عالمِ ناسوت میں افراد کے ظہور کے وقت فرد سے محبت کا تعلق ہو جاتا ہے۔ اب اگر اس فرد سے ملت کی تدبیر مقصود ہو تو یہ فرد انبیاء کا وارث ہوگا۔ اور اگر یہ مقصود نہیں تو وہ فرد ملاء اعلیٰ کا وارث ہوگا۔ اور اگر اس فرد سے مقصد صرف اتنا ہے کہ وہ صرف راشد یعنی بذاتِ خود ہدایت یافتہ ہو تو یہ اولیاء کا وارث ہوگا۔ یہ باتیں جو مَیں نے یہاں بیان کی ہیں، بڑی معرفت کی ہیں، تمہیں چاہئے کہ ان کو خوب مضبوط پکڑو +

اس کے بعد تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ فرد کے لئے ایسے احکام ہیں کہ فرد کے سوا اور کسی کے یہ احکام نہیں ہوتے، اور اُن احکام میں سے ایک حکم یہ ہے کہ فرد کا کہیں مستقر نہیں ہوتا۔ جب تک کہ نقطہ حُبیہ جہاں سے کہ اُس نے اپنا سفر شروع کیا تھا وہاں واپس نہیں پہنچ جاتا۔ ہاں اس ضمن میں فرد کے لئے ہر منظر اور نشأۃ ایک مستقر ضرور بن جاتا ہے۔ لیکن اس مستقر میں فرد کی رفتار تیر سے بھی جب کہ وہ کمان سے نکلتا ہے، زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اور اُس کی یہ رفتار اُس وقت تک رہتی ہے، جب تک کہ وہ اپنے آخری مقام تک نہ پہنچ جائے۔ فرد کو اپنے اس سفر میں جن جن نشأتوں اور مظاہر سے گزرنا پڑتا ہے، اِن نشأتوں کی آلائش میں سے کوئی چیز بھی اُس کے دامن کو ملوث نہیں کرتی، جیسے کہ فرد کے علاوہ جو اَور لوگ ہوتے ہیں، اُن کو یہ آلائش ملوث کرتی ہے۔ البتہ اللہ کی حکمت میں یہ بات مقدر ہو چکی ہے کہ اس سلسلہ میں فرد کو جن نشأتوں میں سے سفر کرنا پڑتا ہے، اُن میں سے ایک نشأۃ اُس نشأۃ سے جو اُس سے پہلے تھی، ضرورۃً استفادہ کرے +

اس فرد کے احکام میں سے ایک حکم یہ ہے کہ فرد کو "محبت ذاتی عطا ہوتی ہے۔ "محبت ذاتی عبارت ہے نقطۂ حبیہ سے جو اپنے علم، حال اور نشأۃ میں اُس مقام کی طرف لوٹتا ہے، جہاں سے کہ اُس کی حرکت کی ابتدا ہوئی تھی۔ باقی رہے فرد کے علاوہ اور لوگ، تو اُن کو یہ نعمت نصیب نہیں ہوتی۔ اور فرد کے ان احکام میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ فرد کا ایک نشأۃ سے دوسری نشأۃ میں منتقل ہونے کا حقیقی سبب صرف محبت ذاتی ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ فرد کا جب ایک نشأۃ کے مستقر میں ورود ہوتا ہے، تو اس حالت میں اُس کے لئے ضروری ہے کہ اُس خاص نشأۃ کے جو احکام ہیں، اُن کی طرف یہ کچھ زیادہ التفات کرے۔ اور اس نشأۃ کی جو آخری بلندی ہے، اُس سے فرد کا اتصال ہو۔ اور اس پر وہ پوری طرح قابو پالے۔ چنانچہ اس مقام پر فرد سے وہ وہ باتیں ظاہر ہوتی ہیں، جو فرد کے سوا دوسرے سے ظاہر نہیں ہوتی۔ الغرض جب فرد اس نشأۃ کی آخری حد تک کو طے کرلے تو اُس کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس نشأۃ سے اس طرح نکال لے جیسے ایک بچہ ماں کے پیٹ سے نکل آتا ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو بطنِ مادر کی حالت یعنی "نشأۃ جنینہ" سے الگ کرلیتا ہے۔ اس ضمن میں فرد کی ایک نشأۃ سے باہر آنے کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ وقت آتا ہے کہ فرد ایک نشأۃ کی منزل کو ختم کرکے باہر نکلے تو وہ نقطۂ حُبیہ جو اس کے اندر ہوتا ہے، وہ اپنے اصلی مقامِ شرف اور اپنی پہلی بسیط حالت کو یاد کرتا ہے۔ اور اُس کی طرف اس نقطۂ حُبیہ کا

اشتیاق بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ اس نقطۂ حُبیہ کا خود اپنے اصلی مقام اور اپنی پہلی حالت کے لئے سرگشتہ و شیفتہ ہونا محبت ذاتی ہے۔ اور اس محبت ذاتی کی خصوصیت یہ ہے کہ جب فرد سے اُس نشأۃ کے علائق کٹ جاتے ہیں۔ جس میں کہ وہ ہو۔ اور وہ مرجاتا ہے اور اس کا نسمہ اُس کے کثیف ارضی جسم سے الگ ہوجاتا ہے۔ اور اس کے بعد جب وہ وقت آتا ہے کہ اُس کے نسمے سے اُس کی رُوح بھی الگ ہو تو پھر نقطۂ حُبیہ کی محبت و شیفتگی اور اُس کی نشأۃ سے بے تعلقی واپس آجاتی ہے۔ اور اسی طرح جب رُوح کے الگ ہونے کا وقت قریب ہوتا ہے تو پھر نقطۂ حُبیہ کی یہ محبت و شیفتگی اور نشأۃ سے اس کی بے تعلقی اُس کی طرف لوٹتی ہے۔ اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ یہ نقطۂ حُبیہ اپنے اصلی مقام تک سے جہاں کہ وہ پہلے بسیط حالت میں تھا، جاکر مل جاتا ہے۔

باقی رہا نقطۂ حُبیہ کا بدن کے نشأۃ پر سواری کرنا، یعنی اُس پر پوری طرح قابو پالینا، تو یہ چیز انبیاء میں تو بالکل ظاہر ہے۔ البتہ انبیاء کے علاوہ جو اور لوگ ہیں، وہ انبیاء کی وراثت کے جو مناصب ہیں جیسے کہ مجددیت اور قطبیت اور اُن کے آثار و احکام کا ظہور۔ یہ ان کے حامل ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر علم اور ہر حال کی حقیقت تک پہنچنا، اور ہر مقام کی اچھائیوں کو جمع کرنا، یہ چیزیں جب سے کہ خلقت پیدا ہوئی ہے، اور نیز جب سے کہ ہر انسان میں رقائق یعنی لطافتوں کا ظہور ہوا ہے۔ اور ہر رقیقہ کے مناسب جو احکام ہیں، اُن کا تعین ہوا ہے۔ اور ہر رقیقہ کے

آثار فراوانی سے ظاہر ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجود ایک حالت دوسری حالت میں خارج نہیں ہوئی، یہ چیزیں حاصل ہیں ✦

اب رہا نقطۂ حُبیہ کا نشاۃ نسمہ کی پیٹھ پر سواری کرنا، یعنی اُس پر قابو پانا، تو کبھی یہ چیز نسمے کے اُن علوم کے لئے جو اپنے ابدان میں مقید ہیں، اُس تدلّی اعظم تک جس سے کہ طبیعت کلیہ بھری ہوئی ہے، پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہے اور کبھی یہ خارج سے آنی والی صورتوں اور کون و مکان میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے فیضان کا واسطہ ہوتی ہے۔

اس بارے میں اگر تم مجھ سے اصل حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہو تو وہ یہ ہے کہ فرد کا جو بھی حال، یا مقام یا منصب ہوتا ہے، وہ اُسی کے اندر جو رقیقہ ہے، اُس کے اور اُس کی تدلّی کے حال کے مطابق ہوتا ہے۔ اب چونکہ یہ حقیقت یہ ہے کہ فرد کا حال اور منصب تو تمام کے تمام عالم کو ڈھانپ سکتا ہے۔ اس لئے یہ احوال اور مناصب خود اُس کے اندر ہی ہوتے ہیں۔ جب یہ بات واضح ہو گئی تو تمہیں چاہیئے کہ فرد سے جو اس طرح کی باتیں صادر ہوتی ہیں، جن میں اُس کی بڑی بڑی ہمتوں کے صرف کرنے اور بلند مرتبہ مناصب پر فائز ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے، تم اُس کی ان باتوں کو ان معنوں پر محمول کرو۔ اور اگر تم سمجھ دار ہو تو جان لو کہ اس مسئلہ کا جو خلاصہ مطلب ہے اور اُس کی جو حقیقت ہے، وہ ہم پہلے ہی بیان کر آئے ہیں ✦

انسان میں دس ظاہر و نمایاں رقیقے ہیں۔ اور ان میں سے ہر رقیقہ کا اپنا خاص حکم اور اثر ہوتا ہے۔ اور اُس رقیقہ سے اُس کے مخصوص آثار کا

ظاہر ہونا ایک لازمی امر ہے۔ چنانچہ ممکن نہیں کہ ایک شخص جس میں کوئی رقیقہ ہو، اور وہ چاہے کہ اُس رقیقے سے اُن کے مخصوص آثار ظاہر نہ ہوں، کیونکہ یہ رقیقہ پیدائش ہی سے اُس شخص کی اصل جبلت میں داخل ہوتا ہے۔ ان رقائق میں سے ایک رقیقہ قمریہ ہے اور وہ مقابل ہے ایسے اکتسابی علوم سے جیسے کہ علم حدیث ہے اور نیز یہ رقیقہ مقابل ہے اُن طرائق تصوف کی برکات کے جو طرائق کہ مشائخ صوفیاء کی طرف منسوب ہیں۔ اور ایک رقیقہ عطاردیہ ہے جو تصنیف و تالیف جیسے اکتسابی علوم کے مقابل ہوتا ہے۔ اور اس رقیقے والے کی ہر علم میں جس پر کہ اُس کی نظر ہو، اپنی خاص رائے ہوتی ہے۔ خواہ وہ علم از قسم معقولات ہو، یا از قسم منقولات۔ اور انسان کے اندر ایک رقیقہ زہریہ ہے جو کہ جمال اور محبت کا رقیقہ ہے۔ اس رقیقے والا ہر ایک سے محبت کرتا ہے۔ اور ہر ایک اُس سے اس طرح محبت کرتا ہے کہ طرفین کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ اور ان میں سے ایک رقیقہ شمسیہ ہے۔ جو تمام پر غالب آنے کے مقابل۔ اور اس رقیقے والے کا یہ غلبہ معنًا استحقاقًا اور حفظًا ہوتا ہے تاکہ اس کی وجہ سے اللہ کی ساری مخلوق ایک حکم کے تحت آجائے۔ اور انسان کے اندر ایک رقیقہ مریخیہ ہے، جو ہر کمال کے اثبات، اُس کی مضبوطی اور اس کے راسخ ہونے کے مقابل ہوتا ہے۔ اگر یہ رقیقہ نہ ہوتا تو ہر چیز بودی اور بے بنیاد تھی۔ اور ایک رقیقہ مشتریہ ہے۔ اور یہ قطبیت، امامت اور ہدایت کا رقیقہ ہے۔ اور اس رقیقہ والا لوگوں کے لئے مرکز بنتا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ اپنے

ربّ کا قرب حاصل کریں۔ اور ایک رقیقہ زحلیہ ہے۔ اور یہ مقابل ہوتا ہے ہر رقیقہ کے بقاء، اُس کے اثبات اور ایک زمانہ دراز تک اُس کے اثر انداز ہونے کے۔ اور نیز سب سے مجرّد ہوکر طبیعت کلیہ تک پہنچنے کے۔ اور انسان کے اندر ایک رقیقہ ملاءِ اعلیٰ کا ہے جو اُس ہمّت کے مقابل ہوتا ہے، جو ہر اُس چیز کو جس سے ملحق ہوتی ہے، پوری طرح گھیر لیتی ہے۔ اور یہ رقیقہ اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت اور اُس کی حفاظت کی شبح یعنی اُس کے لئے بطور ایک قالب کے بن جاتا ہے۔ اور ایک رقیقہ ملاءِ سافل کا ہے اور یہ اُس نور کے مقابل ہوتا ہے جو اس رقیقے والے کے ہاتھوں، پیروں، اُس کی آنکھوں اور اُس کے سارے اعضاء میں داخل ہوتا ہے اور ایک رقیقہ اُس تدلّی الٰہی کا ہوتا ہے جو بزرگانِ خدا کے لئے نازل ہوتی ہے۔ اس تدلّی کے دو شعبے ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو نورِ نبوت کا شعبہ ہوتا ہے اور دوسرا ولایت کا۔

ان سب رقائق کے بعد اس شخص کا نفس جبلی طور پر قدسی بن جاتا ہے۔ اور اُس کی ایک حالت دوسری حالت کے لئے مانع نہیں ہوتی۔ اور نیز جب وہ سب چیزوں سے تجرّد اختیار کر کے نقطۂ کلیہ سے متصل ہو جاتا ہے۔ اور اس حالت میں نقطۂ کلیہ کے احوال میں سے کوئی حال اُس پر وارد ہوتا ہے تو وہ فوراً اُس حال سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ بیشک اس اجمال کی تفصیل بھی آئے گی اور اس نقطہ کی شرح بھی ہو گی۔

مزید براں اس فرد سے جو کرامات صادر ہوتی ہیں، اُن کا صادر ہونا فرد کے علاوہ دوسرے سے جو کرامات صادر ہوتی ہیں، اُن کی طرح نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں بات دراصل یہ ہے کہ دوسرے سے جو کرامات وخوارق ظاہر ہوتی ہیں، اُن کی نوعیت یہ ہے کہ ایک کیفیت اُس شخص پر غالب آئی اور اس نے اُس کے وجود کے تمام حصّوں پر قبضہ کر لیا اور اس طرح وہ کیفیت اُس پر پوری طرح سے متسلط ہو گئی چنانچہ آثار وکرامات کے سلسلہ میں جو کچھ اُس سے صادر ہوتا ہے، اُس کا دار ومدار صرف اسی کیفیت پر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس فرد کا یہ حال ہے کہ اُس کے وجود کا ایک ایک جزو اپنی اپنی جگہ مستقل ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ جیسے کہ تم ابھی جان چکے ہو۔ یہ ہے کہ فرد میں ایک تو وہ کُلی اور اجمالی رقائق ہوتے ہیں جو افلاک کے نفوس اور اُن کی طبیعتوں سے آتے ہیں۔ اور نیز وہ رقائق، جو عناصر سے آتے ہیں اور اسی طرح وہ رقائق بھی ہیں، جو اُن مختلف اضافات کے کمالات سے آتے ہیں، جو خود اُسے حاصل ہوتے ہیں الغرض ان چیزوں کی وجہ سے فرد کے وجود کا ایک جزو اُس کے وجود کے دوسرے جزو پر متسلط نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب اُس پر اُس کی مَلکی قوت کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے یہ نہیں ہوتا کہ اُس کی بہیمی قوت اپنے تقاضۂ عمل سے معزول ہو جائے۔ اور اسی طرح جب اُس پر بہیمی قوت کا غلبہ ہو تو اس سے یہ نہیں ہوتا کہ اُس کی ملکی قوت اپنے اقتضا سے دستبردار ہو جائے۔ اور نہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سب چیزوں سے تجرد

اختیار کرکے کسی کمال کا اسی طرح سے ہو جائے کہ اس کمال میں اُس کے فنا ہونے کی وجہ سے اُس کے دوسرے کمال کا اثر محو ہو جاتے۔ مختصراً فرد میں ہر چیز اپنے ارادے سے ہوتی ہے۔ چنانچہ جب کبھی اُس سے کوئی خارقِ عادت واقعہ ظاہر ہوتا ہے تو نیچے کی ان دو وجہوں میں سے اُسکی کوئی ایک وجہ ضرور ہوتی ہے۔ یا تو ذاتِ حق جو کہ سب کی مدبر ہے، اُس کا یہ ارادہ ہُوا کہ وہ اپنے بندوں کو کوئی دُنیوی یا اُخروی نفع پہنچائے یا اُن سے کسی مصیبت کو دُور کرے۔ یا یہ کہ اُس نے بندوں کے اعمال پر اُن کو عذاب دینے کا ارادہ کیا۔ اور ذاتِ حق کا یہ ارادہ اِس فرد کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اور اس ضمن میں جو خرق عادت واقعہ رونما ہُوا وہ اس فرد کی طرف منسوب ہو گیا۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں اس فرد کی اصل حیثیت ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی میت غسل دینے والے کے ہاتھ میں ہو۔ یعنی اس معاملہ میں اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

اس ضمن میں فرد سے جو خارقِ عادت واقعہ ظاہر ہوتا ہے، اُسکی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس سلسلہ میں جب فرد نے اپنی عقل، حکمت اور فراست کی طرف رجوع کیا۔ اور اُس نے دیکھا کہ ایک چیز میں خود اُس کے لئے یا دوسروں کے لئے نفع ہے۔ تو اُس کے اندر جو رقائق تھے، اور جن کا کہ ذکر اوپر ہو چکا ہے، اُن میں سے ایک رقیقہ اُس چیز کے مناسب جو امور ہوتے ہیں، اُن کی طرف بسط کرتا ہے۔ اور اس طرح لوگوں کے لئے ایک خارقِ عادت واقعہ ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور

پر اس فرد نے جب اپنی عقل، حکمت اور فراست کی طرف رجوع کیا تو اُس نے سوچا کہ وہ واقعات جو بعد میں رُونما ہونے والے ہیں، اُن سے لوگوں کو آگاہ کرے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اُس کے اندر جو رقیقہ قمریہ تھا، اُس میں بسط ہُوا۔ اور اس سے اُس فرد نے ہونے والے واقعات کا علم حاصل کر لیا۔ اور اس علم کو اُس نے لوگوں تک پہنچا دیا۔ یا مثلاً اُس فرد نے ایک جماعت کو مسخر کرنے کا ارادہ کیا، تو اس سے اُس کے رقائق میں سے جو رقیقہ شمسیہ تھا، اُس کے اندر بسط پیدا ہُوا۔ اور اس کی وجہ سے اُس فرد نے جماعت کو مسخر کر لیا۔ الغرض یہ ہے دوسری جہ فرد سے ظہور کرامات وخوارق کی +

علاوہ ازیں اس دُنیا کی زندگی میں فرد کے خواص میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ اُس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ربّ کی اپنے پورے اخلاق اور اپنی پوری طبائع کے ساتھ عبادت کرے۔ اس میں بات دراصل یہ ہے کہ انسان کی یہ عادت میں داخل ہے کہ جب اُس کے اندر کسی دُنیوی نفع کے حصول یا دنیوی مضرت کو دُور کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو وہ اُس کے لئے شجاعت کے کام کرتا ہے۔ اب اگر یہ انسان "فرد" ہو، یعنی جس "فرد" کے کہ اوصاف اوپر گزر چکے ہیں، تو اُس کے لئے احکام حق میں سے ایک حکم ملاء اعلیٰ میں متشکل ہوتا ہے۔ اور پھر اس حکم سے جو ملاء اعلیٰ میں وجود پذیر ہو چکا ہوتا ہے۔ اس فرد کے نفس میں ایک اثر مترشح ہوتا ہے۔ جس سے اُس فرد کے اندر ایک خواہش

پیدا ہوتی ہے اور اس خواہش کی تکمیل کے لئے اُس کے اخلاق میں سے کوئی خُلق پیش قدمی کرتا ہے۔ چنانچہ اس طرح اس فرد سے اعمال و افعال رونما ہوتے ہیں۔ اس حالت میں فرد کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جہاں تک اُس کی اپنی خواہش اور مرضی کا تعلق ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں مقام فنا میں ہوتا ہے۔ یعنی۔ اپنی ہر خواہش اور مرضی سے درگذر کرتا ہے۔ اور اس کی اپنی کوئی خواہش اور مرضی باقی نہیں رہتی۔ اور جہاں تک ذات حق کے ساتھ اُس کے تعلق کا معاملہ ہے۔ وہ مقام بقا میں ہوتا ہے۔ یعنی اگر اُس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اور اُس کے دل میں کوئی خواہش ہوتی ہے تو صرف ذات حق کی۔ الغرض یہ مطلب ہے۔ فرد کا اپنے تمام اخلاق کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی عبادت کرنے کا۔ اخلاق کی طرح انسان کی اپنی طبائع بھی ہوتی ہیں۔ اور ان میں سے ہر طبیعت کے لئے فنا و بقا کا مقام اور کمال ہے، جو اس ضمن میں انسان کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب انسان کے طبائع میں سے کوئی طبیعت ذات حق میں فنا ہو جاتی ہے تو اس طبیعت سے افعال و اعمال کا ظہور ہوتا ہے۔ اور فنا۔ بقا کے علاوہ جو دوسرا کمال خدا تعالےٰ کی طرف سے انسان کی طبائع میں رکھا گیا ہے، جب یہ کمال انسان کی کسی طبیعت سے مرکب ہوتا ہے تو جس ستارے کا یہ کمال ہوتا ہے، اُسی کے مطابق اس طبیعت سے معنوی تجلیات کا ظہور ہوتا ہے۔ مثلاً اگر اس کے تسمہ میں زہرہ ستارہ کا اثر ہے۔ تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اُس کی ہر حسن اس جمال

سے لذت اندوز ہو، جو اللہ نے اپنی کسی حسین چیز میں رکھا ہے۔ اور نیز وہ جمال سے اپنی اس لذت اندوزی ہی کو اپنے حق میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اُس کی بارگاہ میں اپنی نیازمندی سمجھے۔ چنانچہ اس کی یہ ساری حسّیں اپنی ان جمالی لذت اندوزیوں کے ساتھ، اور وہ تمام حسین چیزیں جن کے جمال سے وہ لذت اندوز ہوتا ہے گویا یہ زبانیں ہو جائیں گی جو اللہ کا ذکر کر رہی ہیں۔ اور اس سے اُس شخص پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جائے گی، جس میں وہ مستغرق ہو جائے گا۔ اور ایک مدت تک وہ اپنی اس کیفیت کے نشہ میں مست رہے گا۔ یہ تو انسانوں پر زہرہ ستارہ کی طبیعت کا اثر ہوا۔ اسی پر تم دوسرے ستاروں کی طبیعتوں کے جو اثرات انسانوں پر مترتب ہوتے ہیں اُن کا بھی قیاس کر لو۔

اس مسئلہ میں اگر تم مجھ سے حق بات پوچھتے ہو تو وہ یہ ہے کہ "فرد" کے حق میں جو اُن کمالات کا حامل ہوتا ہے، جن کا ذکر اوپر ہو چکا، اپنے ربّ کی عبادت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ وہ اپنی طبیعت کے کسی فطری تقاضے کو بجا لا رہا ہو۔ چنانچہ اس تقاضے کو بجا لانے میں اللہ تعالےٰ خود اُس کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اس ضمن میں اگر اللہ تعالےٰ کی طرف سے اُس کے کسی فعل پر تنبیہ ہوتی ہے تو اُس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ مثلاً اللہ تعالےٰ نے اُس کو اپنی مخصوص نعمت کا ایک لباس پہنایا تھا لیکن اُس نے اس لباس کے جو حقوق تھے، اُن کو ادا کرنے میں کوتاہی کی — یہ تو

اس دُنیا کی زندگی میں فرد کے جو خواص ہیں، اُن کا بیان ہوا۔ اور عالم برزخ میں فرد کے خواص یہ ہیں کہ جب وہ موت کے بعد بدن کی قید سے نکل جاتا ہے تو اُس کے اندر اُس "طبیعت عامہ" کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے، جو ہر موجود چیز میں پائی جاتی ہے۔ فرد کا اس "طبیعت عامہ" کی طرف یہ اشتیاق ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کہ انسان کے نفس ناطقہ کا بدن کی طرف اشتیاق ہے۔ لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ نفس ناطقہ کا اشتیاق بدن کی طرف بسلسلۂ تدبیر ہوتا ہے اور "طبیعت عامہ" کی طرف فرد کا اشتیاق عشق و محبت کا ہوتا ہے۔ الغرض مرنے کے بعد جب اُس فرد میں "طبیعت عامہ" کا اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد خود اپنی ہمت سے تمام اجزائے عالم میں سرایت کر جاتا چنانچہ وہ پتھر میں پتھر، درخت میں درخت، فلک میں فلک اور فرشتے میں فرشتہ ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں ایک حالت سے دوسری حالت میں جانے سے کوئی چیز اُس کو نہیں روک سکتی۔ جیسے کہ خود "طبیعت مطلقہ" کی اپنی کیفیت ہے کہ وہ ہر شئے میں موجود اور ہر چیز میں جاری و ساری ہوگئی ہے۔ اس حالت میں فرد سے بیشتر عجیب و غریب آثار و احکام صادر ہوتے ہیں چنانچہ اُن آثار و احکام میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو بطور علم حضوری کے جان جاتا ہے کہ اُس کا مقام "طبیعت اولیٰ" کے ساتھ ہے۔ اور فرد کا اس حقیقت کو جاننا ایسا ہوتا ہے جیسے کہ انسان کا نفس یہ جانے کہ وہ کھڑا ہے۔ حالانکہ اصل میں اُس کا بدن کھڑا ہوتا ہے۔ انسان کا ایک

علم حضوری اور علم حصولی

حقیقت کو اس طرح جاننا یہ علم حضوری ہے۔ لیکن انسان کا یہ جاننا کہ فلاں شخص فلاں کا بیٹا ہے۔ یہ جاننا علم حضوری نہیں بلکہ اسے علم حصولی کہتے ہیں +

وہ عجیب و غریب آثار و احکام جو فرد سے موت کے بعد جب کہ وہ عالم برزخ میں ہوتا ہے ؛ اور اس کے اندر" طبیعت عامہ" کا اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے اس کی ہمت عالم کے تمام اجزاء میں سرایت کر جاتی ہے ؛ ظاہر ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فرد کی یہ حالت بعض دفعہ سبب بن جاتی ہے کسی تدبیر کلی کے فیضان کا۔ چنانچہ یہ تدبیر کلی کسی موطن اور مقام میں ظہور پذیر ہوتی ہے اور اس طرح یہ ذریعہ بنتی ہے برکتوں کے نزول کا ؎

وَمِنْ بَعْدِ هٰذَا مَا تَدِقُّ صِفَاتُهٗ
وَمَا کَتْمُهٗ اَحْظٰی لَدَیَّ وَ اَجْمَلُ

اس مقام سے اوپر جو مقام ہے اس کی صفات بڑی دقیق اور نازک ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک مناسب اور موزوں یہی ہے کہ ان پر پردہ ہی پڑا رہے "

اس مشاہدہ میں یہ تحقیق بھی شامل ہے ——— اس "تحقیق" میں سید عبد السلام بن بشیش نے صوفیاء کے مشرب کے مطابق جو ارشاد

فرمایا ہے۔ اُس کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں موصوف فرماتے ہیں۔ "اے ربّ! حجاب اعظم کو میری روح کی زندگی بنا۔ اور یہی وہ حجاب اعظم ہے جس کی رُوح میری حقیقت کا راز ہے۔ اور اس حجاب اعظم کی حقیقت حقِ اول کے متحقق ہونے کے ذریعہ سے میرے تمام عالموں کو جامع ہے"۔ موصوف کے اس قول میں حجاب اعظم سے مُراد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس ہے۔ جیسے کہ سید عبدالسلام کے اُس قول سے جو اُنہوں نے پہلے فرمایا تھا، واضح ہے۔ اور وہ قول یہ ہے۔ "اے ربّ! تیرا وہ حجاب اعظم جو تیرے لئے تیرے سامنے قائم ہے"۔ سید عبدالسلام نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس کو اس قول میں "حجاب اعظم" سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ حقیقتِ محمدیؐ مُبدَعات میں، یعنی وہ چیزیں جن کا ذاتِ حق نے ابداعؐ فرمایا ہے، سب سے پہلے وجود میں آئی۔ اور اس لئے یہ سب سے عظیم ترین ہے۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں صوفیاء رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔ "سب سے پہلی چیز جس کو اللہ تعالےٰ نے پیدا کیا، وہ میرا نُور تھا"۔ الغرض ذاتِ حق نے سب سے پہلے "حقیقتِ محمدیؐ" کا ابداع فرمایا۔ اور پھر اس حقیقتِ محمدی سے

ؐ وجود باری تعالےٰ سے یہ کائنات کس طرح ظاہر ہوئی، اس ظہور کو ابداع کہتے ہیں۔ چنانچہ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ کو مُبدِع اور کائنات کی کثرت کو مُبدَع کہتے ہیں۔ مترجم

ؐ حقیقتِ محمدی اور ہے اور وجودِ محمدی اور۔ ان دونوں میں فرق کرنا بہت ضروری ہے۔ (مترجم)

اور حقائق نکلے۔ اور اس طرح یہ حقیقتِ محمدی ذاتِ حق اور دوسرے جو حقائق بعد میں پیدا ہوئے، اُن کے درمیان بطور ایک واسطے کے بن گئی۔

مزید برآں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو رُوح ہے، وہ باقی سب انبیاء کے لئے بمنزلہ ایک نبی کے ہے۔ کیونکہ سب انبیاء کی ارواح نے آپؐ ہی کی رُوح کے واسطے سے علوم و معارف اخذ کئے۔ چنانچہ جس طرح ایک نبی اپنی قوم میں ذاتِ حق کا ترجمان ہوتا ہے۔ اور وہ لوگوں کے اور ذاتِ حق کے درمیان واسطہ بن جاتا ہے، اسی طرح نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رُوحِ اقدس انبیاء کی ارواح کے لئے ترجمان بنی۔ اور وہ اُن کے اور ذاتِ حق کے درمیان واسطہ ہو گئی۔ چنانچہ قرآن مجید کی یہ آیت اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے: "(حشر کے دن) اُن لوگوں کا کیا حال ہو گا جب کہ ہم ہر اُمّت میں سے اُس کے بارے میں ایک گواہی دینے والا حاضر کریں گے۔ اور (اے محمدؐ) ہم تمہیں ان سب "ھولاء" پر بطورِ گواہی دینے والے کے لائیں گے۔" اگر ہم اس آیت میں لفظ ھولاء جو ہے، اُس کے معنی گواہی دینے والوں یعنی انبیاء کے لیں۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ صورت جس میں آپؐ اس عالمِ ناسوت میں ظاہر ہوئے اور جس صورت سے کہ معجزات کا صدور عمل میں آیا اور جس صورت کی زبان سے معارف و احکام بیان کئے گئے۔ آپؐ کی یہی وہ صورت ہے جو ذاتِ حق اور خلقت کے درمیان واسطہ بنی۔ اور

لوگوں نے اُس کو ذاتِ حق سے قُرب حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا۔

علاوہ ازیں ہم اس سے پہلے بتا آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تین کلّی نشأتیں (ظہور) تھیں ۔ اور ان تین نشأتوں کے مطابق آپؐ کے توسط، یعنی لوگوں کے لئے واسطہ بننے کی بھی تین قسمیں ہیں ۔ آپؐ کی ان نشأتوں میں سے پہلی نشأۃ عبارت ہے۔ اُس مرتبہ سے، جس کو صوفیاء نے "حقیقتِ محمدیہ" کا نام دیا ہے ۔ اور "حقیقتِ محمدیہ" سے مُراد اللہ تعالےٰ کے اسمائے کلیہ کے احکام کا خارج میں کلی لحاظ سے متعین ہوتا ہے ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کلّی نشأتوں میں سے دوسری نشأۃ عبارت ہے اُس مرتبہ سے ، جس کا نام صوفیاد کے ہاں "روحِ محمدی" ہے ۔ اور اس سے مُراد انسانِ کلّی کا اُس کے مظاہر اور تقیدات سے ظہور کے وقت "حقیقتِ محمدیہ" کے مقابل خود اُس کے اپنے آپ کا تعین ہے اور آپؐ کی نشأتوں میں آخری نشأۃ وہ ہے جو عبارت ہے آپ کے اُس مرتبے سے جس میں آپ اس عالمِ ناسوت میں ظاہر ہوئے ۔ اسی نشأۃ سے آپؐ کے اُن ظاہری کمالات کا تعلق ہے جو گم کردۂ راہ اُمّت کو راہِ راست پر لانے کے لیئے آپؐ سے اُس وقت ظاہر ہوئے جب کہ چالیس سال کی عمر یعنی آپؐ کو لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا۔ چنانچہ آپ نے اندھی آنکھوں کو روشنی دی، بہرے کانوں کو قوتِ سماعت بخشی ۔ اور نہ بہ پردہ دلوں میں جو لپیٹے ہوئے تھے ، اُن کو بیدار کیا ۔ اور اس طرح وہ لوگ اس قابل ہوگئے کہ اُنھوں نے اللہ کے ایک ہونے کی شہادت دی۔ اور وہ تہذیب

کی نعمت سے فیض یاب ہوئے۔ اور اُنہوں نے اُن احکام الٰہی کو جن کا کہ لوگوں کو پابند بنایا گیا ہے، اور نیز ان احکام کے علاوہ دوسرے الٰہی معارف کو جان لیا۔

اولیاء میں سے کامل ترین ولی وہ ہوتا ہے، جو ان تین نشأتوں میں جن کا کہ ذکر ابھی ہوا ہے، خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونے پر ہو۔ لیکن اس ضمن میں یہ بات یاد رہے کہ وہ جزوی حقائق جو محبت، محبوبیت اور اُن سے ملتے جلتے دوسرے جو کمالات ہیں، اُن کی اپنے اندر استعداد رکھتے ہیں، اِن کا تعین اُسی وقت ہی ہوتا ہے جب انسانِ کلّی اپنے جز (مقام) میں مستقل طور پر ظہور پذیر ہو چلتا ہے۔ چنانچہ اِن جزوی حقائق کا خارج میں پہلا تعین حقائق کلیہ کے تعین روحی کے مشابہ اور اُس کے مقابل ہوتا ہے۔ اور اسی بنا پر جب تک جزوی حقائق کا اِس مرتبہ میں تعین نہیں ہو جاتا، اُس وقت تک حقیقتِ محمدیہ سے اِن جزوی حقائق تک مدد نہیں پہنچتی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک ولی میں جو جامعیت ہوتی ہے، وہ اسی "حقیقت محمدیہ" کی وراثت ہے۔ اور اُس ولی میں جو جو استعدادیں ہوتی ہیں۔ اُسے رُوحِ محمدی سے ورثہ میں ملتی ہیں۔ الغرض عطایات کا مرتبہ تو ایک ہے لیکن ان عطایات کے وجود میں آنے کے اسرار متعدد ہیں۔

قصہ مختصر، یہ بات تو بطور تمہید کے طے ہو گئی۔ اب ہم سید عبد السلام بن بشیش کے اُس قول کی طرف پھر رجوع کرتے ہیں۔ موصوف دراصل اللہ تبارک و تعالٰے

سے اپنی فطری استعداد کی زبان سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انہیں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ان تین نشأتوں میں بالاجمال، اور نیز ان میں سے ہر ہر نشأۃ کے مخصوص کمالات میں بالتفصیل آپ کا وارث بنائے۔ چنانچہ شیخ موصوف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم ناسوت میں جو کمالات تھے، اُن کا وارث بننے کے سوال کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے "اے رب! تو حجاب اعظم کو میری روح کی زندگی بنا"۔ اس رُوح سے اُن کی مُراد وہ رُوح ہے جو اس مادی بدن میں پھونکی جاتی ہے۔ اور پھر وہ زندگی میں اس بدن کی مدبر اور منتظم ہوتی ہے اور اسی سے بدن میں حس اور حرکت پائی جاتی ہے۔ اور یہی وہ رُوح ہے جو جزوی افراد کو جزوی کمالات کا اہل بناتی ہے۔ اور نیز وہ کلی افراد جو مجموعی کمالات کی استعداد کے مالک ہوتے ہیں ان کلی افراد کے اندر جو صورت ناسوتیہ ہے، اُس کو کہیں بیان کرتے ہوئے ہم اس رُوح ہی کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ الغرض شیخ موصوف کا یہ کہنا کہ "اے رب! تو حجاب اعظم کو میری روح کی زندگی بنا" اس میں شیخ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض کو اپنی رُوح کے لئے زندگی کی تشبیہ دی ہے۔ اور ظاہر ہے زندگی ہی روح کا سب سے پہلا کمال ہے۔ چنانچہ شیخ نے آپ کے فیض کو زندگی سے جو تشبیہ دی ہے، اس تشبیہ میں جو حسن ہے وہ تم سے مخفی نہ رہنا چاہیے۔

آگے چل کر شیخ نے اپنی دعا میں اس سوال کی خود ہی تشریح کر دی ہے، چنانچہ "اے رب! تو حجاب اعظم کو میری روح کی زندگی بنا" کہنے کے بعد

وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "یہی وہ حجابِ اعظم ہے جس کی روح میری زندگی کا راز ہے"۔ اور یہ اس لئے کہ جہاں ارواحِ کلّی کا تعین ہوتا ہے، وہیں سے ہی حقائق جزوی کا بھی ظہور ہوتا ہے۔ یعنی حجابِ اعظم کا تعلق ارواحِ کلّی سے ہے۔ اور انفرادی زندگی حقائق جزوی سے متعلق ہوتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں تم سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ رہے کہ شیخ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض کو جس کا کہ فیضان موصوف اپنی حقیقت پر چاہتے ہیں، لفظ "ستر" یعنی راز سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس لفظ "ستر" سے اس کا آثار و کمالات کا منبع ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور اسی طرح اس "ستر" سے یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ اس میں حسن و خوبی کے ایک ہی معیار پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے استعدادوں کا تعین ہو گیا ہے۔

اس کے بعد شیخ اپنی اس دعا میں فرماتے ہیں "حجابِ اعظم کی حقیقت میرے تمام عالموں پر جامع ہے"۔ اور یہ تعبیر ہے شیخ کے اس سوال کی کہ وہ کمالات جن کی وارث "حقیقتِ محمدیہ" ہے۔ اور اگرچہ یہ "حقیقتِ محمدیہ" اپنے ہے کم مرتبے میں ظاہر ہوتی ہے۔ "اے رب! تو مجھے ان کمالات کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث بنا"۔ اس ضمن میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اس جہت سے کسی ولی کے کامل ترین ہونے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ خارج میں جو نشانیاں ہیں اُن کے مقابل اُس ولی کے اندر رقائق ہوں اور دراصل واقعہ یہ ہے کہ ان رقائق میں سے ہر رقیقہ اپنے ترکیب نشاۃ کی اجمالی صورت اور اُس کے احوال کی معرفت سے عبارت ہو۔ اسی چنانچہ اس مرتبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کرنے والے کی حقیقت پر آپؐ کی طرف

سے جو فیضان بھی ہوگا، وہ تمام عالموں کو جمع کرنے والا ہوگا اور اسی لئے شیخ اس کے بعد ہی اسی دعا میں فرماتے ہیں کہ "اے رب! حق اوّل کو متحقق کرکے اس کو واسطہ بنا کہ حجابِ اعظم میری رُوح کی زندگی ہو جائے"۔ "متحقق کرکے" کے معنی "خارج" میں کسی چیز کو متحقق کرنا ہے۔ اور یہاں اس سے مُراد "فیضِ مقدس" سے ہے۔ اور اس ضمن میں تم سے یہ بھی مخفی نہ رہے کہ یہاں مُظہر کی جگہ مَظہر کا ذکر کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حقِ اوّل جب متحقق ہوگا تو اس کا تحقق اس لحاظ سے ہوگا کہ وہ "حق ہونے حق" ان معنوں میں کہ وہ بذاتِ خود بھی متحقق ہوتا ہے۔ اور اپنے سوا دوسروں کے تحقق کا باعث بھی بنتا ہے۔ اور نیز وہ مُبداء ہے تمام اشیاء کا۔ اور اس لئے وہ سب سے اوّل ہے۔ اور وہی سب وجودوں کا وجودِ اوّل اور ماہیات کی پہلی ماہیت ہے +

اس مشاہدہ میں یہ تحقیق بھی شامل ہے ـــــــ معلوم ہونا چاہیئے کہ عارف کے لئے خود ذاتِ حق کا وصال اور ذاتِ حق کے اسماء و تجلیات کا وصال برابر ہوتا ہے۔ بے شک ہم کہتے ہیں کہ عارف کو خود ذاتِ حق کا وصال ہوتا ہے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ وہ عارف اُس ذات کا علم اور ادراک رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ اس ضمن میں جو کچھ ہم نے یہاں کہا ہے، محققین کے کلام سے ہماری اس بات کے خلاف جو وہم

ہوتا ہے، تو اُس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ محققین نے ذاتِ حق سے نفسِ وصال کا انکار نہیں کیا۔ البتہ اس سلسلہ میں اُنھوں نے ذاتِ حق کو جاننے اور اُس کا احاطہ کر سکنے کی ضرور نفی کی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سالک جب اُس حقیقت تک پہنچتا ہے، جس کو "انا" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور نیز جب وہ اُس حقیقت "انا" کو اُس کے نیچے جو مراتب ہیں، اُن سے منزّہ اور مجرّد کر لیتا ہے۔ تو اس حالت میں سالک کا تحقق، تقرر اور وجود کی طرف التفات ہوتا ہے۔ اور ان سب کی اصل وجودِ مطلق ہے۔ اس وجود مطلق کے کئی تنزلات اور بہت سے لباس ہیں۔ سالک تحقق، تقرر اور وجود کی طرف التفات کے ضمن میں وجودِ مطلق کے ہر تنزل اور اُس کے ہر لباس کو اس تنزل اور لباس کی حس کے ذریعہ جان جاتا ہے۔ چنانچہ وہ عالمِ مثال کا عالمِ مثال کی حس کے ذریعہ اور عالمِ روح کا عالمِ روح کی حس کے ذریعہ ادراک کرتا ہے۔ اور اس طرح وہ اور آگے بڑھتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس حقیقت کا جس کے بعد کوئی اور حقیقت نہیں، خود اُس حقیقت کے ذریعہ ادراک کرتا ہے۔ اور یہ ہے عارف کا ذاتِ حق سے وصال اور اس مقام میں اگر اُس کو علم ہوتا ہے تو اسی حقیقت "انا" کا۔ اور عارف ادراک کرتا ہے تو اسی "انا" کی حقیقت کا۔ عارف باللہ شیخ عفیف الدین تلمسانی نے اسی نکتے کی طرف اپنے ان اشعار میں کس خوبی سے اشارہ فرمایا ہے :-

دَعْوا مُتکبری فوزی بوصالِ مطر   یُحَقِّق لِمَا تِیانٖہا قلوبِ انتظارِھا
وَمَاذَا عَلَی مَن صَارَ عَالاً لِحُدِّھا   اَغَارَ اَبُوھَا اَم تَنَبَّہَ جَارُھَا

"محبوبہ کو میرے پا لینے سے جو انکار کرتا ہے اُسکو چھوڑ دو
اُس کو چھوڑ دو۔ اُس کا دل شق ہُوا کرے۔ اور سچی بات تو یہ ہے
بالیسے دل اس قابل ہی ہیں کہ وہ شق ہوا کریں ـــ اگر ایک
شخص اپنی محبوبہ کے رخسار کا خال بن جائے تو اُسے اس کی
کیا پروا ہوتی ہے کہ اس بنا پر محبوبہ کے باپ کی غیرت مشتعل
ہوگئی۔ یا اُس محبوبہ کے ہمسایہ کو اس کی خبر لگ گئی"

الغرض جو کاملین ہیں، اُن کو تو ذاتِ حق کا بالفعل وصال ہوتا ہے
اور اسی طرح اُنہیں ذاتِ حق کے اسماء و تجلیات کے اصول میں بھی فنا و
بقا اور تحقق حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس ضمن میں ایسا ہو کہ یہ کاملین اس
کے متعلق حالتِ انتظار میں رہیں، تو یہ بات جائز نہیں ہے بے شک
اس کے بعد یہ ضرور ہوتا ہے کہ وجود کی نشأتوں میں سے ہر ہر نشأۃ
کے جو خصوصی احکام ہوتے ہیں عارف کو یکے بعد دیگرے ان میں سے
گزرنا پڑے۔ گویا کہ پہلے عارف نے ذاتِ حق اور اس کے اسماء و تجلیات
کے وصال کے وقت ان تمام نشأتوں کے خصوصی احکام کا بھی احاطہ
کر لیا ہو۔ لیکن عارف کا ان تمام نشأتوں کا یہ احاطہ اجمالی ہوتا ہے۔
اور اُس کی تفصیل باقی رہتی ہے۔ چنانچہ اب جو وصال کے بعد اُسے
ہر ہر نشأۃ کے احکام خصوصی سے گزرنا پڑا تو یہ تفصیل ہوئی اُس اجمالی
علم کی جو اُسے ذاتِ حق اور اُس کے اسماء و تجلیات کے وصال کے
وقت تمام نشأتوں کے احاطہ کے متعلق حاصل ہوا تھا۔ الغرض ان

معنوں میں کاملین کی ترقیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے ۔

اس مشاہدہ میں یہ تحقیق بھی ہے ——— ذاتِ اول یعنی خدا تعالیٰ کو اشیاء کا دو جہت سے علم ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک اُس کے علم کی اجمالی جہت ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب ذاتِ اول کو اپنی ذات کا علم ہوا تو اس ضمن میں اُس نے وجود کے نظام کے سلسلہ میں اُس کا اپنا جو اقتضائے ذاتی تھا، اُس کو بھی جان لیا۔ بات یہ ہے کہ علتِ تامہ کا یعنی وہ علت جس کا لازمی نتیجہ اُس سے معلول کا صدور ہو اعلم اس امر کی کفایت کرتا ہے کہ علتِ تامہ کے ساتھ ساتھ معلول کا بھی علم حاصل ہو گیا۔ اب جہاں تک کہ اشیائے عالم کا تعلق ہے وہ سب وجودِ الٰہی میں موجود تھیں۔ اور ان کا وجود وہاں بمنزلہ امکان کے نہیں تھا کیونکہ ایک چیز جب متحقق ہوئی تو اُس کا متحقق ہونا اس بنا پر تھا کہ ذاتِ واجب نے اُسے متحقق کیا۔ اور اسی طرح ایک چیز وجود میں آئی، تو اس کا وجود میں آنا اسی وجہ سے تھا کہ ذاتِ واجب نے اُسے ایجاد کیا۔ غرضیکہ ہر چیز کے مقابل ذاتِ واجب کا ایک کمال اور اس کا اقتضائے ذاتی ہے۔ اور ذاتِ واجب کے یہی وہ حالات ہیں جو اشیاء کے ظہور کا منبع اور اُن کے حقائق کی اصل کنہ ہیں۔ چنانچہ جس طرح ذاتِ واجب کا ہر کمال خود اپنی خصوصیت کے اعتبارات ایک نہ ایک چیز کو

وجود میں لانے کا متقاضی ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر چیز بھی وجود میں آنے کے لئے ذاتِ واجب کے ایک نہ ایک کمال کی محتاج ہوتی ہے۔ گویا کہ ذاتِ واجب کے یہ کمالات اور یہ اشیاء امر واحد ہیں۔ لیکن یہ کمالات ذاتِ واجب کے لوازم اور اس کے ذاتی اعتبارات ہیں بمنزلہ اس کے علم، اس کی قدرت اور اس کی حیات کے ہیں۔ یعنی یہ سب کے سب معلولات ہیں اس ذاتِ واجب کی علت تامہ کے۔ اور اسی سے ان سب کا صدور بھی ہوا ہے +

ذاتِ اول کو اشیاء کا علم جس طرح ہوتا ہے اس کی پہلی جہت یعنی جہتِ اجمالی تو یہ ہوئی۔ ذاتِ اول کے علم کی دوسری جہت جہت تفصیلی ہے۔ اور اس کی شرح یہ ہے کہ ہر چیز جو موجود ہے۔ وہ معلول ہے ذاتِ واجب کی۔ یعنی اس کے وجود میں آنے کے لئے ذاتِ واجب علت بنی۔ اور جو چیز معلول[1] نہیں یعنی اس کی کوئی علت نہیں تو اس چیز کا متحقق ہونا بھی ممکن نہیں۔ اور اس سلسلہ میں یہ بات بھی ضرور ملحوظ رہے کہ یہ معلومات ذاتِ حق کی اس طرح محتاج نہیں ہیں جیسے کہ ایک عمارت کا بننا معمار کا محتاج ہوتا ہے یعنی جب عمارت بن گئی تو پھر معمار کی ضرورت نہ رہی بلکہ ان معلولات کو جبتک کہ وہ معلولات موجود ہیں، اپنے تقرر میں، اپنے جوہر ہونے، متحقق ہونے اور قیام پذیر ہونے میں برابر ذاتِ واجب کی حاجت رہتی ہے اور ذاتِ واجب کا ان معلولات کو وجود میں لانا، اور اس کا انکو متحقق کرنا ہی فی الحقیقت ان معلولات کے وجود اور تحقیق پذیر۔۔۔

---

[1] عدم سے تو عدم ہی پیدا ہوتا ہے۔ وجود کے لئے کوئی علت چاہیے۔ مترجم

ہونے کی اصل ہے۔ اور نیز اشیاء کی ماہیات میں آپس میں ایک دوسرے سے جو امتیاز پایا جاتا ہے، تو یہ نتیجہ ہے ذاتِ واجب کی طرف سے ایجاد، تحقق اور تقدم کی جو حیثیتیں ہیں، اُن کے باہمی امتیاز کا۔ اور ذاتِ واجب کا ان معلولات کے ساتھ جو ارتباط پایا جاتا ہے، وہ اُس ارتباط سے جو ایک صُورت اور اُسکے محل صُورت میں ہوتا ہے، زیادہ قوی ہے۔ اور یہ ارتباط اس امر کا بھی متقاضی ہوتا ہے کہ اشیاء اپنے فاعل کے روبرو موجود ہوں۔ الغرض ذاتِ اول ان اشیاءٔ کو ان اشیاء ہی کے ذریعہ سے جانتی ہے، نہ کہ اُن صورتوں کے ذریعہ سے جو ذاتِ واجب میں منقوش ہیں۔ اور اشیاء کا یہی وہ علم ہے جو ذاتِ واجب کو ان اشیاء کے وجودِ امکانی کے واسطہ سے ہوتا ہے۔ خواہ یہ اشیاء از قبیلِ مادیات ہوں یا از قبیلِ مجردات۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ جواہرِ عقلیہ جن کے اندر اشیاء کی صورتوں کو منقوش مانا جاتا ہے، اُن کو ذاتِ اول اور اشیاءٔ کے درمیان اس علمی ربط کو قائم کرنے کے لیئے واسطہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیشک اِن جواہرِ عقلیہ کو واسطہ بنانے کی ضرورت مفروضات میں تو ہو سکتی ہے۔ یعنی وہ مفروضات جو محض خیال ہی میں اپنا وجود رکھتے ہیں اور اِس دُنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ جیسے کہ فرض کرنے والوں نے غول بیابانی کے لمبے لمبے دانت فرض کیے لئے ہیں۔ الغرض مطلب یہ ہے کہ ذاتِ اول کو اشیاء کا علم اشیاء ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اور اس کے لیئے اُسے جواہرِ عقلیہ کو واسطہ بنانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تم اس میں خوب غور و تدبر کرو۔

چھیالیسواں مشاہدہ

تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ملتوں اور مذاہب کو حق کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ یہ ملت حقہ ہے یا یہ مذہب حق ہے۔ اب جو کسی ملت اور مذہب کو حق سے موسوم کیا جاتا ہے تو اُسے ایک دیکھنے والا اس نظر سے دیکھتا ہے کہ آیا یہ ملت یا مذہب اپنی واقعی صورت کے مطابق ہے یا نہیں۔ ہم نے اس معاملہ میں غور کیا کہ آخر کسی ملت یا مذہب کی یہ واقعی صورت کیا ہے کہ اگر وہ اُس کے مطابق ہے تو وہ حق ہے، اور اگر وہ اُس کے مطابق نہیں، تو وہ باطل ہے۔ ہم نے اس کے دو معنی معلوم کئے ہیں۔ ان میں سے ایک تو جلی معنی ہیں، اور دوسرے دقیق، جن کو کہ دُور ہی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ جلی معنی کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی اعتقادی مسئلہ ہے تو اُس کے اپنی صورت واقعی کے مطابق ہونے سے مُراد یہ ہے

کہ خارج میں اُس مسئلہ کی جو صورت ہے، وہ اُس کی واقعی صورت کے مطابق ہو، مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ اللہ اِس اِس بات سے ناراض ہوتا ہے تو واقعتہً معاملہ ایسا ہی ہو۔ یا اگر یہ دعویٰ ہے کہ مُردوں کا حشر کے دن دوبارہ جی اُٹھنا جسمانی لحاظ سے ہوگا تو واقعہ بھی یہی ہو۔ الغرض ہر وہ حکم جس میں کہا جائے کہ یہ چیز واجب ہے اور یہ حرام، تو اس حکم کے اپنی صورتِ واقعی کے مطابق ہونے کے یہ معنی ہوں گے کہ ملاءِ اعلیٰ میں اس حکم کی جو صورت قائم ہے، یہ حکم اُس صورت کے مطابق ہے۔ مثال کے طور پر یہ حکم ہے کہ نماز واجب ہے۔ اب وجوب نماز کے حق ہونے سے مُراد یہ ہوگی کہ قضاو قدر کی طرف سے ملاءِ اعلیٰ میں ایک ایسی مثالی صورت نازل ہوئی ہے، جس کا خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ جو شخص نماز کو اپنا شعار بناتا ہے تو وہ مثالی صورت جو ملاءِ اعلیٰ میں قائم ہے، وہ اُس شخص کو پسند کرتی ہے۔ اور اسی طرح جو نماز کو مضبوطی سے پکڑتا ہے تو دُنیا اور آخرت دونو میں اس شخص کے نسمے کا ترقی کرنا ایک لازمی چیز ہو جاتا ہے۔ اور نیز نماز کی وجہ سے اُس شخص کے نسمے سے وہ تاریک اثرات جو بہیمی قوت میں نفس کے انہماک کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں، چھُٹ جاتے ہیں، بالکل اُسی طرح جیسے ادرک کھانے سے بدن میں گرمی پیدا ہوتی ہے اور ٹھنڈ کا اثر جاتا رہتا ہے۔ الغرض وجوب نماز کے حق ہونے کے معنی یہ ہیں کہ نماز کا یہ حکم ملاءِ اعلیٰ میں اس حکم کی جو صورت ہے، اُس کے مطابق ہو۔ یہ تو ہُوا اعتقادات کا معاملہ۔ باقی رہے وہ احکام

جن میں وقت اور زمانے کی قید ہوتی ہے ۔ یا ملی نظام کے پیش نظر ان احکام کی خاص حدود مقرر کی جاتی ہیں، جیسے نماز میں پانچ وقت کی قید ہے۔ اور زکوٰۃ کے لئے کم سے کم دو سو درہم کا ہونا اور اُن پر کامل ایک برس گزرنے کی شریعت کی طرف سے حد لگائی گئی۔ سو ان احکام کا اپنی صورت واقعی کے مطابق ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ جو سارے احکام ہیں ان کی ایک اصل ہے۔ اور اس ایک اصل سے ان احکام کے تمام قالب اور اُن کے اشباح نکلتے ہیں۔ اور اس اصل اور احکام کے ان قالبوں میں ایک تشبیہی وجود پایا جاتا ہے جو ملاء اعلیٰ کے مدارک میں قائم ہے۔ اب اس تشبیہی وجود کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تشبیہی وجود کبھی اصل بن جاتا ہے اور کبھی یہ اصل تشبیہی وجود ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی ملت اپنے اس تشبیہی وجود کے مطابق ہوتی ہے تو اُس وقت کہا جاتا ہے کہ یہ ملّت حقہ ہے ؛

اسی طرح جب یہ کہا جاتا ہے کہ فقہ کا یہ مذہب مذہب حق ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس مذہب کے احکام ایک تو جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، آپؐ کے ان ارشادات کے اصل مقصود کے مطابق ہیں، اور دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کا وہ زمانہ[1] جس کے مشہود بالخیر ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اُس زمانے میں جس طریقے پر عمل ہوتا تھا ۔ اس مذہب فقہ کے احکام اُس

---

[1] خلافت راشدہ کا زمانہ جس میں اُمّت متحد و متفق رہی۔ مترجم

طریقے کے مطابق ہوں۔ اور نیز اگر کوئی فقہ کا ایسا مسئلہ ہے کہ اس کے متعلق نہ تو کوئی نصِ قرآنی موجود ہے، اور نہ کوئی حدیث، تو اس مسئلہ کے حق ہونے کی یہ صورت ہوگی کہ اس ضمن میں تمام قرائن اس امر پر دلالت کریں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلے پر گفتگو فرماتے تو ظنِ غالب یہی ہے کہ وہ اس کے علاوہ کچھ اور نہ فرماتے۔ اور پھر فقہ کے اس مسئلے کے استخراج اور استنباط میں اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ نصوص سے اس استخراج اور استنباط کی وجہ ظاہر اور واضح ہو۔ کہ اسالیب کلام سے واقف اور احکام شرع میں شارع علیہ السلام کے پیش نظر جو مقاصد تھے اُن کا جاننے والا اس مسئلے کو دیکھے تو اس کو اس مسئلہ کے طریقۂ استخراج و استنباط کے صحیح ہونے پر شک نہ گزرے۔ الغرض مذاہب فقہ کے حق ہونے کی یہ شکل ہے۔

اب رہے ملتوں اور مذاہب کے حق ہونے کے دوسرے معنی جو دقیق ہیں، اور اُن پر دُور ہی سے نظر پڑ سکتی ہے، تو اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ ذاتِ حق نے چاہا کہ وہ دنیا کی اقوام میں سے کسی قوم کے بکھرے ہوئے اجزاء کو جمع کرنے کے لئے اپنے بندوں میں سے کسی برگزیدہ بندے کو یہ الہام کرے کہ وہ ایک ملت کی تشکیل عمل میں لائے۔ چنانچہ اس طرح یہ بندہ ذاتِ حق کے ارادہ کا خادم، اور اس کی تدبیر کو بروئے کار لانے کا ذریعہ، اور اُس کی مددِ غیب کے فیضان کا موضوع بن جاتا ہے۔ اور اس کے بارے میں ذاتِ حق کی طرف سے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ جس

نے اس برگزیدہ بندے کی اطاعت کی تو گویا اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اور جس نے اُس کی نافرمانی کی، اُس نے گویا اللہ کی نافرمانی کی چنانچہ ایک زمانے میں اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اُس کی اس تدبیر خصوصی میں جو اس بندے کے ذریعہ دُنیا میں برسرِ کار آتی ہے، محدود ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قہر و غضب بھی اُس کی اس تدبیر کی مخالفت کے ساتھ ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے۔ الغرض جب کسی ملت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ امتیاز حاصل ہوتا ہے تو اُس ملت کے سارے کے سارے احکام حق سے موسوم ہوتے ہیں۔ اور اُن احکام کو حق سے موسوم کرنے میں جو بات پیش نظر ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں احکام کی صرف اسی نہج اور اُن کے اسی قالب ہی میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر مصروف کار ہوتی ہے۔ اور اُس نہج اور قالب کے علاوہ اُس زمانے میں تدبیر الٰہی کا اور کوئی مظہر موجود نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ یہی کیفیت فقہ کے ایک خاص مذہب کی بھی ہو جاتی ہے، اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ کی وہ عنایت جو ایک ملت کی حفاظت کی طرف متوجہ ہوتی ہے، وہ اس سلسلہ میں بعض اسباب کی وجہ سے فقہ کے ایک خاص مذہب کو اپنا مقصود بنا لیتی ہے۔ اور ان اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ اُس زمانے میں اسی مذہب فقہ کو ماننے والے ہی ملت کی حفاظت کرنے والے ہوں۔ یا مثلاً ایک مُلک میں ایک فقہی مذہب کے حکام کے تمام پیرو ہیں۔ اور اُن کا یہی فقہی شعار خاص و عام میں حق و باطل کے

لئے وجہ امتیاز بن گیا ہے۔ اس حالت میں ملاءِ اعلےٰ اور ملاءِ سافل میں اس ملت کا جو وجودِ تشبیہی ہے، وہ ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ملت دراصل اسی فقہی مذہب سے عبارت ہے، اور اس طرح ملاءِ اعلےٰ اور ملاءِ سافل کے مدارک میں ملت کے کُل احکام اسی فقہی مذہب کی مخصوص صورتوں میں مقید ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح یہ فقہی مذہب مذہب حق بن جاتا ہے، اور اُس کے حق ہونے کا مدار ملاءِ اعلےٰ اور ملاءِ سافل کے اُس وجودِ تشبیہی پر ہوتا ہے، جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔

الغرض کسی ملت یا مذہب کے حق ہونے کے جو معنی ہیں۔ اور ان معنوں کے جو دو پہلو ہیں تو جہاں تک اُن معنوں کے جلی پہلو کا تعلق ہے اُس تک تو "راسخین فی العلم" کا گروہ اپنے علم کے ذریعہ اور اہل استنباط کی جماعت اپنے استنباط سے پہنچ جاتی ہے، لیکن جو ان معنوں کا دقیق پہلو ہے اس تک تو صرف نورِ نبوّت کی مدد سے ہی رسائی ممکن ہے۔ اور اس نورِ نبوت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اُس تدبیر الٰہی کے احکام کا جس کے زیر تصرّف سارے کے سارے انسان ہیں انکشاف ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ نورِ نبوت کا حصول عام چیز نہیں ہے اس لئے یہ پہلو جلی نہیں ...... بلکہ دقیق ہے۔ اور اس پر دُور ہی سے نظر ڈالی جا سکتی ہے۔

یہ بحث تو ختم ہوئی۔ اس سلسلہ میں اب ہم ایک اور بات کہتے ہیں

مجھے دکھایا گیا کہ حنفی مذہب میں ایک عمیق راز ہے۔ چنانچہ میں اس عمیق راز کو برابر غور سے دیکھتا رہا اور میں نے اُس میں وہ بات پائی جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ کسی فقہی مذہب کے حق ہونے کا جو دقیق پہلو ہے، اُس کے لحاظ سے آج اس زمانے میں حنفی مذہب کو باقی سب مذاہب فقہ پر ترجیح حاصل ہے۔ گو بعض دوسرے مذاہب فقہ کسی مذہب کے حق ہونے کا جو جلی پہلو ہے، اُس کے اعتبار سے حنفی مذہب پر ترجیح رکھتے ہیں۔ میں نے اس ضمن میں اس بات کا بھی مشاہدہ کیا کہ حنفی مذہب کا یہی وہ عمیق راز ہے جس کو بسا اوقات ایک صاحب کشف کسی حد تک ادراک کرتا ہے۔ اور اپنے اسی ادراک کی بنا پر وہ حنفی مذہب کو باقی تمام مذاہب فقہ پر ترجیح دیتا ہے۔ اور کبھی کبھی اس صاحب کشف کو اس امر کا الہام بھی ہوتا ہے کہ وہ مذہب حنفی کا سختی سے پابند ہو۔ اور کبھی یہ صاحب کشف رؤیا میں کوئی ایسی چیز دیکھتا ہے جو اُسے مذہب حنفی کو اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ بہرحال اس مسئلہ کی اصل حقیقت وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دی۔ تمہیں چاہیے کہ تم اس حقیقت کو مضبوطی سے پکڑو اور اس پر خوب غور و تدبر کرو۔

آخری مشاہدہ

میں کعبۂ مشرفہ میں داخل ہُوا۔ اور میں نے وہاں اپنے باطن کی طرف توجّہ کی، تو مجھ پر صراطِ مستقیم کی حقیقت کی تجلّی ہوئی۔۔۔۔۔ صراطِ مستقیم کی حقیقت کو ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا تھا۔ آپ نے ایک خط کھینچا۔ اور پھر اُس خط کے دونو طرف آپ اور خط کھینچتے چلے گئے۔ اور آخر میں فرمایا کہ یہ بیچ کا خط صراطِ مستقیم ہے۔ الغرض مجھ پر کعبۂ مشرفہ میں صراطِ مستقیم کی حقیقت کی تجلّی ہوئی اور میں نے دیکھا کہ نفوسِ انسانی کے احوال و کوائف کے بیچوں بیچ صراطِ مستقیم کی یہ حقیقت موجود ہے۔ اور اس کا ایک حصّہ تو اوپر سے متصل ہے۔ اور کچھ اُس سے ذرا نیچے ہے۔ اس سے میری مُراد یہ ہے کہ انسانوں میں سے ہر طبقہ کا خواہ وہ طبقہ زکی ہو یا غبی، اپنا اپنا

صراطِ مستقیم ہوتا ہے۔ اور مَیں نے یہ بھی دیکھا کہ صراطِ مستقیم ترقی طلبی کے کسی خاص مرتبے کا نام نہیں ہے بلکہ صراطِ مستقیم عبارت ہے احکام الٰہی کی اطاعت اور فرمانبرداری میں ایک خاص حد تک ثابت قدم رہنے سے۔ اس ضمن میں مَیں نے تو یہ پایا کہ گویا خود مدبرِ حق نفوسِ انسانی میں صراطِ مستقیم کی حقیقت کا القاء فرماتا ہے۔ چنانچہ جن نفوس میں الہامِ حق کو قبول کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، وہ تو اُس القاء کو قبول کر لیتے ہیں اور جن میں الہامِ الٰہی کو قبول کرنے کی کم استعداد ہوتی ہے، وہ اس القاء سے کم مستفید ہوتے ہیں۔ اور مَیں نے اس امر کا بھی مشاہدہ کیا کہ صراطِ مستقیم تک پہنچنے کے لئے نفوس کو زیادہ مشقت نہیں کرنی پڑتی اور نیز میں نے دیکھا کہ حشر کے دن دوزخ کے اوپر جو پُل ہوگا، اور جس پر سب کو گزرنا پڑے گا، وہ اسی صراطِ مستقیم کی حقیقت کا پیکرِ مثالی ہے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالےٰ نے اس زندگی میں عالمِ نفوس کے اندر صراطِ مستقیم کو ایک معنوی شکل دی ہے، اسی طرح وہ دوسری زندگی میں عالمِ آفاق میں صراطِ مستقیم کو یہ صورت دے دیگا۔ میں نے دیکھا کہ صراطِ مستقیم کو کعبہ مشرفہ کے جوف یعنی اس کے اندر کے حصے سے خصوصی تعلق ہے۔ اور اس کے علاوہ مَیں نے اور بھی بہت سی چیزیں ایسی دیکھیں کہ اُن میں اور صراطِ مستقیم کے ان معانی میں بڑی مناسبت تھی۔ الغرض حشر کے دن صراطِ مستقیم کے یہی معانی ہیں جو مثالی صورتوں میں متشکل ہو جائیں گے۔ اور یہی راز ہے اُس عالم میں منبرِ مسجدِ نبوی اور مسجدِ

بتوحمی کے اس ستون کے ظاہر ہونے کا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مفارقت میں رویا تھا۔ اور نیز یہی راز ہے آپ کے اس ارشاد کا کہ میرے منبر اور میرے گھر کے درمیان جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے ۔

اس مشاہدہ میں یہ تحقیق بھی شامل ہے ——— انسان اپنے ارادے اور اختیار سے جو بھی افعال کرتا ہے اُن افعال کے اپنے اسباب ہوتے ہیں کہ اُن کی وجہ سے اِن افعال کا اُس شخص سے صادر ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ انسان ایک کام کرنے کا عزم کرتا ہے تو پہلے اُس کے نفس کے اندر اس کام کے لئے ایک حتمی ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر اُس شخص کے اعضاء و جوارح اُس کے اِس ارادۂ نفس کی اطاعت کرتے ہیں اور اس طرح اُس سے وہ کام صادر ہوتا ہے۔ یہ اور اس طرح کے اور بہت سے مخفی اسباب ہیں جو انسانی افعال کے لئے ذریعۂ ظہور بنتے ہیں۔ اور وہ اتنے عمیق ہیں کہ بہت کم ہی اُن کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ ان اسباب میں سے ایک عزم ہے ۔

الغرض انسان کے افعال میں سے ہر فعل کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہوتی ہے جو اُس کے اس فعل کے ظہور پذیر ہونے کا باعث بنتی ہے مثلاً ایک شخص کے دل میں کوئی پکا عقیدہ تھا۔ اور اس کے پکے عقیدہ کا

نتیجہ یہ نکلا کہ اُس شخص کے اندر شوق و ذوق پیدا ہو گیا۔ یا کسی خاص حالت میں ایک شخص کے نفس میں کوئی خیال آیا۔ اور وہ خیال عزم کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ الغرض انسانوں کے افعال کے جو اسباب ہیں اُن اسباب کی بھی اپنی علتیں ہیں۔ اور ان علتوں کا سلسلہ برابر آگے چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ آخر میں یہ وجوب قطعی پر ختم ہوتا ہے مختصراً یہ افعال صادر تو بندوں کے ارادوں سے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا وجود اللہ تعالےٰ کی ایجاد ہے۔ اس ضمن میں یہ ملحوظ رہے کہ انسان کا ارادہ بھی ان افعال کے اسباب کے لئے بطور ایک امر واجب کے ہے چنانچہ جب انسان ارادہ کرتا ہے تو یہ ارادہ اُس کے جوہر نفس سے اس طرح چمٹ جاتا ہے کہ پھر جو کچھ اس کے نفس سے صادر ہوتا ہے، اسی ارادے کی مرضی سے صادر ہوتا ہے۔ اور اسی ارادے ہی کے ذریعہ سے اُس کے نفس کی قوتوں میں سے کسی قوت کو حرکت ہوتی ہے۔ جب ارادہ اس طرح نفس میں دخیل ہو جاتا ہے، تو اگر نفس اُس ارادے کی مخالفت کرتا ہے تو اس سے نفس کو اذیت ہوتی ہے۔ اور اگر وہ ارادے کی مطابقت کرتا ہے، تو نفس کو مسرّت ملتی ہے۔ نفس کی اذیت اور مسرت کی بعض خارجی تقریبیں بھی ہوتی ہیں۔ اور وہ یہ کہ اس ارادے کی جو مخصوص مثالی صورت ہے وہ نمونہ ہوتی ہے اسی کی مطلق مثالی صورت کا۔ اب جب ارادے کی اس مطلق مثالی صورت میں اذیت یا مسرت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو وہ فرشتے جو اس خدمت پر مقرر ہیں، اُن کو اُس بارگاہ سے الہام

ہوتا ہے۔ اور وہ اس نفس میں اذیت اور مسرّت پیدا کرنے والے اسباب بن جاتے ہیں۔ اور یا اس نفس کی اذیت اور مسرّت کا یہ سبب ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے لوگوں کی بھلائی کا ارادہ کیا۔ اور اس ارادۂ الٰہی کا اثر اس نفس پر پڑا۔ اور اس کی وجہ سے اگر وہ اچھا ہے تو اُسے اس ارادۂ الٰہی سے مسرّت ہوئی، ورنہ اُسے اذیت پہنچی۔ اور یہ خواہ اس دنیا کی زندگی میں ہو، یا اس زندگی کے بعد دوسری دنیا میں۔ الغرض نفس کی اذیت یا اُس کی مسرت کے یہ جتنے احتمالات ہیں، اُن میں سے ہر ہر احتمال کی اپنی اپنی علتیں ہیں۔ اور اس دُنیا میں کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی، جب تک اُس چیز کی علتیں اُس کے وجود میں آنے کو واجب نہ کردیں۔

جس طرح ہر چیز کی ایک علت مقدر ہوتی، جو اُس کو اس دنیا میں لانے کا سبب بنی ہے۔ اسی طرح مبداءِ اوّل کی طرف سے شریعتوں کا ظہور پذیر ہونا بھی واجب ٹھہرایا گیا اور ان کے ظاہر ہونے کی صورت یہ مقرر ہوئی کہ اللہ تعالےٰ نے پہلے ہی سے جان لیا تھا کہ جس زمانے میں کوئی شریعت نازل ہوگی، اُس زمانے میں "خیر و فلاح" صرف اسی شریعت کی صورت میں محدود ہوگی۔ اس لیے ضروری ہوا کہ وہ صالح نفوس جو شیطانی آلائشوں سے ملوث نہیں ہوتے، اُن نفوس میں اس شریعت کے متعلق جب کہ وہ صاحب شریعت سے معجزات صادر ہوتے دیکھیں پختہ اعتقاد پیدا ہو۔ اور اسی طرح عقل صحیح بھی اس شریعت کے پہنچانے والے کے سچے ہونے پر دلالت کرے۔ اور وہ اس امر کی تصدیق کرے کہ صاحب

شریعت نے واقعی بارگاہِ غیب سے اس شریعت کو لیا ہے۔ اور نیز مبدائے اوّل کی طرف سے اس ضمن میں یہ بھی ضروری قرار پایا کہ زیادہ سے زیادہ نفوس قطرتاً پختہ اعتقاد والے سے اثر پذیر ہوں۔ اور اس کی وجہ سے اور ان نفوس میں حزم و ارادہ کی ایک لہر دوڑ جائے الغرض شریعتوں کے ظہور کے سلسلہ میں مبدائے اوّل کی طرف سے یہ پہلے سے مقدر تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالےٰ کی رحمت کا صدور ہوا اور اس نے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا اور ان پر کتابیں نازل کیں۔ اور اس طرح اُس کی نعمت کا اتمام ہوا، اور واقعہ یہ ہے کہ وہ دلیل جو دلوں میں گھر کر لے، وہ تو صرف اللہ ہی کے لئے ہے ۔

(۱۰۸/)

مشاہدات و معارف

ترجمہ

فیوض الحرمین

مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ

از

پروفیسر محمد سرور

سندھ ساگر اکادمی۔ لاہور